امثال القرآن

قرآنی تمثیلات اور تشبیہات پر مشتمل مستند تفاسیر کی
روشنی میں مرتب کیا گیا ایک نایاب اور مفید مجموعہ

مؤلف
مولانا خالد محمود صاحب
استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انار کلی لاہور- فون: ۷۳۵۲۲۸۳

امثال القرآن

امثال القرآن

مؤلف

مولانا خالد محمود صاحب

استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

بیت العلوم

۲۰۔ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون ۷۳۵۲۴۸۳

کتاب — امثال القرآن

مؤلف — مولانا خالد محمود صاحب استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

باہتمام — محمد ناظم اشرف

ناشر — بیت العلوم ۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور

فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿ملنے کے پتے﴾

بیت العلوم = ۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور

ادارہ اسلامیات = ۱۹۰ انارکلی، لاہور

ادارہ اسلامیات = موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی

دارالاشاعت = اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت القرآن = اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت الکتب = گلشن اقبال، کراچی

ادارۃ المعارف = ڈاک خانہ دار العلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم = جامعہ دار العلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

مکتبۂ قرآن = بنوری ٹاؤن، کراچی

مکتبہ سید احمد شہید = الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ اٰله واتباعه اجمعین.

امابعد! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
''بے شک قرآن کریم پانچ وجوہ پر نازل ہوا ہے، حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال پر، پس تم لوگ حلال پر عمل کرو اور حرام سے اجتناب کرو، محکم کی اتباع اور پیروی کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت ونصیحت حاصل کرو۔'' [سنن البیہقی]

اس حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی تمثیلات اور تشبیہات سے اصل غرض اور اصل مقصود عبرت ونصیحت کا حاصل کرنا ہے کہ انسان ان میں غور وفکر کر کے دنیا کی حقیقت، اس کی ناپائیداری اور زوال وفنا کو سمجھتے ہوئے خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لائے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک وسہیم بنانے سے احتراز کرے۔

شیخ عزّ الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں امثال اس لیے بیان کی ہیں تاکہ اس سے بندوں کو یاددہانی اور نصیحت کا فائدہ حاصل ہو، چنانچہ منجملہ امثال کے جو باتیں اجر وثواب میں تفاوت یا کسی عمل کے ضیاع یا کسی مدح وذم وغیرہ امور پر مشتمل ہیں۔ وہ احکام پر دلالت کرتی ہیں۔'' [الاتقان فی علوم القرآن ج ۳ ص ۲۹۷]

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ ''قرآن حکیم کی ضرب الامثال سے بہت سی باتوں کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، مثلاً وعظ وتذکیر، ترغیب وتحریص، زجر، عبرت پذیری، تقریر وتاکید، مراد کو فہم مخاطب کے قریب کرنا اور مراد کو محسوس صورت میں پیش کرنا۔ اس لیے کہ امثال، معانی کو اشخاص کی صورت میں نمایاں کرتی ہیں، کیونکہ اس میں مخاطب کے ذہن کو حواس ظاہری کی امداد ملتی ہے، ذہن میں بخوبی نقش ہو جاتی ہے، اسی لیے ضرب المثل کی غرض، خفی کو جلی اور غائب کو امر مشاہد کے ساتھ مشابہت دینا قرار دیا گیا ہے اور قرآن کی مثالیں اجر کے تفاوت کے ساتھ بیان پر مشتمل ہیں اور مدح و ذم، ثواب و عقاب، تفخیم وتحقیر اور احقاق وابطال پر بھی مشتمل ہوتی ہیں۔''

امام ابوالحسن ماوردی رحمۃ اللہ علیہ جو کبار شافعیہ میں سے ہیں، انہوں نے علم الامثال کے موضوع پر مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام امثال القرآن ہے۔

امام زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''تمثیل کا طرز اختیار کرنے سے مقصود صرف یہ ہے کہ معانی کو منکشف کیا جائے اور متوہم کو مشاہد سے قریب کیا جائے، چنانچہ اگر ممثّل لہ، عظیم المرتبت ہو تو مثال بھی اسی کے مثل ہوگی اور اگر ممثل لہ، حقیر ہو تو مثال بھی اسی کے مثل حقیر ہوگی۔''

قرآن کریم اور دیگر تمام آسمانی کتب میں ضرب الامثال کا کثرت کے ساتھ استعمال ثابت ہے، انجیل کی سورتوں میں سے ایک سورت کا نام ہی سورۃ الامثال ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر حکماء کے کلام میں بھی ضرب الامثال بہ کثرت موجود ہیں۔

بہر حال! احقر نے **ریاض الجنّہ** میں اس کتاب کا آغاز کرتے ہوئے مختلف مستند ترین کتب تفسیر سے امثال القرآن کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، جن میں **روح المعانی، مدارک التنزیل، تفسیر خازن، تفسیر کبیر، البحر المحیط، معارف القرآن** (مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ) **معارف القرآن** (مولانا مفتی محمد

شفیعؒ)، تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی، تفسیر مظھری، تفسیر عزیزی، نکات القرآن، اسباب النزول وغیرہ سرفہرست ہیں۔ اردو تفاسیر میں شیخ المحدثین مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی بلند پایہ تفسیر معارف القرآن سے احقر نے کافی حد تک استفادہ کیا ہے اور اس تفسیر کو بے مثال اور اپنے موضوع پر بہت حد تک جامع پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائیں اور بندہ عاجز کو اس مجموعہ کے تیار کرنے پر اجر آخرت عطا فرمادے اور اس کو اپنی بارگاہ رب الصمد میں قبول فرمائے اور لوگوں کے لیے نافع بنائے نیز ہمارے قابلِ احترام دوست جناب مولانا محمد ناظم اشرف صاحب مدظلہ کو بھی اس مبارک کتاب کی نشر واشاعت پر اجرِ جزیل عطا فرمائے اور انکی دیگر تمام دینی خدمات کو بھی شرفِ قبولیت سے نوازے اور آئندہ بھی اپنے خاص فضل وکرم سے دین کا صحیح معنی میں خادم بنائے۔ آں موصوف کی تحریک اور تشجیع سے ہی ''امثال القرآن'' جیسی بے مثال کتاب اس وقت محترم قارئین کے ذوقِ مطالعہ کا حصہ بن رہی ہے۔ آمین۔

از: ابو الحسان خالد محمود عفاعنہ الغفور

(مدرس) جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور

۱۳ رمضان ۱۴۲۸ھ

۲۶ ستمبر ۲۰۰۷ء

(۱)

﴿منافقین کی قباحت﴾

آیت کریمہ

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ﴾

[البقرة: ۱۳]

ترجمہ:

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں (صحابہ کرامؓ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بے وقوف ایمان لاتے ہیں، خبردار! یقیناً یہ خود بے وقوف ہیں، مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔''

تشریح:

حضرت عبداللہ بن مسعود، بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت ربیع بن انس اور حضرت عبدالرحمٰن بن زید رضی اللہ عنہم نے اس آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لاؤ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور جنت وجہنم کی حقیقت کو تسلیم کرلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری کر کے نیک اعمال بجالاؤ اور برائیوں سے باز رہو تو یہ ملعون لوگ کہتے ہیں کہ کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ ان منافقوں کے جواب میں خود پروردگار عالم نے تاکیداً حصر کے ساتھ فرمایا کہ حقیقت

میں تو یہ خود بے وقوف ہیں اور اس کے ساتھ جاہل بھی ایسے ہیں کہ اپنی بے وقوفی اور ضلالت و جہالت کو جان بھی نہیں سکتے، اس سے زیادہ ان لوگوں کی برائی اور راہ ہدایت سے کمال درجہ کی اور کیا دوری ہوسکتی ہے؟ [تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۴]

انسان حقیقت میں وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پورے خلوص کے ساتھ ایمان رکھتا ہو۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جگہ مطلقاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں یا علماء کے بنی اسرائیل مراد ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر اس طرح منقول ہے: ''کما آمن ابوبکر و عمر وعثمان و علی'' [تاریخ ابن عساکر]

اوران خلفائے اربعہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ایمان وہی قابل اعتبار ہے جو خلفائے راشدین کے طریق کے مطابق ہو۔ ''كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ'' کے لفظ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ ایمان اسی طرح کا معتبر ہے جس طرح کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفائے راشدین نے ایمان لایا۔ معلوم ہوا کہ جو شخص، اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور جنت وجہنم وغیرہ کی تصدیق اس طرح سے نہ کرے جس طرح سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تصدیق کرتے تھے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات اور شیطانی خیالات کے لحاظ سے کرے تو وہ قطعاً قابل اعتبار نہیں ہے۔ یہ تصدیق نہیں بلکہ تکذیب ہوگی بلکہ ایسا ایمان بلاشبہ کفر کے مترادف ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب منافقین سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ایسا ایمان لاؤ جیسا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان لائے تو جواب میں کہتے ہیں کہ کیا ہم ان بے وقوفوں (العیاذ باللہ) کی طرح ایمان لے آئیں کہ دین کے دیوانے بنے ہوئے ہیں اور زمانہ کے انقلابات سے نہیں ڈرتے، ممکن ہے کہ دوسری طرف کے لوگ غلبہ پالیں۔ انہوں نے تو دین کی محبت میں دنیاوی مصلحتیں نظرانداز کردیں۔

سُفَهَآء، سَفِیْہٌ کی جمع ہے سفیہ اس کو کہتے ہیں جو اپنے نفع ونقصان کو نہ پہچانتا ہو جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿وَلَاتُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمْ﴾ [النساء:۵]

"اور بے وقوفوں کو اپنے اموال نہ دو۔"

اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں سُفَهَآء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ آخرت کے نفع ونقصان کی فکر میں اس قدر سرشار اور منہمک تھے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے کسی نفع ونقصان کی ذرا برابر ان کو پرواہ نہ رہی تھی، اس لیے دنیا کے کتے، ان کو بے وقوف اور دیوانہ کہتے تھے، کسی شاعر کا قول ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نشد

منافقین کا ان مخلص اور سچے پاک باز لوگوں کو بے وقوف اور دیوانہ کہنا بھی ان کے عقلمند اور سمجھدار ہونے کی دلیل ہے۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص فھی الشھادۃ لی بانی کامل

یعنی کسی ناقص العقل شخص کا میری مذمت کرنا، یہی میرے کامل عقلمند ہونے کی شہادت اور دلیل ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّايَعْلَمُوْنَ یعنی آگاہ ہو جاؤ کہ یہی لوگ احمق اور بے وقوف ہیں کہ جنہوں نے باقی چیز کو ترک کر کے فانی چیز کو اختیار کیا ہے اور عقلمند لوگوں کو احمق اور بے وقوف کہتے ہیں اور حق کو باطل اور ہدایت کو ضلالت سمجھ رکھا ہے۔

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿الکیس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسه هواها و تمنی علی اللّٰه﴾

[رواہ الترمذی و ابن ماجه]

''عقلمند اور سمجھ دار شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بنایا اور موت کے بعد والی زندگی یعنی آخرت کے لیے عمل کیا اور احمق اور بے وقوف وہ ہے کہ جس نے خواہشات نفسانی کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ پر تمنائیں اور آرزوئیں باندھیں۔''

علاوہ ازیں ان لوگوں (منافقین) نے شب و روز آپ ﷺ پر صادق آتی تھیں، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے، اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی اور یہ منافقین ایسے احمق اور بے وقوف ہیں کہ انہیں اپنی حماقت اور بے وقوفی کی خبر تک نہیں ہے، کیونکہ جو احمق اپنی حماقت سے باخبر اور واقف ہو وہ پھر بھی قابل غنیمت ہے، لیکن جو احمق اپنی حماقت کو دانائی خیال کرتا ہو تو اس کا مرض لاعلاج ہے۔

[تفسیر معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلوی ملخصاً ج ۱ ص ۶۰۔۶۱]

نکتہ:

اس آیت مبارکہ میں اللہ جل شانہ نے لَا یَعْلَمُوْنَ فرمایا ہے اور اس سے پہلے والی آیت کریمہ میں لَا یَشْعُرُوْنَ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی امور کے معلوم کرنے میں تو غور و فکر اور تفکر اور تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں لَا یَعْلَمُوْنَ فرمایا، لیکن فساد تو حِس ظاہری اور ادنیٰ التفات سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ اس لیے وہاں لَا یَشْعُرُوْنَ فرمانا ہی مناسب ہوا۔

(۲)

﴿منافقین کی پہلی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِى ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ○ صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾

[البقرہ: ۱۷۔۱۸]

ترجمہ:

''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پس آس پاس کی چیزیں روشنی میں آئی ہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نور سلب کرلیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ اندھیروں میں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا، یہ بہرے گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ نہ لوٹیں گے''

تشریح:

کوتاہ نظری، غلط فہمی اور نور ہدایت کے بدلہ ظلمات ضلالت کو خرید کر خسارہ اٹھانے میں ان منافقین کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب آگ نے اس کے آس پاس کو خوب روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو سلب کر دیا اور انہیں ایسی تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے محمد رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کی راہیں خوب واضح اور روشن ہوگئیں اور تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی، لیکن

منافق لوگ اس وقت اندھے ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے نور فطرت اور نور بصیرت کو سلب کرلیا۔ آفتاب نبوت و ہدایت نے اگرچہ تمام عالم کو منور اور روشن کردیا مگر جب تک آنکھ میں نور بصارت نہ ہوتو آفتاب کی روشنی کیا کام آسکتی ہے، اگر یہ لوگ نرے اندھے ہوتے تو بھی غنیمت تھا کیونکہ اندھا شخص کسی کو پکار کر اس کی بات کو سن تو سکتا ہے لیکن جب وہ بہرا اور گونگا بھی ہوتو پھر راہ راست پر آنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ نابینا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا، بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کو نصیحت والی بات سن نہیں سکتا اور گونگا ہونے کی وجہ سے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا، یہی حال منافقوں کا ہے کہ نہ نور بصیرت ہے کہ جس سے وہ خود درست اور غلط راہ پہچان سکیں اور دیکھ سکیں اور نہ ہی کسی مرشد اور ولی اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ ان کی دستگیری کرے اور رہنمائی کرے اور نہ خود حق بات کی طرف کان لگاتے ہیں، پھر بھلا ایسے لوگوں کی راہ ہدایت پر آنے کی کیسے امید کی جاسکتی ہے۔[موضح القرآن موضّحًا]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مترجم گوید حاصل مثل آن است کہ اعمال منافقان ہمہ حبط شدند چنانکہ روشنی آن جماعۃ دور شد''۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہدایت کے بعد گمراہی میں جانا ایسا ہے جیسا کہ روشنی کے بعد اندھیرے میں جا پڑنا۔[فتح الرحمن]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس آیت کریمہ کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو کچھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد منافق بن گئے تو ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص اندھیرے میں تھا اس نے آگ سلگائی، اس کی روشنی سے آس پاس کی تمام چیزیں نظر آنے لگیں اور جو چیز بچنے کے قابل تھیں وہ اسے معلوم ہوگئیں، پھر اچانک وہ آگ بجھ گئی اور راستے کے کانٹے اس کی نگاہ سے اوجھل ہوگئے، اب وہ حیران و سرگردان ہے کہ کس چیز سے بچے اور کس سے نہ بچے، یہی حال ان منافقین کا ہے کہ پہلے شرک اور کفر کے اندھیروں میں تھے، پھر اسلام

لے آئے جس سے حلال وحرام اور خیر وشر سب کچھ انہیں معلوم ہوگیا اور کس چیز سے بچنا ہے اور کس چیز سے نہیں بچنا، سب معلوم ہوگیا، اسی حالت میں تھے کہ منافق ہوگئے اور پہلے کی طرح پھر کفر کی ظلمتوں اور اندھیروں میں جا پھنسے، اب ان کو حلال وحرام اور خیر وشر کی کوئی تمیز نہیں۔[تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۸]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "تفسیر کبیر" میں امام سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ منافق جو گمراہی کو ہدایت کے بدلہ اور اندھے پن کو بینائی کے بدلہ مول لیتے ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اندھیرے میں آگ جلائی، جس سے آس پاس کی چیزیں نظر آنے لگیں، اس کی پریشانی ابھی پوری طرح دور نہ ہوئی تھی اور فائدے کی امید بندھی نہ تھی کہ اچانک آگ بجھ گئی اور یک لخت اندھیرا چھا گیا، اب نہ بصارت کام کرے اور نہ راستہ معلوم ہو سکے اور اس کے ساتھ وہ شخص خود بہرا ہو کر کسی بات کو بھی نہ سن سکتا ہو اور گونگا بھی ہو کر کسی سے کچھ پوچھ بھی نہ سکتا ہو اور نابینا بھی ہو کہ خود دیکھ بھی نہ سکتا ہو۔اب ایسے شخص کا راہ یاب ہونا کیسے ممکن ہے؟ ٹھیک اسی طرح یہ منافقین بھی ہیں کہ ہدایت کو چھوڑ کر راہ گم کر بیٹھے اور خیر کو چھوڑ کر شر اور برائی کو اختیار کرنے لگے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان قبول کر کے کفر اختیار کیا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

اس کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ بہت ہی صحیح اور درست ہے، اس لیے کہ پہلے تو ان منافقوں کو نور ایمان حاصل ہوا، پھر ان کے نفاق کی وجہ سے وہ نور بجھ گیا اور ہمیشہ کے لیے حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ راہ دنیا میں ظلمت کی وجہ سے پیش آئے، وہ نسبت بھی نہیں جو قطرے کو دریا سے ہے، کیونکہ دنیا کی ہر پریشانی محدود اور متناہی ہے اور آخرت کی پریشانی لامحدود اور لامتناہی ہے۔امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کی یہ مثال بیان کی گئی ہے، انہیں کسی وقت بھی ایمان نصیب نہ ہوا تھا، یہ لوگ اول سے آخر تک منافق ہی رہے، اس صورت میں اس آیت کا مطلب وہ ہوگا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابو العالیہؒ، ضحاکؒ اور قتادہؒ سے منقول ہے چنانچہ حضرت ابن

عباس فرماتے ہیں کہ یہ قتال منافقوں کی ہے کہ وہ اسلام کی وجہ سے عزت پالیتے ہیں۔ مسلمانوں میں نکاح، وراثت اور مال غنیمت کی تقسیم وغیرہ میں شریک رہتے ہیں لیکن مرتے ہی ساری عزتیں چھن جاتی ہیں، جس طرح آگ کی روشنی، آگ بجھتے ہی جاتی رہتی ہے۔

ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب منافق لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھتا ہے تو دل میں نور پیدا ہوتا ہے، پھر جب شک کیا تو وہ نور جاتا رہا، جس طرح لکڑیاں جب تک جلتی رہیں تو روشنی رہتی ہے، جب بجھ گئیں تو روشنی ختم ہوگئی۔

امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں نور سے مراد ایمان ہے جو ان کی زبانوں پر تھا، آپ رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ طیبہ ان کے لیے روشنی کر دیتا تھا، امن وامان، کھانا پینا اور بیوی بچے سب کچھ مل جاتا تھا، لیکن شک اور نفاق کی وجہ سے ان سے یہ راحتیں ختم ہو جاتی ہیں، جس طرح آگ کے بجھنے سے روشنی ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ لا الہ الا اللہ کہنے سے منافق کو دنیاوی منافع، جیسے جان و مال کی حفاظت، وراثت کی تقسیم وغیرہ مل جاتے ہیں لیکن چونکہ اس کے دل میں ایمان کی جڑ اور اس کے اعمال میں حقیقت نام کی چیز نہیں ہوتی اس لیے موت کے وقت وہ سب منافع ختم ہو جاتے ہیں، جیسے آگ کی روشنی جب بجھ جائے تو نفع ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس آیت میں نور سے مراد ایمان اور ظلمت سے مراد ضلالت اور کفر ہے، یہ لوگ ہدایت پر تھے، پھر سرکشی کر کے راہ راست سے بہک گئے۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مثال میں ایمان داری اور راہ ہدایت کی طرف چلنے کو آس پاس کی چیز کے روشن کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عطاء الخراسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ منافق کبھی کبھی بھلائی کو دیکھ لیتا ہے اور پہچان بھی لیتا ہے لیکن پھر اس کے دل کا اندھا پن اس پر غالب آ جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ، عبدالرحمٰن، حسن، سدی اور ربیع رحمہم اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔

عبدالرحمٰن بن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ منافقوں کی بھی یہی حالت ہے کہ ایمان لاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ روشنی سے اس کے دل جگمگا اٹھتے ہیں جس طرح آگ کے جلانے سے آس پاس کی چیزیں روشن ہو جاتی ہیں لیکن کفر پھر اس کی روشنی کو ختم کر دیتا ہے جس طرح آگ کے بجھ جانے سے دوبارہ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جن منافقوں کی مثال بیان کی گئی ہے وہ پہلے ایمان لا چکے تھے، پھر انہوں نے کفر کو اختیار کیا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۷، ۸۸، ۸۹]

اس کے بعد فرمایا کہ ان کو ایسی تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے، حدیث میں ہے کہ " الایمان بضع و سبعون شعبة" یعنی ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایمان کا ہر شعبہ ایک نور اور مشعل ہے، بنابریں کفر اور نفاق کا ہر شعبہ ظلمت اور تاریکی ہے، لہٰذا کفر اور نفاق کے بقدر یہ لوگ ظلمات اور تاریکیوں میں مبتلا ہیں۔ [تفسیر معارف القرآن ج ۱، ص ۶۶، ۶۷ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اندھیروں میں چھوڑ دینے سے مراد مرنے کے بعد عذاب میں مبتلا ہونا ہے، یہ لوگ حق کو دیکھتے ہیں، زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں اور کفر کی ظلمت سے نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے کفر اور نفاق کی وجہ سے ہدایت کا دیکھنا اور حق پر قائم رہنا ان سے چھن جاتا ہے۔

امام سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موت کے وقت منافق کی بداعمالیوں، اندھیروں کی طرح اس پر چھا جاتی ہیں اور کوئی بھلائی کی روشنی اس کے لیے باقی نہیں رہتی کہ جس سے اس کی توحید کی تصدیق ہو۔ [تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۹]

اس کے بعد فرمایا، وہ بہرے گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوگ نہیں لوٹیں گے۔ اس لیے کہ جب ان کی روشنی ان سے سلب کر لی گئی اور اندھیروں میں چھوڑ دیئے گئے تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس مختل ہو گئے، لہٰذا اب نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں اور نہ زبان سے کسی سے پوچھ سکتے ہیں، پس اب ضائع کردہ نور ہدایت کی

طرف کیسے پلٹ سکتے ہیں۔

فوائد و نکات

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نور اس کو کہتے ہیں جو بذاتہٖ ظاہر ہو اور دوسرے کے لیے مظہر ہو۔ [مشکوٰۃ الانوار]

علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نور اور ضیاء میں فرق یہ ہے کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو نور سے منتشر ہو اور نور اس ضیاء کے لیے اصل مبدء اور سر چشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ: "جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا" میں آفتاب کو ضیا اور ماہتاب کو نور سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ چاند کی روشنی میں وہ پھیلاؤ نہیں ہوتا جو سورج کی روشنی میں ہوتا ہے اور حدیث مبارک میں بھی فرمایا گیا ہے کہ الصلوٰۃ نور والصبر ضیاء یعنی نماز نور ہے اور صبر ضیاء ہے، نماز چونکہ دین اسلام کا ستون ہے اور بے حیائی اور برے کاموں سے بچاتی ہے اس لیے نماز کو نور سے تعبیر فرمایا کہ یہی نماز اس صبر کی اصل اور جڑ ہے جس کو ضیاء فرمایا گیا ہے اور بے حیائی اور برے کاموں سے بچنا ہی صبر کا سر چشمہ ہے۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کاربند کرنا اور اس کی معصیت سے بچانا۔ یہی وجہ ہے کہ صبر، ایمان کے اکثر شعبوں کو شامل ہے، معلوم ہوا کہ صبر میں نماز کی بہ نسبت بہت زیادہ وسعت اور پھیلاؤ ہے جو نماز کی پابندی سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صبر کو ضیاء اور نماز کو نور سے تعبیر فرمایا ہے۔ چونکہ نور اصل اور مبدء کی حیثیت رکھتا ہے اور ضیاء اس کے تابع ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر نور کا اطلاق تو درست ہے۔ لیکن ضیاء کا اطلاق درست نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اس لیے کہ اس کا نور تمام روشنیوں کی اصل ہے۔ اس کا نور کسی کے تابع نہیں۔ [روض الانف ص ۱۲۶]

حکمائے اسلام نے نور اور ضیاء میں یہ فرق کیا ہے کہ جس روشنی میں حرارت اور گرمی ہو اس کو ضیاء کہتے ہیں اور جس روشنی میں برودت (ٹھنڈک) ہو اس کو نور کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کی آسان شریعت کو نور سے تعبیر کیا ہے، ارشاد باری ہے: ''قَدْ جَآءَ کُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتَابٌ مُّبِیْنٌ'' یعنی بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور اور روشن کتاب تمہارے پاس آئی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو مشقت آمیز احکامات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضیاء سے تعبیر فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے: ''وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَهَارُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً''

یعنی ''بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل میں فرق کرنے والی اور تیز روشنی والی کتاب دی۔'' نماز کو نور اور صبر کو ضیاء بھی اس بناء پر فرمایا گیا ہے کہ نماز آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہے اور صبر میں حرارت اور گرمی ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی اللہ جل شانہ، نے ''ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ'' فرمایا ہے ذَهَبَ اللّٰهُ بِضَوْءِ هِمْ نہیں فرمایا اس لیے کہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ ان سے نور (روشنی) بالکلیہ ختم ہوگئی، روشنی کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا، ہر سمت سے ظلمت اور تاریکی نے ان کو آگھیرا، لہٰذا اگر بِنُوْرِهِمْ کی بجائے بِضَوْءِ هِمْ فرماتے تو معنی یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ضیاء یعنی روشنی کی شدت اور اس کے انتشار کو زائل کردیا اور اصل نور باقی رہا، حالانکہ یہ معنی اصل مقصد کے خلاف ہیں، اس لیے کہ اصل مقصود تو یہ بتانا ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہوگیا، یہ مقصد نہیں ہے کہ اصل نور تو باقی رہا، صرف اس کی شدت اور تیزی زائل ہوگئی۔

نیز ابتدائی آیات میں چونکہ تذکرہ نار کا تھا اس لیے بظاہر اس کا تقاضا یہ تھا کہ بِنُوْرِهِمْ کی بجائے بِنَارِهِمْ کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آگ کو بجھا دیا، لیکن نار کی بجائے نور کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نار میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک نور (روشنی) اور دوسری حرارت اور احراق (جلانا) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس نار میں سے نور (روشنی) کو تو زائل اور سلب کرلیا گیا لیکن حرارت اور احراق کو باقی چھوڑ دیا گیا۔

[تفسیر معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ج ۱، ص ۶۵، ۶۶]

(۳)

﴿منافقین کی دوسری مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ○ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

[البقرة: ۱۹۔۲۰]

ترجمہ:

’’یا جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہے کہ اس بارش میں اندھیرے اور گرج اور بجلی ہو، اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے ہیں کڑک کے مارے موت کے ڈر سے، اور اللہ تعالیٰ کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے، قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے، جس بار وہ ان پر چمکتی ہے تو اس میں چلتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا طاری ہوتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو ضرور ضائع کر دیتا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

تشریح

مطلب یہ ہے کہ دینِ اسلام، بارانِ رحمت کی طرح ہے جو مردہ دلوں کے لیے

آبِ حیات سے کہیں بڑھ کر ہے اور سراسر رحمت ہی رحمت اور نعمت ہی نعمت ہے، البتہ ابتداء میں کچھ محنت اور سختی ہے، جیسے بارش رحمت ہی رحمت ہے اور مردہ زمین کے لیے حیات اور زندگی ہے، لیکن اس کے اول حصہ میں کچھ کڑک اور بجلی بھی ہے، منافق لوگ اس ابتدائی حالت کی سختی سے ڈر گئے اور وہ برائے نام مصائب و مشکلات جو حقیقت میں ان کے تزکیہ نفوس کے لیے تھیں، ان سے گھبرا گئے، جس طرح بجلی کی چمک سے روشنی پیدا ہو کر راستہ نظر آ جاتا ہے اور بادل کی کڑک سے دل کانپ جاتا ہے، اسی طرح منافق لوگ جب دنیا کے منافع، جیسے جان مال کا تحفظ، مالِ غنیمت میں حصہ داری وغیرہ، ان پر نظر پڑتی ہے تو دینِ اسلام کی طرف جھک جاتے ہیں اور جب مثلاً جہاد کی سختی نظر آتی ہے تو اسلام سے بدک جاتے ہیں، بہرحال جس طرح بجلی میں کبھی روشنی اور کبھی اندھیرا ہوتا ہے اسی طرح ان منافقوں کے دلوں میں بھی کبھی اقرار ہے اور کبھی انکار۔

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو بارانِ رحمت سے تشبیہ دی ہے اور منافقین کے شبہات اور خواہشات نفس کو ظلمات کے ساتھ اور آیاتِ عذاب کو رعد کے ساتھ اور اسلامی فتوحات اور غلبہ دین حق کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جب عذاب الٰہی سے ڈرنے والی آیات نازل ہوتی ہیں تو یہ منافقین ان کو سننا پسند نہیں کرتے، کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔

جب کبھی غلبہ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف مائل ہو کر اس پر چلنے لگتے ہیں اور جب خواہشات نفسانی کی ظلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے جیسے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم آتا ہے تو پھر اسلام کی راہ پر چلنے سے رک جاتے ہیں اور اگر خدا چاہتا تو بغیر بجلی اور کڑک ہی کے ان کے کان اور آنکھیں سب ہی سلب کر دیتا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱، ص ۶۸]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کی محکم آیات ان منافقوں کی قلعی کھول دیں گی اور ان کے پوشیدہ عیوب کو

ظاہر کردیں گی اور اپنی نورانیت سے ان کو مبہوت کردیں گی، جب ان پر اندھیرا طاری ہوتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، یعنی ایمان کا نور ان پر جب ظاہر ہوتا ہے تو روشن دل ہو کر اس کی پیروی بھی کرنے لگتے ہیں، لیکن پھر جہاں پر شک وشبہ پیش آیا تو دل میں ظلمت اور تاریکی آ گئی اور حیرت زدہ ہو کر کھڑے رہ گئے۔ نیز اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جب دین اسلام کو ذرا عروج اور غلبہ حاصل ہوا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا لیکن جہاں اس کے خلاف کچھ نظر آیا تو الٹے پاؤں کفر کی طرف لوٹنے لگے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ [الحج: ۱۱]

کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو کنارے پر رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔'' یعنی اگر بھلائی حاصل ہوئی تو مطمئن ہو گئے اور اگر برائی پہنچی تو اس وقت پھر گئے۔

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے روشنی میں چلنے سے مراد حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھہر جانے سے مراد کفر کی طرف لوٹنا ہے۔ بہت سے مفسرین کرام کا بھی یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی ہے۔ قیامت کے روز بھی ان کا یہی حال ہو گا کہ جب لوگوں کو ان کے ایمان کے بقدر نور ملے گا، بعضوں کو کئی میلوں تک کا نور ملے گا اور بعضوں کو اس سے بھی زیادہ اور کسی کو اس سے کم ملے گا، حتیٰ کہ کسی کو اس قدر نور ملے گا کہ کبھی وہ روشن ہو گا اور کبھی اندھیرا ہو جائے گا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ذرا سے دور چل سکیں گے۔ پھر ٹھہر جائیں گے، پھر ذرا سے دور کا نور ملے گا، پھر بجھ جائے گا اور کچھ ایسے بھی بدنصیب ہوں گے کہ ان کا نور بالکل بجھ جائے گا۔ یہ پورے منافق لوگ ہوں گے، جن کے بارے میں فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا الاية﴾ [الحديد: ۱۳]

''جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا رکو، ہمیں بھی آ لینے دو تا کہ ہم بھی تمہارے نور فائدہ اٹھا سکیں

تو ان سے کہا جائے گا کہ واپس لوٹ جاؤ اور نور ڈھونڈ لاؤ۔''

اور مومنوں کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ﴾ [الحديد: ۱۲]

اس روز تو دیکھے گا کہ مومن مرد اور مومن عورتوں کے آگے آگے اور دائیں جانب نور ہوگا اور ان سے کہا جائے گا کہ آج کے دن تمہیں ان جنتیوں کی خوشخبری ہو جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔''

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بعض مومنوں کو مدینہ سے لے کر عدن تک نور ملے گا اور بعضوں کو اس سے کم، یہاں تک کہ بعضوں کو اتنا کم نور ملے گا کہ صرف پاؤں رکھنے کی جگہ ہی روشنی ہوگی۔'' [ابن جریر]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان والوں لوگوں کے ایمان کے بقدر نور ملے گا۔ بعضوں کو کھجور کے درخت کے برابر، بعضوں کو قدم آدم کے برابر، کسی کو صرف اتنا نور ملے گا کہ اس کا انگوٹھا ہی روشن ہو، جو کبھی روشن ہوتا ہوگا اور کبھی بجھ جاتا ہوگا۔'' [ابن ابی حاتم]

نیز وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے ایمان کے مطابق نور ملے گا جس کی روشنی میں وہ پل صراط سے گزر سکیں گے، بعضوں کا نور پہاڑ کے برابر ہوگا، بعضوں کا کھجور کے درخت کے برابر اور سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور اس کے انگوٹھے کے برابر ہوگا جو کبھی روشن ہوگا اور کبھی بجھ جائے گا۔ [ابن ابی حاتم]

نور بجھ جائے گا تو موحدین مارے خوف کے کہیں گے:

''رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا'' [التحریم: ۸]

ترجمہ ''اے ہمارے رب ہمارے نور کو پورا کردے۔'' [ابن ابی حاتم]

امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ نور میں بھی مومن کے دل کی مثال اس روشن چراغ سے دی ہے جو روشن فانوس میں ہو اور وہ فانوس خود بھی چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہو، پس مومن کا

ایک تو دل روشن دوسرا شریعت مطہرہ کی اسے مدد حاصل، پس نور علی نور ہو جاتا ہے اور دوسرے مقام پر کافروں کی مثال بیان فرمائی کہ کافروں کے اعمال کی مثال ریت کے چمکتے ہوئے ٹیلوں کی طرح ہے جنہیں پیاسا شخص پانی خیال کرتا ہے لیکن جب اس کے پاس آ کر دیکھتا ہے تو وہاں کچھ نہیں پاتا۔ پھر ایک اور مقام پر کافروں کی مثال بیان فرمائی کہ ان کی مثال سخت اندھیروں کی طرح ہے جو گہرے سمندر میں ہوں جو (سمندر) موجیں مار رہا ہو اور اندھیروں پر اندھیرے چھائے ہوئے ہوں، ہاتھ نکالے تو کچھ بھی دیکھ نہ سکتا۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ”تین خصلتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک کہ اسے نہ چھوڑے، ایک یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، دوسرا یہ کہ وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے، تیسرا یہ کہ امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں نفاق کا کچھ حصہ ہوتا ہے، خواہ وہ منافق عملی ہو یا اعتقادی۔ جیسا کہ مذکورہ آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ”دل چار قسم کے ہیں، ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو، دوسرا دل جو غلاف آلود ہے، تیسرا وہ دل جو الٹا ہے اور چوتھا وہ دل جو مخلوط ہے۔ پہلا دل تو مومن کا ہے جو پوری طرح منور ہے، دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا دل خالص منافق کا ہے جو جانتے ہوئے انکار کرتا ہے اور چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں۔ ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے نشو ونما پا رہا ہو اور منافق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جس میں خون اور پیپ ہی پیدا ہوتا رہے اور بڑھتا ہی جائے، پس جو مادہ بڑھ جائے وہی دوسرے پر غالب آتا ہے۔“ [مسند احمد، اسنادہ جید]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ جب ان منافقوں نے حق کو جاننے کے بعد اسے چھوڑ

دیا تو اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے یعنی چاہے تو انہیں عذاب میں گرفتار کرے اور چاہے تو معاف کردے، یہاں قدرت کو اس لیے بیان کیا پہلے ان (منافقوں) کو اپنے عذاب سے ڈرایا اور فرمایا کہ وہ انہیں گھیر لینے اور ان کے کانوں کو بہرہ اور آنکھوں کو اندھا کرنے پر قادر ہے۔

نکتہ

اس آیت کریمہ: ''وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ابھی اس گروہ کو پہلے گروہ کی طرح اندھا بہرا نہیں بنایا، اس گروہ سے ابھی ایمان کی امید بالکل ختم نہیں ہوئی، ممکن ہے کہ یہ ایمان لے آئیں، بخلاف پہلے گروہ کے کہ جن کی مثال ''مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَنَارًا'' میں ذکر کی گئی ہے کہ ان کے ایمان لانے اور راہ ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نور فطرت کو بالکل سلب فرمالیا ہے جیسا کہ فرمایا: ''ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ '' اور وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف لوٹنے والے نہیں ہیں، اس لیے اس گروہ کے لیے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ'' نہیں فرمایا، اس لیے کہ اللہ جل شانہ نے ان کے نور فطرت کو ابھی بالکلیہ زائل نہیں فرمایا۔[معارف القرآن ج ا ص ۶۸ مولانا کاندھلویؒ]

فائدہ

پہلی مثال ان منافقین کی ہے کہ جن کے دلوں میں نفاق خوب راسخ اور پیوست ہو چکا ہے، اب وہ کسی طرح بھی راہ ہدایت کی طرف آنے والے نہیں ہیں، جیسا کہ ''صُمٌّ م بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ'' سے ظاہر ہوتا ہے اور دوسری مثال ان منافقین کی ہے کہ جو ابھی ایمان میں متردد اور متذبذب ہیں، کبھی اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف حیران وسرگردان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں!

تعارض

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹ (مذکورہ آیت) اور اس جیسی بہت سی آیات سے معلوم

ہوتا ہے کہ بارش آسمان سے ہوتی ہے، جب کہ حَتّٰی اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا"[الاعراف، رکوع نمبر ۱۴، پارہ نمبر ۸]اور اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَاباً[النور، پارہ نمبر ۱۸، رکوع نمبر ۱۲] اور دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے اور "يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ" سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں کے درمیان سے نکلتی ہے۔ [الروم، پارہ نمبر ۲۱، رکوع نمبر ۸]اور وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجاً[البناء پارہ نمبر ۳۰، رکوع نمبر ۱] سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے، ان آیات میں بظاہر تعارض ہے؟

جواب

اس کے تین جوابات ہیں: (۱) پہلی آیت میں سَمَآء سے مراد سَحَاب ہے، ہر وہ چیز جو جہت علو میں ہو اسے سَمَآء سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، جیسے مکان کی چھت وغیرہ، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ کلّ ماعلاک فھو سماء یعنی ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہے وہ آسمان ہے، پس چونکہ سَحَاب بھی جہت علو میں ہوتا ہے اس لیے اس کو سماء سے تعبیر کر دیا گیا، ورنہ حقیقت میں بارش بادلوں ہی سے ہوتی ہے لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (۲) بارش تو بادلوں سے ہی ہوتی ہے لیکن اس کا سبب آسمانی تاثیرات ہیں۔

جیسا کہ آسمان پر موجود سورج کی شعاعیں سمندر پر پڑتی ہیں جن کی حرارت سے پانی بخارات بن کر اٹھتا ہے، پھر وہ بخارات ہوا کے تیسرے طبقہ میں پہنچ کر جمع ہو جاتے ہیں اور جب زیادہ بوجھل ہو جاتے ہیں تو قطرات کی شکل میں برسنے لگتے ہیں، پس جب تک وہ بخارات جمع رہتے ہیں ان کو بادل کہا جاتا ہے اور جب برسنے لگتے ہیں تو ان کو بارش کہا جاتا ہے تو چونکہ بادلوں سے بارش برسنے کا سبب، آسمانی تاثیرات ہیں اس لیے مجازاً آسمان کی طرف نسبت کر دی گئی، پس پہلی آیت مجاز پر اور دیگر آیات حقیقت پر محمول ہیں۔[روح المعانی]

(۳) بارش آسمان سے ہوتی ہے اور بادل درمیان میں واسطہ ہیں، پہلے پانی

آسمان سے بادلوں پر نازل ہوتا ہے، پھر بادل کے سوراخوں میں سے چھن چھن کر زمین پر برستا ہے، اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو بارش کے لیے چھلنی بنا دیا ہے، لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس کی تائید حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''لولاالسحاب حین ینزل المطر من السماء لَاَفْسَدَ مایقع علیه من الارض ''یعنی جس وقت آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اگر درمیان میں بادل نہ ہوتے تو پانی زمین کے جس مقام پر گرتا اس کو برباد کر دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی موٹی دھار بن کر نہایت تیزی کے ساتھ گرتا ہے مگر درمیان میں بادل اس کو روک لیتے ہیں، پھر وہ بادل کے سوراخوں سے چھن چھن کر ہلکی رفتار کے ساتھ قطرات بن کر اور باریک باریک دھار بن کر برستا ہے، اگر یہ بادل نہ ہوتے اور پانی کی موٹی دھار بن کر پوری تیزی کے ساتھ براہ راست زمینوں اور مکانوں وغیرہ پر گرتا تو سب چیزیں ہلاک وہ تباہ ہو جائیں، یہ تو اللہ جل شانہ، کا فضل وکرم ہے کہ اس نے درمیان میں بادلوں کو واسطہ بنا دیا ہے۔[تفسیر صاوی]

☆☆☆

(۴)

﴿مچھر کی مثال﴾

آیت کریمہ

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ج وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا م يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ﴾

[البقرة: ۲۶]

ترجمہ

"اللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا خواہ مچھر کی ہو، یا اس سے بھی ہلکی چیز کی، ایمان والے تو اسے اپنے رب کی طرف سے حق سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ تعالیٰ نے کیا مراد لی ہے؟ اسی سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو راہ راست دکھاتا ہے اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔"

شان نزول

ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا" اور "اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ" میں منافقین کی دو مثالیں بیان فرمائیں تو منافقین کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ تو بزرگ و برتر اور اونچی شان والے ہیں، ایسی حقیر مثالیں۔ بیان کرنے کی ان کو کیا ضرورت ہے؟

اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ جل شانہ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا اور مشرکین کی یہ مثالیں بیان فرمائیں تو یہودی لوگ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ ان چیزوں کی کلام اللہ سے کیا مناسبت اور مشابہت ہے! اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت مذکورہ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖٓ'' کے متعلق فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے معبودوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا [الحج: ۷۳] اور ان معبودوں کی کمزوری کو تارِ عنکبوت کی طرح قرار دیا تو مشرکین کہنے لگے: ذرا دیکھو! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو قرآن نازل ہوا ہے اس میں اللہ تعالیٰ مکھی اور مکڑی کا ذکر کرتے ہیں۔ بھلا ان چیزوں کے ذکر سے کیا مقصد! اس پر اللہ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

[آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۲۷، ۲۸]

تشریح

حیاء نفس کے اثر قبول کرنے کا نام ہے جو کسی بڑے کام سے خدمت کے خوف سے پیدا ہو، حیاء، وقاحت اور خجل کے درمیانی درجہ کا نام ہے کیونکہ وقاحت تو جسارت اور جرأت اور برے افعال سے لاپرواہی کرنے کو کہتے ہیں اور خجل کسی کام سے رک جانے کو کہتے ہیں خواہ وہ کام اچھا ہو یا برا۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی حیاء کی صفت کے ساتھ موصوف ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان آدمی کو عذاب دینے سے حیاء کرتے ہیں۔ [سنن بیهقی، باب الزهد]

نیز حدیث میں ہے کہ جب بندہ اپنے مالک کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو ارحم الراحمین کو حیاء آتی ہے کہ اسے خالی ہاتھ پھیر دے۔ [ابو داود، ترمذی]

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں حیاء کے حقیقی معنی تو مراد نہیں ہو سکتے، کیونکہ حقیقی

معنی تو برے فعل سے نفس میں گرفت اور انفعال (اثر قبول کرنے) کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے منزہ اور پاک ہے، یہاں حیاء سے مراد ترک فعل ہے جو معنی حقیقی کو لازم ہے۔ آیت کریمہ میں لفظ حیاء کا استعمال اشکال سے خالی نہیں، کیونکہ حیاء کے معنی ظاہر ہے کہ یہاں فعل قبیح کے ترک کے ہوں گے اور مثل کا بیان کرنا کسی درجہ میں بھی قبیح نہیں ہے تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب کفار و منافقین نے یہ کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ ایسی ویسی مثالوں سے شرماتے نہیں تو جواب میں ارشاد ہوا کہ نہیں شرماتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں حیاء کا استعمال محض صنعتِ مشاکلہ کے طور پر ہوا ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر آیا ہے: '' وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا '' اس میں برائی کے بدلہ کو برائی سے تعبیر فرمایا گیا ہے، حالانکہ وہ برائی نہیں بلکہ محض اس کے مقابلہ پر مبنی ہے۔ [تفسیر مظھری ملخصاً ج ا ص ٦٧]

چونکہ تمثیل سے ممثل لہ (جس کی مثال بیان کی گئی) کی توضیح اور تفصیل مقصود ہوتی ہے، لہٰذا حقیر چیزوں کی حقارت کی توضیح کے لیے اس کے مناسب مچھر، مکھی اور مکڑی اور اسی قسم کی حقیر چیزوں کی مثال ذکر کی جائے گی تا کہ اس چیز کی حقارت واضح ہو جائے۔ عزیز اور عظیم چیزوں کی مثال سے حقیر اور خسیس چیزوں کی حقارت و ذلت کو بھلا کس طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مثال دینے والے کے مطابق ہو بلکہ ممثل لہ کے مطابق ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ حقیر اور خسیس چیز کی مثال حقیر سے اور عزیز و عظیم چیز کی مثال عزیز سے ہی دینی چاہیے۔ ورنہ ہر عقلمند شخص جانتا ہے کہ حقیر کی مثال عزیز سے دینا احمقوں کا کام ہے، جیسا کہ تورات و انجیل اور حکماء کے کلام میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾

''اور البتہ تحقیق ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر مثال بیان کی ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾

''یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور وفکر کریں۔''

بعض اسلاف سے منقول ہے کہ جب میں قرآن کی کسی مثال کو سنتا ہوں اور اس کو نہیں سمجھتا تو میں اپنے اوپر روتا ہوں، اس لیے کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾

''یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور ان (مثالوں) کو اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔''

حضرت ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مچھر کی مثال اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کی بیان فرمائی ہے، مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جب کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح اہل دنیا جب دنیا سے خوب سیر اور سیراب ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کا مواخذہ کرتا ہے پھر وہ ہلاک وتباہ جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَاهُمْ مُبْلِسُوْنَ﴾

''پس جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز سے خوش ہو گئے جو ان کو دی گئی تو ہم نے ان کو پکڑ لیا اچانک، پس وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔'' [تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۰۴، بحوالہ ابن جریر، ابن ابی حاتم]

قرآن اور اس کی تمثیلات سب حق اور عین ہدایت ہیں، صحیح المزاج اور سلیم الفطرت لوگ جب ان تمثیلات کو سنتے ہیں اور ان میں تدبر وتفکر سے کام لیتے ہیں تو ان

کی ہدایت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور ان تمثیلات سے صراط مستقیم اور حق کا راستہ ان کے لیے خوب واضح ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کا مزاج فاسد اور بگڑ چکا ہے ان کو ان تمثیلات سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی ضلالت اور گمراہی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ فاسد المزاج لوگوں کو جس قدر عمدہ غذا دی جائے اسی قدر ان کے فساد اور مرض میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

جس طرح قرآن حکیم میں ہدایت اور اضلال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہدایت کو انبیائے کرام علیہم السلام، علمائے ربانیین اور ائمہ مجتہدین کی طرف اور اضلال کو شیاطین اور اخوان شیاطین کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے اس لیے مناسب ہوا کہ ہدایت اور اضلال کے درجات ذکر کیے جائیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور انبیاء و مرسلین کی ہدایت میں فرق معلوم ہو اور اللہ جل شانہ کی جانب جو اضلال کی نسبت کی گئی ہے اس کی حقیقت آشکار ہو، اسی طرح شیاطین اور اخوان شیاطین کے اضلال کی ماہیت بھی معلوم ہو۔

ہدایت کے درجات

(۱) ہدایتِ بیان، یعنی حق بات کو بیان اور واضح کرنا اور لوگوں کو حق کی تعلیم اور دعوت دینا، اس معنی کے اعتبار سے ہدایت کا لفظ، حق تعالیٰ اور اس کے انبیاء و مرسلین اور ائمہ مجتہدین سب کی طرف منسوب ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی حق کو بیان اور واضح کیا اور اپنے بندوں کو اس کی طرف دعوت دی اور اس کے حکم سے انبیاء و مرسلین اور علمائے حق نے بھی حق کو بیان کیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی اور اس کی طرف دعوت دی۔ ارشاد باری ہے:

﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴾

”تحقیق ہم نے انسان کو راستہ دکھایا یا تو شکر کرے یا ناشکری کرے۔“

اسی طرح ارشاد ہے۔

﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾

”قوم ثمود کو ہم نے سیدھا راستہ دکھایا لیکن انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی۔“

اسی طرح فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾

”ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔“

ان تمام آیتوں میں ہدایت سے بیان وتوضیح مراد ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں ہے، انبیاء اور علماء کی طرف بھی اس کی نسبت ہوسکتی ہے، نیز یہ ہدایت اہل ایمان واہل کفر سب کے لیے ہے۔

(۲) ہدایتِ توفیق، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے فضل وکرم سے بندہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرماں برداری کو اس کی طبعی خواہش کے ایسا موافق بنا دینا کہ اس کی اطاعت لذیذ اور اس کے تمام موانع کو یکلخت اٹھا دینا اور ختم کر دینا۔ یہ ہدایت، اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس ہدایت پر نہ کوئی مقرب فرشتہ قادر ہے اور نہ ہی کوئی نبی مرسل، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

تحقیق آپ جس کو چاہیں راہ پر نہیں لا سکتے، لیکن اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہے راہ پر لائے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جس ہدایت کو ثابت کیا گیا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہ یہی ہدایت بمعنی التوفیق ہے اور ”اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ“ میں جس ہدایت کو آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے

ثابت کیا گیا ہے۔ وہ ہدایت یعنی البیان ودعوۃ الحق ہے، ایک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام یہی ہے کہ حق کو بیان کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم اور اس کی طرف دعوت دے، مگر اطاعت خداوندی کا خواہش نفسانی کے مطابق بنا دینا اور لوگوں کو اس کی تعلیم اور اس کی طرف دعوت دے، مگر اطاعت خداندوی کا خواہش نفسانی کے مطابق بنا دینا اور عبادت خداوندی کی شیرینی کسی کے دل میں پیدا کر دینا یہ اسی ملیک مقتدر ذات کے قبضہ میں ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے، ''لایتوفق عبد حتّی یوفقه اللّٰهُ'' یعنی بندہ خود بخود توفیق نہیں پاتا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دے۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوہ احزاب کے موقع پر خندقیں کھودتے وقت یہ پڑھتے تھے ''اللّٰھم لو لا انت ما اھتدینا ولاتصدقنا ولاصلینا فانزل سکینة علینا'' یعنی اے اللہ! اگر تیری توفیق شامل حال نہ ہوتی تو ہم نہ ہدایت پاتے، نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے، پس تم ہم پر سکنیت و طمانیت نازل فرما۔''

اور یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نعمت کبریٰ اور رحمت عظمیٰ سے ان بندوں کو سرفراز فرماتے ہیں جو اس کی رضا وخوشنودی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت کی طرف گوشۂ چشم سے ایک ادنیٰ التفات کو بھی روا نہ رکھتے ہوں۔

جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿یَهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَ یَهۡدِیۡهِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾

''جو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا تابع ہو اس کو اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں بتاتے ہیں اور اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتے ہیں اور اس کو سیدھے راستہ پر چلاتے ہیں۔''

اضلال کے درجات

(۱) اضلال کا ایک معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی دعوت دینا اور اس کی

فرماں برداری کو قبیح کر کے بتلانا اور اس کی نافرمانی کو مزین اور مستحسن کر کے ظاہر کرنا اور ظاہر کو باطل کے ساتھ ملتبس کرنا۔ اللہ جل جلالہ، نے اسی اضلال کو شیاطین کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ﴾

''اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کیا، پس اس طرح سے ان کو سیدھے راستہ سے روکا۔''

ایک اور مقام پر اسی اضلال کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَاهَدٰى﴾

''اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور اس نے سیدھا راستہ نہ بتایا۔''

اور ایک اور جگہ پر اس کو سامری کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ''وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ'' اور سامری نے ان کو گمراہ کیا۔

اضلال بایں معنی کو ہمیشہ شیاطین اور اخوان شیاطین اور ائمۃ الکفر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اللہ جل شانہ کی طرف کبھی بھی اس اضلال کی نسبت نہیں کی جا سکتی، وہ ذات اس سے پاک اور منزہ ہے۔

(۲) اضلال کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی توفیق اور لطف و رحمت سے کسی کو محروم فرما دینا اور اللہ تعالیٰ اپنی توفیق اور رحمت سے اسی کو محروم کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب اور اس کے انبیاء و مرسلین کے ساتھ استہزا اور تمسخر کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ لَايَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

''اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَايَهْدِىْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والے اور جھوٹے کو ہدایت نہیں دیتے۔''

﴿وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ﴾
''اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔''

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ یہ اضلال حقیقت میں ان کے اسراف، تکذیب ظلم وتعدی کی سزا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اسی اضلال کی اسناد کی جاتی ہے، اور مذکورہ آیت: ''یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْراً وَیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا'' میں ہدایت اور اضلال کے دوسرے معنی مراد ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی خاص توفیق اور لطف و رحمت سے بہت سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس ذات عالی کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کی بیان کردہ تمثیلات کو حق اور عین ہدایت جانتے ہیں اور اس کے کلام اور تمثیل کا استہزاء نہیں کرتے اور بہت سوں کو ان تمثیلات سے گمراہ کرتا ہے یعنی اپنی خاص توفیق اور لطف ورحمت سے محروم فرماتا ہے اور محروم ان لوگوں کو کرتا ہے کہ جو اس کی اطاعت وفرماں برداری کی حدد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور ان تمثیلات سے نافرمان لوگوں کو ہی گمراہ کرتا ہے کیونکہ نافرمان اور سرکشی کی نحوست سے عقل ماری جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کو باطل سمجھنے لگتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ا ص ۸۰، ۸۱]

لغت میں فسق کہتے ہیں اطاعت وفرماں برداری سے نکل جانا۔ جب چھلکا ہٹا کر خوشہ نکلتا ہے تو اہل عرب کہتے ہیں: فَسَقَتْ۔ اور چوہے کو بھی فُوَیْسَقَة اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے بل سے نکل کر فساد کرتا ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پانچ جانور فاسق ہیں جن کو حرم اور حرم کے باہر قتل کر دیا جائے، کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کالا کتا'' معلوم ہوا کہ لفظ فسق، کافر اور ہر نافرمان کو شامل ہے۔ البتہ کافر کا فسق زیادہ سخت اور زیادہ قبیح ہے۔ اس آیت کریمہ میں فاسق سے مراد کافر ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ان کا وصف یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عہد توڑتے ہیں اس کے فرامین کو نظر انداز کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں اور ایسے تمام اوصاف کفار کے ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۰۶]

(۵)

﴿ہدایت سے بے نیاز لوگ﴾

آیت کریمہ:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ﴾

[البقرة: ۱۷۱]

ترجمہ

''اور کفار کی مثال ان جانوروں کی طرح ہے جو اپنے چرواہے کی صرف پکار اور آواز ہی کو سنتے ہیں۔ بہرے گونگے اور اندھے ہیں۔انہیں عقل نہیں ہے۔''

تشریح

لفظ نعق اور نعیق، چرواہے کے بکریوں پر چلانے اور آواز دینے کو کہتے ہیں، اگر یہ آیت کریمہ، بت پرستوں کے بارے میں ہو تو پھر کسی تاویل یا توجیہ کی ضرورت نہیں ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ بتوں کو پکارنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کی مثال ایسی ہے جسے کوئی جانوروں کو پکارے تو وہ جانور سوائے آواز کے اور کچھ بھی نہیں سمجھتے۔اس صورت میں یہ آیت مبارکہ، مضمون کے لحاظ سے اس آیت کریمہ: '' لَایَسْمَعُوْا دُعَاءَکُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ ''''یعنی وہ تمہاری پکار نہیں سنتے اور اگر سنیں تو جواب نہ دیں گے'' کے مثل ہوگی اور یہ تمثیل مرکب ہوگی (یعنی ہر جزو مثال کا ممثّل لہ کے ہر جزو کے مشابہ ہونا ضروری نہ ہوگا بلکہ تشبیہ صرف پکار کے بے فائدہ ہونے میں ہوگی) اور اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً سے بھی تشبیہ میں کوئی خرابی لازم نہیں آئے گی۔

اور اگر اس آیت کریمہ کو یہود کے بارے میں کہا جائے تو اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جوان کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادا کی پیروی کرتے ہیں تو ان کے اس جواب کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جانوروں کو آواز دے یعنی جس طرح جانوروں کو آواز دینا بے سود اور حماقت ہے اسی طرح ان کا یہ جواب بھی بے سود اور مہمل ہے۔ یا پھر اس آیت کریمہ میں کفار کو جانوروں کیساتھ تشبیہ دینا مقصود ہے، اس صورت میں تاویل کی ضرورت ہوگی اور وہ تاویل یہ ہے کہ یا تو '' وَمَثَلُ الَّذِيْنَ'' سے پہلے ''وَمَثَلُکَ'' مانا جائے، یا پھر مشبہ یعنی الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے پہلے مضاف محذوف مانا جائے اور تقدیری عبارت یہ ہوگی: ''وَمَثَلُ دَاعِي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ'' پہلی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوں گے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور کافروں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جانوروں کو آواز دے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو آواز دینے والے کے مثل ہیں اور یہ کفار جانوروں کے مثل ہیں اور دوسری صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص کفار کو اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی جانوروں کو پکارے یا پھر یہ توجیہ کی جائے کہ اَلَّذِيْ يَنْعِقُ سے پکارنے والا مراد نہ لیا جائے بلکہ جس کو پکارا گیا ہے یعنی جانور وغیرہ، وہ مراد لیے جائیں اور ایسا استعمال کلام عرب میں شائع ذائع ہے، چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں: فلان يخافک خوف الاسد، یعنی فلاں شخص آپ سے شیر کی طرح ڈرتا ہے۔ یہ معنی لفظوں کے اعتبار سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی ہے: اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ'' اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ اس کی چابیاں تھک جاتی تھیں جماعت سے، اور مراد یہ ہے کہ ایک جماعت اس کی چابیوں سے تھک جاتی تھی۔

اس صورت میں حاصل مطلب یہ ہوگا کہ کافر اپنے باپ دادا کی اقتداء کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ جو احکام بھی ان کو سنائے جاتے ہیں ان پر کان نہیں دھرتے اور ان میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے، جانوروں کی سی حالت ہے کہ ان کو خواہ کتنی ہی آواز دو،

آوز سننے کے سوااور کچھ نہیں سمجھتے۔

یا معنی یہ ہوں گے کہ یہ یہود اپنے باپ دادا کا اتباع تو کرتے ہیں لیکن ان کو حقیقت حال کی کچھ خبر نہیں ہے، جیسے جانور ہوتے ہیں کہ آواز تو سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں، ان کے باپ دادا کا حال تو یہ تھا کہ تورات کے منسوخ ہونے سے پہلے تورات کے بتلائے ہوئے احکام کی اتباع تو کرتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کا انتظار کرتے تھے اور ان کی حالت یہ ہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم تورات کی اتباع کرتے ہیں، لیکن واقع میں اس کی مخالفت کرتے ہیں، تورات تو کہتی ہے کہ قرآن اور محمد مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ مگر یہ لوگ اس کا صریح انکار کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں پس وہ کچھ نہیں سمجھتے۔'' مطلب یہ ہے کہ یہ کافر، خدا تعالیٰ کی آیات کو غور وفکر سے نہیں سنتے۔ اس لیے بہرے ہیں اور ان کی زبان سے بھی خیر کے کلمات نہیں نکلتے اس لیے گونگے ہیں اور ہدایت کو نہ دیکھنے کی وجہ سے اندھے ہیں۔ نیز چونکہ ان کی فکر ونظر میں خلل واقع ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ دین کی بات کو نہیں سمجھتے۔ [تفسیر مظہری ج ۱، ص ۲۱۲، ۲۱۳]

☆☆☆

(٦)

﴿انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت﴾

آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة: ٢٦١]

ترجمہ

''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔''

تشریح

ان آیات کریمہ میں عالم آخرت کے لیے ساز و سامان تیار کرنے کی ترغیب کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں جو ضمناً اثبات قیامت کی بھی دلیل ہے، اس لیے کہ جو ذات زمین میں ایک دانہ ڈالنے اور سات سو دانے اگانے پر قادر ہے، وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جائے جو کہ سات بالیں اگائے اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اسی طرح صدقہ دینے والا مزارع کی طرح ہے اور مال بیج اور دانہ کی طرح ہے اور سبیل اللہ زراعت والی زمین کے مثل ہے جو خدا کی راہ میں خرچ کرے گا اور سات سو گنا کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اخلاص، نیت اور مشقت

کے بقدر جس کے لیے جس قدر چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی کشائش والا ہے۔ اس کی عطا و بخشش کی کوئی حد نہیں ہے، دینے سے اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی اور اخلاص و نیت اور اس کی مقدار و کیفیت کو بھی اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں کہ اس کے مطابق اجر بڑھاتے ہیں، پھر جس طرح پیداوار کے لیے یہ شرط ہے کہ تخم اور دانہ خراب نہ ہو اور زمین بھی تخم ریزی کے قابل ہو اور آئندہ بھی کھیتی آفتوں سے مامون اور محفوظ رہے تب پیداوار ہوگی اسی طرح صدقہ کے لیے یہ شرط ہے کہ مال حلال ہو اور جس راہ میں خرچ کیا جا رہا ہے وہ بھی خیر اور نیکی کی راہ ہو یعنی صحیح ہو اور آئندہ چل کر وہ صدقہ احسان جتانے اور ایذا رسانی کی آفت سے بھی محفوظ اور مامون رہے تب اس صدقہ کا بدلہ سات سو گنا ملے گا۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱ ص ۴۰۰، ۴۰۱]

ان آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال صالحہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جس طرح تمہارے بوئے ہوئے بیج کھیت میں بڑھتے بڑھاتے رہتے ہیں۔

مسند احمد میں حدیث ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص اپنی بچی ہوئی چیز اللہ کی راہ میں دیتا ہے اسے سات سو گنا ثواب ملتا ہے اور جو شخص اپنی جان اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے اسے دس گنا ملتا ہے اور بیمار کی عیادت کا ثواب بھی دس گنا ملتا ہے۔ روزہ ڈھال ہے جب تک کہ وہ اسے خراب نہ کرے، جس شخص پر کوئی جسمانی مصیبت، بیماری یا دکھ درد آئے وہ اس لیے گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔“

یہ حدیث حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت بیان فرمائی تھی جب کہ وہ سخت بیمار تھے اور لوگ عیادت کے لیے آئے تھے، آپ کی بیوی سرہانے بیٹھی تھیں۔ ان سے پوچھا کہ رات کیسے گزری؟ انہوں نے کہا کہ نہایت سختی سے، آپ کا منہ اس وقت دیوار کی جانب تھا، یہ سنتے ہی آپ نے اپنا منہ لوگوں کی طرف کیا اور فرمایا کہ میری رات سختی سے نہیں گزری، اس لیے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ (مذکورہ فرمان) سنا ہے۔“

نیز مسند احمد میں ایک اور حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی ایک نیکی کو دس

نیکیوں کے برابر کر دیا ہے اور پھر وہ سات سو گنا تک بڑھتی رہتی ہے۔‘‘

ابن مردویہ میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے دعا کی کہ اے اللہ! میری امت کو مزید عطا فرما تو مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ والی آیت نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے پھر یہی دعا فرمائی تو اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ [الزمر: ۱۰] والی آیت نازل ہوئی۔ [ابن کثیر ج ۱، ص ۳۸۳]

تعارض:

﴿(۱) مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً [پارہ ۲، رکوع ۱۶] (۲) مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ [پارہ ۲۷، رکوع ۱۷، الحدید] (۳) وَ اَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ [پارہ ۲۷، رکوع ۱۸، الحدید] (۴) اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ [پارہ ۲۸، رکوع ۱۶، التغابن] (۵) مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ (۶) مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا [پارہ ۸، رکوع ۷، الانعام] (۷) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی [پارہ ۲۷، رکوع ۷، النجم]﴾

ان آیات میں دو قسم کا تعارض ہے، ایک تو پہلی چھ آیات کے درمیان تعارض ہے کہ پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے جو شخص اللہ کو قرض حسن دیتا ہے یعنی اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب کئی گنا بڑھا چڑھا کر عطا فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب کئی کئی گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے، دس گنا یا سات سو گنا کی کوئی تحدید نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ عطا فرمائیں گے، جب کہ آیت نمبر ۵ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال

ایسی ہے کہ ایک دانہ کسی نے بویا، اس سے سات بالیں اُگیں، ہر بالی میں سو سو دانے ہوئے، یعنی ایک دانہ خرچ کرنے کا ثواب سات سو دانوں کے برابر ملتا ہے، معلوم ہوا کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا کر دیا جاتا ہے اور اسی آیت کے آخری جملہ " وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ" کا مطلب اگر سات سو گنا سے بھی زیادہ بڑھا دینا لیا جائے کہ جس کے لیے چاہتے ہیں سات سو سے بھی زیادہ بڑھا دیتے ہیں تو اس جملہ کا مفہوم پہلی چار آیات کے مترادف ہوگا اور اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ جس کے لیے چاہتے ہیں سات سو گنا تک بڑھا دیتے ہیں تو اس کا مضمون اس آیت کے اول حصہ کے مترادف ہوگا اور صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا کر دینا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے جس کے لیے چاہتے ہیں سات سو گنا کر دیتے ہیں بہر حال اس آیت کے اول حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا ملتا ہے اور آیت ۶ میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا دیا جاتا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے کہ پہلی چار آیات میں تضاعف حسنہ بلا تحدید اور آیت نمبر ۵ میں تضاعف الی سبعمائۃ اور آیت نمبر ۷ میں تضاعف الی عشر امثالھا ہے۔

دوسرا تعارض پہلی چھ آیات اور آخیر کی آیت نمبر ۷ کے درمیان ہے وہ اس طرح سے کہ پہلی چھ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب تضاعف کے ساتھ ملتا ہے اور آیت نمبر ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب بغیر تضاعف کے اسی کے برابر ملتا ہے، کیونکہ اس میں ارشاد ہے: "وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى کہ انسان کے لیے اسی عمل کا ثواب ہے جس کی اس نے سعی کی ہے۔ اگر ایک نیکی کی ہے تو ایک ثواب، اگر دو کی ہیں تو دو ثواب، اگر تین کی ہیں تو تین وعلی ہذا القیاس ایک نیکی کا ثواب دس گنا یا سات سو گنا نہیں دیا جاتا پس آیت نمبر ۷ پہلی چھ آیات کے بظاہر متعارض ہے؟

جواب

پہلے تعارض کے دو جواب ہیں: (ا) دس گنا اور سات سو گنا اور اس سے زائد

تضاعف کا تفاوت (فرق) اخلاص ونیت اور مشقت میں تفاوت کے اعتبار سے ہے یعنی جس شخص کی نیکی میں ادنیٰ درجہ کا اخلاص یا مشقت ہوتی ہے اس کو دس گنا ثواب ملتا ہے اوسط درجہ کے اخلاص و مشقت میں سات سو گنا اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور مشقت شدیدہ کی صورت میں اس سے زیادہ مثلاً سات لاکھ بلکہ اس سے بھی زائد حد تک تضاعف ہو جاتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں بیس لاکھ اور چالیس لاکھ تک کا بھی ذکر ہے۔

حضرت ابو عثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے لیے ایک نیکی کا ثواب دس لاکھ نیکیوں کے برابر لکھتے ہیں، چنانچہ میں نے اسی سال حج کیا اور صرف اس ارادہ سے حج کیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حج میں ملاقات ہو جائے گی اور ان سے یہ حدیث معلوم کروں گا تو میری ملاقات حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہوگئی میں نے ان سے اس حدیث کے متعلق عرض کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا جس نے آپ سے حدیث بیان کی اس کو یاد نہیں رہی، میں نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مومن بندہ کو ایک نیکی کا ثواب بیس لاکھ لکھتے ہیں پھر فرمایا کہ کیا تم اس چیز کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا الخ کہ جو اللہ کو قرض حسن دیتا ہے اس کے ثواب کو اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھا دیتے ہیں اور اضاعف کثیرہ اللہ کے نزدیک بیس لاکھ اور بیس لاکھ سے زائد ہیں اور قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک حسنہ کو چالیس لاکھ حسنات تک بڑھا دیتے ہیں۔"

[رواہ احمد و ابن المنذر و ابن ابی حاتم بحوالہ روح المعانی ج ۲، ص ۱۶۳]

یا پھر وطن میں رہ کر اور سفر جہاد وغیرہ میں نکل کر نیکی کرنے کے اعتبار سے تفاوت ہوتا ہے۔ یعنی گھر میں رہ کر سات سو گنا اور سفر جہاد وغیرہ میں نکل کر سات لاکھ کا ثواب ملتا ہے جیسا کہ حضرت علیؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابو امامہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت جابرؓ کی مرفوع روایات میں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فرمان مروی ہے کہ ''جس شخص نے اللہ کی راہ میں خرچ بھیج دیا اور خود اپنے گھر مقیم رہا تو اس کو ہر درہم پر سات سو دراہم کا ثواب ملتا ہے اور جو شخص خود اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکل جائے اور وہاں جا کر خرچ کرے تو اس کو قیامت کے دن ہر درہم پر سات لاکھ دراہم کا ثواب ملتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت کریمہ ''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ'' تلاوت فرمائی۔'' [ابن ماجه و ابن ابی حاتم، روح المعانی]

مہاجرین اور اَعراب کے فرق کے اعتبار سے ہے کہ اعراب کے لیے دس گنا اور مہاجرین کے لیے سات سو گنا ثواب ہوتا ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابو الشیخ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور عبد بن حمید وغیرہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا والی آیت خاص کر اَعراب (دیہاتیوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، بہر حال مہاجرین کی نیکی تو سات سو گنا تک بڑھا دی جاتی ہے، مگر ظاہر یہ ہے کہ تضاعف سب کے حق میں عام ہے، اَعراب ہوں یا غیر اَعراب۔ [روح المعانی]

(۲) عشرہ وغیرہ سے تحدید مراد نہیں ہے بلکہ تکثیر مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا ثواب بہت زیادہ عطا فرمائیں گے، اس توجیہ پر تمام آیات کا مفہوم متحد ہو جاتا ہے اور کوئی تعارض نہیں رہتا۔ [روح المعانی]

دوسرے تعارض کے چار جواب ہیں: (۱) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى میں مثلیت کی تصریح نہیں ہے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ انسان کو اس کی سعی حسن کے مثل ہی ثواب ملے گا تضاعف کے ساتھ نہیں جیسا کہ سیئہ (برائی) کے بارے میں مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا میں مثلیت کی تصریح ہے، بلکہ اس آیت میں تو مطلق کہا گیا ہے اور حصر سے مقصود یہ ہے کہ انسان کو صرف اپنی سعی کا ثواب ملتا ہے دوسرے شخص کی سعی کا ثواب نہیں دیا جاتا ہے البتہ ثواب کتنا دیا جاتا ہے اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی، پہلی چھ آیات میں اس کی تصریح کر دی گئی کہ کسی کو دس گنا، کسی کو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ

ثواب دیا جاتا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۲) اگر اس آیت میں مثلیت مراد لی جائے تو جواب یہ ہے کہ آیت عدل پر اور پہلی چھ آیات فضل پر محمول ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں، یعنی عدل و انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اسی کے مثل دیا جائے مگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ثواب میں اضافہ فرمائیں گے۔

خراسان کے والی عبداللہ بن طاہر نے حضرت حسین بن فضل رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت اور وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ کے درمیان تعارض کے متعلق سوال کیا تو حضرت حسین بن فضل رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ **ليس له بالعدل الا ماسعى وله بالفضل ماشاء الله** کہ اگر اللہ تعالیٰ عدل سے کام لیں تو اس کی سعی کے مثل ہی اسے ثواب دیں گے اور اگر فضل و کرم فرمائیں تو جتنا چاہیں بڑھا چڑھا کر ثواب عطا فرمائیں گے۔ اس جواب کو سن کر والی خراسان نے حضرت حسین بن فضل رحمۃ اللہ علیہ کا سر چوم لیا۔ [روح المعانی]

(۳) تضاعف ثواب اس صورت میں ہے جبکہ انسان اس نیت اور امید پر نیکی کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب بڑھا کر عطا فرمائیں گے، اس وقت گویا اس کی سعی تضاعف کے ساتھ ہے، لہٰذا اس کا ثواب بھی تضاعف کے ساتھ ہوگا، پس تضاعف کی صورت میں جزاء سعی کے مثل رہی، سعی سے زائد نہ ہوئی، لہٰذا پہلی چھ آیات اور آیت نمبر ۷ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ [تفسیر کبیر]

(۴) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى میں لام، علیٰ کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کی سیئہ پر اسی کے مثل عذاب دیا جائے گا۔ لہٰذا پہلی چھ آیات حسنات کے بارے میں ہیں کہ ان کے اجر و ثواب میں تضاعف ہوتا ہے آخر اور آیت نمبر ۷ سیّاٰت سے متعلق ہے کہ سیئہ کا بدلہ اس کے مثل ملتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ ''مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا لہٰذا ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

[روح المعانی][ماخوذ از مشکلات القرآن ص ۷۶. ص ۸۰]

(۷)

﴿ریاکاری کے لیے خرچ کرنا﴾

آیت کریمہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰىۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًاؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْاؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ [البقرة: ۲۶۴]

ترجمہ

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتلا کر اور ایذا پہنچا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، اس کی مثال اس صاف پتھر کی طرح ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو، پھر اس پر زوردار بارش برسے اور وہ اسے بالکل صاف اور سخت چھوڑ دے، ان کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی، اللہ تعالیٰ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

تشریح

جس طرح نماز کے لیے دو قسم کی شرائط ہیں ایک شرائطِ صحت، جیسے وضو اور طہارت اور دوسرے شرائطِ بقاء جیسے نماز میں کسی سے باتیں نہ کرنا اور کھانے پینے سے پرہیز کرنا، پس اگر وضو ہی نہ کرے تو سرے سے نماز ہی صحیح نہ ہوگی اور اگر وضو کے بعد نماز

شروع کی مگر ایک رکعت یا دو رکعتوں کے بعد نماز میں کھانا پینا یا بولنا شروع کر دیا تو اس کی نماز باقی نہ رہے گی، اسی طرح صدقات و خیرات کے لیے بھی دو قسم کی شرائط ہیں۔ ایک شرائطِ صحت اور دوسری شرائطِ بقاء، اخلاص شرطِ صحت ہے، اخلاص کے بغیر صدقہ صحیح ہی نہیں ہوتا، لہٰذا جو صدقہ ریا کاری اور نفاق کے ساتھ دیا جائے وہ شریعت مطہرہ کی نظر میں معتبر نہیں ہے اور مَنّ اور اذیٰ سے پرہیز شرطِ بقاء ہے، یعنی صدقہ و خیرات اس وقت تک محفوظ اور باقی رہیں گے جب تک صدقہ دینے کے بعد نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ سائل کو کسی قسم کی تکلیف یا اذیت پہنچائی جائے لہٰذا اگر صدقہ دینے کے بعد احسان جتا دیا یا سائل کو اذیت یا دکھ پہنچایا تو وہ صدقہ ضائع اور باطل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ احسان جتانا اور اذیت پہنچانا دونوں چیزیں مفسدات صدقہ میں سے ہیں، جس طرح کھانے پینے اور بولنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اسی طرح احسان جتانے اور اذیت پہنچانے سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے۔ جو صدقہ و خیرات ریا کاری اور نفاق سے دیا جائے اس کا باطل ہونا چونکہ ظاہر ہے اس لیے اس صدقہ کو جو مَنّ اور اذیٰ کی بناء پر باطل ہو اس کو اس صدقہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی جو ریا کاری اور نفاق کی وجہ سے باطل ہوا، اس لیے کہ ریا اور نفاق کا صدقہ ابتداء ہی سے باطل کیونکہ شرط صحت مفقود ہے اور مَنّ و اذیٰ کا صدقہ اصل سے صحیح تھا، بعد میں مَنّ اور اذیٰ کی بنا پر باطل ہوا، اس لیے بقاء کی شرط موجود نہیں ہے اس تشریح سے معتزلہ کا یہ شبہ بھی ختم ہو گیا کہ جس طرح کفر اور ارتداد سے تمام اعمال ضائع اور رائیگاں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہر سیئہ اور معصیت کا ارتکاب بھی سابقہ تمام طاعات کے ضائع ہونے کا سبب ہے اس لیے کہ مَنّ اور اذیٰ کی وجہ سے صدقہ اس لیے باطل ہوا کہ صدقہ جو کہ ایک طاعت تھا اس کی بقاء کی شرط مفقود تھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً ہر سیئہ کا ارتکاب سابقہ تمام حسنات کے حبط اور ضائع ہونے کا باعث ہو۔

جن آیات اور احادیث سے بظاہر جو معلوم ہوتا ہے کہ معاصی اور سیئات سے سابقہ حسنات اور طاعات حبط ہو جاتے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاصی کے ارتکاب سے گزشتہ طاعات باطل ہو جاتے ہیں بلکہ ان احادیث و آیات کا مطلب یہ ہے

کہ ان کے انوارات اور برکات جاتے رہتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان کا نور خارج (زائل) ہو جاتا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زنا سے ایمان سے ہی خارج ہو کر کافر ہو جاتا ہے۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱، ص ۴۰۳]

بہر حال! اس ریا کار کی حالت ایسی ہے جیسے پتھر کی چکنی چٹان (صفوان جمع ہے اور صفوانۃ اس کا مفرد ہے) جس پر خاک پڑی ہو اور موٹے قطروں کی بارش، اس پر برسے اور اسے صاف چکنا کر کے چھوڑ دے۔

اس کے بعد فرمایا کہ دنیا میں جو کچھ کمائی کی تھی، آخرت میں اس سے بالکل نفع حاصل نہ کر سکیں گے اور آخری جملہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ میں درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ ریا کاری اور احسان جتانا اور سائل کو اذیت پہنچانا کافرں کی خصوصیات ہیں، یہ کام مومن شایان شان نہیں ہیں کافر سے مراد ناشکری کرنے والا ہے، منعم حقیقی کی نعمتوں کی ناشکری کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے سرفراز نہیں فرماتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ شرک سے لاپرواہ ہوں، اگر کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس میں وہ کسی دوسرے کو میرے ساتھ شریک قرار دیتا ہے تو میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔'' [رواہ مسلم]

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص شہرت طلبی کے لیے کوئی عمل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کے عمل کو شہرت طلبی کے لیے قرار دیتا ہے اور جو ریا کاری کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کے کام کو ریا کاری قرار دیتا ہے۔

[بخاری و مسلم]

محمود بن لبید رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! شرک اصغر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ریا کاری'' [رواہ احمد]

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''مجھے اپنی امت کے متعلق شرک اور خواہشات نفس کا اندیشہ ہے'' میں نے عرض کیا، کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت شرک کرے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہاں، سنو! بلاشبہ وہ (امت) نہ سورج کی پوجا کرے گی نہ چاند اور پتھر کی اور نہ ہی بتوں کی، بلکہ وہ اپنے اعمال دکھاوے کے لیے کرے گی اور خواہشات نفس کی صورت یہ ہوگی کہ صبح کے وقت لوگ روزہ دار ہوں گے لیکن پھر کوئی خواہش نفس ان کے سامنے آئے گی اور وہ روزہ چھوڑ دیں گے۔'' [رواہ احمد والبیہقی]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز سب سے پہلے شہید کا فیصلہ ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد کرائے گا، وہ (شہید) ان کا اقرار کرے گا، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ پھر تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ شہید کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا حتیٰ کہ شہید ہوگیا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو صرف اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑا تھا تاکہ تجھے بہادر کہا جائے، چنانچہ یہ کہہ دیا گیا۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے منہ کے بل گھسیٹ کر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد اس شخص کو پیش کیا جائے گا جس نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور اس نے قرآن پڑھا ہوگا، اس کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں جتائے گا، وہ اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے اس نعمت کا کیا حق ادا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور تیری رضامندی کے لیے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ کہتا ہے، تو نے اس لیے علم سیکھا تاکہ کہا جائے کہ یہ عالم ہے اور قاری قرآن کہلوانے کے لیے تو نے قرآن پڑھا تھا، چنانچہ وہ کہہ دیا کہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر ایک اور شخص پیش کیا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے وسیع رزق عطا کیا ہوگا اور ہر طرح کا مال دیا ہوگا اس کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے اور وہ ان کا اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے بھی پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا، وہ عرض کرے گا کہ میں نے ایسے راستہ میں مال خرچ کیا جس میں صرف کرنا آپ کو پسند

تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو نے یہ کام اس لیے کیا تا کہ لوگوں میں سخی مشہور ہو، چنانچہ تجھے سخی کہہ دیا گیا، پھر اس کو بھی اللہ کے حکم سے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔'' [رواہ مسلم]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد مزید یہ نقل کیا ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے میری زانوں پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں یہی تینوں ایسے ہوں گے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے آتش دوزخ ان پر بھڑکے گی۔'' [تفسیر مظھری ج ۲، ص ۴۰، ۴۱]

☆☆☆

(۸)

﴿مقبول صدقہ وخیرات کی مثال﴾

آیت کریمہ:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ [البقرة: ۲۶۵]

ترجمہ

''ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی چاہت میں دل کی خوشی اور یقین کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ اس باغ جیسی ہے جو اونچی اور تر زمین پر ہو اور پوری بارش اس پر برسے اور وہ اپنا پھل دگنا لائے اور اگر اس پر بارش نہ بھی برسے تو شبنم ہی کافی ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

تشریح

ان آیات کریمہ میں مقبول صدقات کی مثال بیان فرمائی گئی ہے، ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اپنے مال محض اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنے اور دلی تصدیق اور یقین کی بناء پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کی مثال اس باغ کی سی ہے جو بلندی پر واقع ہو اور اس پر زوردار بارش برستی ہو، اور وہ (باغ) دگنا پھل لائے اور اگر اس باغ پر زوردار بارش نہ بھی برسے تو شبنم اور اوس ہی اس کو کفایت کرتی ہے۔ کیونکہ وہ زمین عمدہ اور آب و ہوا نہایت لطیف ہے، اس لیے تھوڑا پانی بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

بہر حال وہ باغ ایسی عمدہ جگہ پر ہے کہ اس کو زیادہ پانی پہنچے یا تھوڑا وہ باغ خراب نہیں ہوتا اسی طرح مخلص مومن کے صدقات وخیرات اس باغ کی طرح ہے جو ضائع اور برباد نہیں ہوتے، اخلاص اور نیت اور خرچ کرنے کے مطابق اس کو ثواب ملے گا زوردار بارش سے مراد مال صرف کرنا ہے اور شبنم اور اوس سے مراد تھوڑا مال خرچ کرنا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ''اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والے ہیں''۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ کون شخص اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے دیتا ہے اور کون شخص دکھاوے اور نفاق سے دے رہا ہے اور کون دینے کے بعد احسان جتاتا ہے۔

اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ مخلص لوگوں کا عمل ضرور نافع اور مفید ہوتا ہے، خواہ وہ مخلصین، سابقین اور مقربین میں سے ہوں یا اصحاب یمین میں سے ہوں۔ [فتح الرحمن]

فوائد

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، امام شعبیؒ، حضرت قتادہؒ، ابو صالحؒ اور ابن زیدؒ وغیرہ سے منقول ہے کہ ''تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ'' کے معنی تصدیق اور یقین کے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ان مومنوں کی مثال ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں صرف اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو اور تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو دل سے اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس صدقات وخیرات کی کامل جزاء عطا فرمائے گا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے! ''من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه'' یعنی جو شخص رمضان شریف کے روزے رکھے اور اس کا اس بات پر ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ روزے فرض کیے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کے ملنے کی توقع اور امید ہو تو اس کے اگلے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔'' [حدیث صحیح]

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس معنی کو اختیار کیا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۱۶۲]

اس تفسیر کے مطابق مِنْ اَنْفُسِهِمْ میں کلمہ مِنْ ابتدائیہ ہوگا، یعنی ایسی تصدیق اور ایسا ایمان و یقین کہ جو ان کے دلوں سے نکلا ہو۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ" کے ترجمہ میں لکھتے ہیں "وبسبب اعتقاد ناشی از دل خویش" یعنی اپنے دلی اعتقاد کے سبب سے" [فتح الرحمن]

(۲) امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تثبیت سے مراد احتیاط ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: **معناه انهم يثبتون اين يضعون صدقاتهم** یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ وہ احتیاط کرتے ہیں کہ وہ اپنے صدقات و خیرات کہاں خرچ کریں۔ [تفسیر قرطبی ج ۳۱۴، ص ۳۱۴ تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۱۶۳]

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک تثبیت کے معنی نفس کو مقام عبودیت اور منزل ایمان میں ایسا ثابت قدم بنانا کہ اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئے اور دنیا کی حرص و طمع اور مال کی محبت و رغبت اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ اس تفسیر کی بنا پر "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" میں کلمہ مِنْ تبعیضیہ ہوگا اور تَثْبِيتًا کا مفعول واقع ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ جس نے اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے خرچ کیا۔ اس نے اپنے بعض نفس کو ایمان پر جما دیا اور جس نے اپنی جان اور مال دونوں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کیے اس نے اپنے سارے نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دیا اور اس آیت کریمہ: "تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ" میں بھی یہی معنی مراد ہے یعنی اس نے اپنے سارے نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دیا۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس توجہ کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " **هذا الوجه ذكره صاحب الكشاف وهو كلام حسن و تفسير لطيف**" یعنی اس توجیہ کو صاحب کشاف (امام زمخشریؒ) نے ذکر کیا ہے اور یہ بہت عمدہ کلام ہے اور نہایت لطیف ہے۔"

[تفسیر کبیر ج ۲، ص ۵۳ ۳، معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج ۱، ص ۴۰۴، ۴۰۵]

نکتہ

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال صرف کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل، بخل اور مالی محبت سے پاک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نابالغ بچہ کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کا ولی اور سرپرست اس کی طرف سے ادا کرے گا، کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت کی اصل علت اور غایت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں انسان کا مال صرف کروا کے اس کا امتحان لیا جائے کہ مال کی محبت اس کے دل میں موجود ہے یا حکم خداوندی کی تعمیل کا جذبہ غالب ہے جبکہ ولی اور سرپرست کے ہاتھوں نابالغ بچہ کا مال صرف کروانے سے یہ غرض اور مصلحت پوری نہیں ہوتی۔

آیت ہذا میں لفظ ”رَبْوَۃ“ سے مراد وہ اونچا اور ہموار مقام ہے جہاں نہریں بہہ رہی ہوں لیکن نہروں کے کنارے طرفین کی زمین سے نہ اونچے ہوں نہ نیچے اس لیے نہ پانی اوپر آ سکتا ہو اور نہ زمین اونچی اور پانی نیچا ہو۔ ایسے باغ کے درخت نہایت حسین اور صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس باغ کے رَبْوہ پر واقع ہونے کی تصریح فرمائی۔

[تفسیر مظہری، ج ۲، ص ۴۲]

☆☆☆

(۹)

غیر مقبول صدقہ وخیرات کی مثال

آیتِ کریمہ:

﴿ اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ ۖ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [البقرة:۲۶۶]

ترجمہ

”کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور ہر قسم کے پھل موجود ہوں اور اس کا بڑھاپا آچکا ہو اور اس کے ننھے ننھے سے بچے بھی ہوں، پھر اچانک باغ میں تند و تیز آندھی آئے جس میں آگ بھی ہو اور باغ کو وہ جلا ڈالے، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔“

تشریح

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی ایک مثال بیان فرمائی گئی ہے جو نیک اعمال تو انجام دیتے ہیں مگر ان کو ریاکاری، شہرت پسندی یا مَنّ و اذیٰ وغیرہ کی وجہ سے برباد کر دیتے ہیں، ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کا باغ ہو جس میں کھجوروں اور انگوروں کے درخت ہوں اور ان کے علاوہ بھی ہر طرح کے پھل ہوں، اور ان درختوں کے نیچے نہریں بہہ رہی

ہوں اور وہ شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے اور اس کے بال بچے ضعیف وناتواں ہوں کہ خود بھی اس عمر میں کچھ نہیں کرسکتا اور بچے بھی کسی قابل نہیں ہیں، گزر بسر کا ذریعہ صرف اس کا یہی باغ ہو بلکہ بال بچوں کا سارا سہارا بھی یہی باغ ہو ایسے عالم میں اچانک ایک تندوتیز آندھی آئے، اس آندھی میں آگ بھی موجود ہو، وہ آگ سارے باغ کو جلا کر خاکستر کردے۔ عین ضرورت کے وقت جبکہ اس باغ کی سب کو بہت زیادہ ضرورت تھی کچھ بھی نہ بچا، سارا باغ ہی جل کر راکھ ہوگیا۔ اس مثال کو پیش نظر رکھ کر سمجھ لیں کہ اعمال صالحہ کے بجالانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آخرت میں ان (اعمال صالحہ) کا اجر وثواب حاصل ہو اور تمام حاجتیں پوری ہوں اور وہاں کے عذاب سے حفاظت ہو لیکن اخلاص نیت نہ ہونے کی وجہ سے آڑے وقت میں کوئی عمل بھی کام نہ آیا، کیونکہ وہ اعمال اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے نہیں کیے گئے بلکہ لوگوں کو دکھانے اور سنانے اور نام ونمود کی غرض سے کیے گئے تھے جو اعمال بظاہر صالح اور نیک تھے لیکن ریاکاری کی وجہ سے ان کا اجر ضائع ہوگیا، نماز بھی دکھاوے کے لیے پڑھی، حج بھی نام ونمود کے لیے کیا، جہاد بھی اپنی شجاعت و بہادری دکھانے کے لیے کیا، صدقہ وخیرات بھی اپنی شہرت حاصل کرنے کے لیے دیا بلکہ جن کو صدقہ دیا تھا ان پر احسان دھر کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع اور رائیگاں کردیا، اب آخرت میں اعمال صالحہ کی ضرورت ہے اور ان اعمال کا اجر وثواب نہیں مل رہا، ایسے وقت میں جو بدحالی، پریشانی اور فکر وغم لاحق ہوگا اس کا تھوڑا بہت اندازہ باغ والے آدمی کی حیرت ناکی اور پریشانی سے لگالیا جائے، اللہ تعالیٰ فکر مند لوگوں کے لیے نوع بہ نوع مثالیں بیان فرماتے ہیں۔

عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ مذکورہ آیت اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ کس بارے میں نازل ہوئی ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ واللہ اعلم (اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غضبناک ہوکر فرمایا: کہو کہ ہمیں معلوم ہے یا معلوم نہیں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا اس آیت مبارکہ کے متعلق میں کچھ جانتا ہوں، حضرت عمر فاروق

نے فرمایا کہ بھتیجے! ہاں، تم بتاؤ اور (کم عمر ہونے کی وجہ سے) اپنے آپ کو کم تر خیال نہ کرو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس آیت کریمہ میں عمل کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس شخص کی تمثیل بیان کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرتا ہے، پھر اللہ جل شانہ، اس پر شیطان کو مسلط کر دیتا ہے، چنانچہ پھر وہ نافرمانی کرنے لگتا ہے، بالآخر وہ اپنے اعمال کو برباد کر دیتا ہے۔[تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳]

کافر شخص کا بھی یہی حال ہے کہ جب وہ اللہ کے پاس جاتا ہے تو وہاں اس کو کچھ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ جس طرح اس بوڑھے کو اور جو کچھ اس نے کیا ہے کفر کی آگ والی آندھی نے برباد کر دیا۔ اب پیچھے سے بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح اس بوڑھے شخص کی کم سن اولاد اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔

مستدرک حاکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا منقول ہے: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِضَاءِ عُمُرِيْ'' یعنی اے اللہ! مجھے اپنا رزق اس وقت سب سے زیادہ عطا فرمایا جب میں عمر رسیدہ ہو جاؤں اور میری عمر ختم ہو رہی ہو۔'' [حوالہ بالا]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حاصل ایں مثل آنست کہ عمل منّان ومرائی در وقت شدت احتیاج حبط شود چنانچہ بوستان ایں شخص در وقت شدت احتیاج سوخت'' یعنی اس مثال کا حاصل مطلب یہ ہے کہ احسان جتانے والے اور ریا کاری کرنے والے کے اعمال شدید احتیاج کے وقت برباد ہو جائیں گے، جیسے اس شخص کا باغ شدید حاجت کے وقت جل کر خاکستر ہو گیا۔''

یعنی یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو احسان رکھ کر اپنے صدقات وخیرات کو برباد اور اکارت کرتے ہیں، جیسے کسی نے جوانی کے وقت ایک باغ تیار کیا تاکہ بڑھاپے اور ناتوانی کے وقت کام آئے اور اس کا پھل کھائے، لیکن جب بڑھاپا اور ضرورت کا وقت آیا تو عین حاجت اور ضرورت کے وقت وہ سارا باغ جل گیا، اسی طرح یہ صدقہ وخیرات پھل دار باغ کی طرح ہے کہ ان کا پھل آخرت میں کام آئے گا لیکن جب کسی کی نیت میں

اخلاص نہ ہو یا دکھائے سنائے یا احسان جتائے تو وہ باغ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا پھل اور میوہ جو کہ آخرت میں اجر وثواب کی شکل میں اسے ملنا تھا کیسے نصیب ہوگا۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱، ص ۴۰۶، ۴۰۷]

نکتہ

چونکہ کھجور کا درخت اور انگور کا درخت تمام درختوں میں زیادہ فضیلت رکھتے ہیں اور ان کے منافع بھی دوسرے درختوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں اس لیے ان دو درختوں کو خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اگرچہ اس باغ میں ان کے علاوہ بھی دوسری قسم کے پھل اور میوے موجود ہوں، یہاں کھجوروں اور انگوروں کے درختوں کو تغلیباً اور تفضیلاً ذکر فرمایا ہے۔ [نکات القرآن ص ۳۳]

☆☆☆

(۱۰)

﴿کفار کے صدقہ وخیرات کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران:۱۱۷]

ترجمہ

''یہ کفار جو خرچ واخراجات کرتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تیز ہوا چلی جس میں پالا تھا جو ظالم لوگوں کی کھیتی پر پڑا اور اسے تہس نہس کردیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔''

تشریح

اس سے پہلے کی آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ قیامت کے روز کفار کے مال ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اس کو سن کر کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ بعض اوقات کافر اپنے مال سے محتاجوں، یتیموں، مظلوموں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں۔ پُل، مسافر خانے، ہسپتال اور کنویں اور دیگر رفاہی کام انجام دیتے ہیں تو کیا اس قسم کے نفقات و اخراجات سے قیامت کے دن کافروں کو کوئی نفع پہنچے گا اسی شبہ کا ازالہ اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اس قسم کے اخراجات سے ان کو قیامت کے روز کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کو یہ کفار دنیا کی اس فانی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس

میں پالا (سرد) ہو، وہ ان لوگوں کی کھیتی کو جالگا ہو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، پس وہ (پالا) اس کھیتی کو تباہ اور برباد کر گیا ہو، اسی طرح کفار کے صدقہ وخیرات، باغ اور کھیت کی طرح ہیں اور ان کافروں کا کفر اس پالے کی طرح ہے۔ پس جس طرح پالا کھیتی کو برباد اور تباہ کر دیتا ہے اس طرح ان کا کفران کے صدقہ وخیرات کو تباہ و برباد اور اکارت کر دیتا ہے۔ قیامت کے روز ان کو اس کھیتی سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے کفر و شرک کے اس پالے سے آخرت کی کھیتی تباہ و برباد کی اور ضرورت پیش آتے وقت کف افسوس ہی ملتے رہ گئے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱، ص ۵۶۷]

فائدہ

آیت کریمہ میں ''صِرٌّ'' (پالا) سے بظاہر مراد عام ہے یعنی ظالم اور غیر ظالم سب کی کھیتی پالے سے تباہ و برباد ہوتی ہے لیکن آیت مذکورہ میں ظلم کی قید اس لیے بڑھائی گئی ہے کہ اس (پالے) سے اصل نقصان کافر قوم کا ہی ہوتا ہے، اس کی کھیتی تباہ و برباد ہوتی ہے، برخلاف مسلمان کے کہ اس کی کھیتی تباہ و برباد ہوتی ہے لیکن آیت مذکورہ میں ظلم کی قیدس اس لیے بڑھائی گئی ہے کہ اس (پالے) سے اصل نقصان کافر قوم کا ہی ہوتا ہے، اس کی کھیتی تباہ و برباد ہوتی ہے۔ برخلاف مسلمان کے کہ اس کی کھیتی تباہ و برباد ہوتی ہے تو اس کو اس مصیبت پر صبر کرنے پر اجر و ثواب ملتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا جو صدقہ وخیرات قبول نہیں فرماتے یہ کوئی اس پر ظلم نہیں ہے بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ اپنے اس عمل (صدقہ و خیرات وغیرہ) کے ساتھ کفر و شرک کو ملا دیا جس کی وجہ سے پالے کی طرح ان کی تمام کھیتی تباہ و برباد ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بتا دیا تاکہ کفر و شرک سے تمام اعمال رائیگاں اور اکارت ہو جاتے ہیں، ایمان کے بغیر کوئی عمل اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ہے۔ اس سے ایمان کی اہمیت اور اس کی عظمت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اور اصحاب محمد

ﷺ دونوں برابر نہیں ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک مرتبہ عشاء کی نماز کے لیے تاخیر فرمائی، پھر جب تشریف لائے تو جو لوگ انتظار میں تھے ان سے آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”کوئی دین والا اس وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کر رہا، صرف تم لوگ اللہ کا ذکر کر رہے ہو۔“ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کے علماء جیسے حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت اسد بن عبیدؓ، حضرت ثعلبہ بن شعبہؓ وغیرہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ یہ لوگ ان اہل کتاب میں شامل نہیں ہیں جن کی سابق میں مذمت ہوئی ہے بلکہ یہ لوگ ایماندار ہیں اور اللہ کے حکم کی تعمیل کرنے والے ہیں، شریعت محمدیہ کے تابع دار ہیں اور دین پر ثابت قدم اور قائم رہنے والے ہیں۔ یہ پرہیز گار لوگ راتوں کو اٹھ کر نماز تہجد میں تلاوت کلام پاک بھی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی نیکی کی طرف دعوت اور برائی سے روکتے ہیں۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں مخاطب فرماتے ہیں کہ یہ صالح اور نیک پاکباز لوگ ہیں۔ اس سورت کے آخر میں بھی ارشاد فرمایا۔ ”وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ“ الخ[آل عمران ۱۹۹] یعنی ”بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ پر، قرآن مجید پر اور تورات وانجیل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔“

جتنے متقی اور پرہیز گار لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اللہ تعالیٰ کسی کے نیک عمل کو ضائع نہیں کرتا، ہاں البتہ ان کفار کو اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، بلکہ یہ لوگ تو دوزخی ہیں۔ آیت ہذا میں موجود لفظ ”صِرٌّ“ کے معنی سخت سردی کے ہیں جس سے کھیت جل جاتے ہیں، پس جس طرح کسی کی تیار کھیتی پر پالا پڑے تو وہ جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ نفع کیا حاصل ہونا ہے، اصل بھی برباد ہو جاتا ہے اور تمام امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اسی طرح یہ کفار ہیں کہ یہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اس کا اچھا بدلہ تو کجا، الٹا عذاب میں گرفتار ہوں گے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے کفر وشرک اور بداعمالیوں کی سزا اور کارستانیاں ہیں۔

(۱۱)

﴿افتراق اور اختلاف کی ممانعت﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [آل عمران:۱۰۵]

ترجمہ

''تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کے شکار ہوئے، ان ہی لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے مشابہ اور مانند نہ ہو جاؤ جو راہ حق سے الگ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو چھوڑ کر بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور روشن احکام آ جانے کے بعد بھی آپس میں اختلاف کرنے لگے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایات آ جانے کے باوجود اپنی نفسانی اغراض و خواہشات کی بناء پر دین میں اختلاف کرنے لگے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ افتراق اور اختلاف وہ ممنوع ہے جو شریعت مطہرہ کے ایسے صریح اور واضح احکام میں ہو جن میں کسی قسم کا بھی اشتباہ نہ ہو، کیونکہ ایسے اختلاف کا اصل منشاء نفسانی خواہش ہوتا ہے۔ ایسا اختلاف بلاشبہ ممنوع ہے لیکن جو امور اجتہادی ہوں اور شریعت مطہرہ میں ان کا حکم صریح طور پر موجود نہ ہو اور شرعی ادلہ باہم بظاہر متعارض ہوں تو ایسے امور میں تحقیق حق کی خاطر اختلاف کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ امت اسلامیہ کے لیے باعث رحمت ہے صحابہ رضی اللہ عنہم و

تابعینؒ کا کوئی اختلاف بھی شریعت کے کسی صریح حکم کے متعلق نہیں تھا بلکہ قابل اجتہاد مسائل میں اختلاف تھا، چنانچہ ان میں سے جو اجتہاد کے نتیجہ میں صواب (درستگی) کو پہنچا اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور جس سے اجتہادی طور پر خطا ہوئی اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہؓ و تابعینؒ کے باہمی اختلاف پر مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' ہے۔ اہل علم کے لیے قابل دید اور لائق مطالعہ کتاب ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے جو واضح احکامات اور ہدایات کے آجانے کے بعد بھی افتراق اور اختلاف کریں، بڑا عذاب ہے، اس لیے کہ واضح احکامات آجانے کے بعد اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایسے احکامات پر باہم اتحاد و اتفاق لازم ہے، البتہ جو آیات متشابہات میں سے ہیں اور وہ محتمل المعانی ہیں۔ ان میں تاویل و توجیہ کی گنجائش ہے اور آیات محکمات میں سے ہیں یعنی وہ اپنی مراد پر واضح الدلالت ہیں ان میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱ ص ۵۵۷،۵۵۸]

اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ بھی ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرانا بھی ہے۔ اصلاحِ احوال کا حکم دینے کے بعد دوبارہ افتراق و انتشار سے منع فرمایا اور اختلاف و افتراق کی صورت میں اخروی عذاب کی دھمکی بھی ہے تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں محبت و اتفاق کی جڑیں مضبوط ہوجائیں اور میدان جنگ میں کفار کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکیں۔

بعض مفسرین کرام نے ''تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا'' کو ایک ہی معنی پر محمول کیا ہے اور تکرار لفظ کو تاکید پر محمول کیا ہے اور اس آیت مبارکہ میں اختلاف و تفریق سے مراد توحید باری تعالیٰ اور اصول دین میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے ''تَفَرَّقُوْا'' سے باہمی بغض و عداوت اور ''اِخْتَلَفُوْا'' سے مذہبی اور دینی اختلاف مراد لیے ہیں۔ [روح المعانی ج ۴، ص ۲۳] اور ''اَلَّذِیْنَ'' سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جنہوں نے توحید باری تعالیٰ اور اصول دین میں تفرق اور اختلاف کیا۔ [تفسیر المدارک ج ۱، ص ۱۳۶، تفسیر قرطبی

ج۴، ص ۱۶۶]اور ''بَیِّنَات'' سے مراد تورات وانجیل کی وہ صریح آیات ہیں جن میں دین اسلام، توحید الٰہی اور صداقت محمدیؐ وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے اور جن کے بعد انہیں کسی قسم کا اختلاف نہیں کرنا چاہیے تھا۔[تفسیر کبیر ج ۲، ص ۲۸]اور اُولٰٓئِکَ سے ان ہی اختلاف کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے یعنی جن لوگوں نے دین میں اختلاف اور تفرقہ پیدا کیا ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

لطائف ونکات

(۱) دین اسلام سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کا حصول ہے اور اس کے غضب اور عذاب سے نجات حاصل کرتا ہے، لیکن آج کے دانشور محض قومیت کی غرض سے اسلام کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ بس ہماری ایک قوم تیار ہو جائے اور ہمارے اندر اس غرض سے ایک اتحاد و اتفاق کی شان پیدا ہو جائے، ان کے ہاں اصل مقصود دین نہیں ہوتا جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں دینی اور مذہبی رنگ نہیں ورنہ اگر یہ جذبہ مذہب کے اعتبار سے ہوتا تو ان میں دینی اور مذہبی رنگ بھی نظر آتا۔[تسهل المواعظ ج ۲، ص ۵]

(۲) یاد رکھنا چاہیے کہ اس آیت کریمہ میں جس افتراق وانتشار سے منع فرمایا گیا ہے اس سے تفرق عن الحق مراد ہے یعنی حق سے جدا ہونا، کیونکہ چوروں اور اوباش لوگوں میں بھی اتفاق ہوتا ہے حالانکہ وہ مطلوب نہیں ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق لے کر آئے، اہل باطل ان کی جان کے دشمن ہو گئے اور ہر جگہ دو مذہب اور دو فریق بن گئے۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ معاذ اللہ ان انبیائے کرام علیہم السلام نے تفرقہ ڈالا، انبیاء کرام علیہم السلام کو باہمی اتحاد و اتفاق کی دعوت دینے کے لیے معبوث ہوئے مگر ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام لوگ باطل کو ترک کر کے حق کے ساتھ متحد و متفق ہو جائیں لیکن لوگوں نے اس کے برخلاف معاملہ کیا۔ ہر حکومت اتحاد و اتفاق کو لازم سمجھتی ہے لیکن اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حکومتی قانون کے ساتھ اتفاق کرو، خلاف قانون کوئی کام نہ کرو،

عدالتیں ایسی مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہیں تا کہ حقدار کو اس کا حق دلایا جائے اور ظالم کو سزا دی جائے۔تفرقہ بازی کا اصل مجرم وہ ہوتا ہے جو حکومتی قوانین کی خلاف ورزی کرے اور جو شخص حکومتی قانون کے مطابق زندگی بسر کررہا ہو اسے تفرقہ بازی کا مجرم اور مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عدالت میں اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں شخص نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے تو جج کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دونوں (مدعی اور مدعیٰ علیہ) کو یہ کہہ کر عدالت سے نکل جانے کا حکم دے کہ تم دونوں اس ملک میں تفرقہ بازی کررہے ہو، عدالت اگر ایسا کوئی حکم دیدے تو وہ عدل پر مبنی نہ ہوگا بلکہ سراسر ظلم ہوگا۔اگر عدالت کا جج قوم کا لیڈر اور مصلح ہو تو وہ بھی بحیثیت جج یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارا دعویٰ نہیں سنتا، جاؤ! اختلاف نہ کرو، باہم متفق رہو، میرا دماغ پریشان نہ کرو، جاؤ میں تمہارا مقدمہ خارج کرتا ہوں، یہی حال علماء کا ہے کہ وہ وکلاء کی طرح قانون شریعت کی صحیح تعبیر وتشریح کرتے ہیں اور ملحدین قانون شریعت میں ایسی تاویلات اور تحریفات کرتے ہیں کہ جس سے قانون شریعت ان کی خواہشات اور اغراض کے مطابق ہو جائے۔علماء جب ایسے بے دین لوگوں کے جواب کے لیے اٹھتے ہیں اور ان کی تاویلات کا رد کرتے ہیں تو بہت سے عقل سے عاری لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ علماء تفرقہ بازی اور امت میں نا اتفاقی پھیلاتے ہیں۔

(۳) آیتِ کریمہ میں جس تفرق اور اختلاف کی مذمت اور ممانعت بیان کی گئی ہے۔اس سے مراد وہ اختلاف ہے کہ جو دین کے صریح احکام و ہدایات میں محض نفسانی خواہشات کے جذبہ کی بنا پر ہو اور وہ اختلاف جو غیر منصوص مسائل میں محض تحقیق حق (تلاش حق) کے لیے ہو وہ مسلمانوں کے لیے باعث رحمت ہے۔حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگ بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے۔میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ باقی سب دوزخی ہوں گے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا، یارسول اللہ! وہ کونسا فرقہ ہوگا جو جہنم سے محفوظ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ما انا علیہ واصحابی یعنی نجات پانے والا فرقہ وہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے

طریقہ پر چلنے والا ہوگا۔ اہل سنت والجماعت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ فرقہ، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت اور طریقہ پر کاربند ہے اور اس کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کے طریقہ پر بھی چلنے والا ہے۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ اور راستہ اللہ تعالیٰ کے طریقہ اور راستہ سے جدا نہیں ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ اور راستہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ اور راستہ سے الگ اور جدا نہیں ہے۔ صراط مستقیم دراصل وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اس کے راہی بنے۔

(۴) نجات یافتہ فرقہ کے علاوہ دیگر مخالف بڑے بڑے فرقے یہ ہیں: (۱) خوارج، (۲) روافض، (۳) قدریہ، (۴) جہمیہ، (۵) مرجئہ (۶) جبریہ، پھر ہر ایک کی مختلف شاخیں ہیں جو سب مل کر بہتر ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام فرقے اور ان کی شاخیں سب باطل فرقوں میں داخل ہیں۔

جیسا کہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''قال ابوالفرج الجوزیؒ فان قیل هذه الفرق معروفة (فالجواب) انا نعرف الافتراق واصول الفرق وان كل طائفة من الفرق انقسمت الى فرق وان لم نحط باسماء تلك الفرق و مذاهبها فقد ظهرلنا من اصول الفرق، الحرورية والقدرية والجهمية والمرجئة والرافضة والجبرية وقال بعض اهل العلم اصل الفرق الضالة هذه الفرق الست وقد انقسمت كل فرقة منها اثنتى عشرة فرقة فصارت اثنتين و سبعين فرقة'' [تفسیر قرطبی ج۴، ص ۱۶۰]

اس کے بعد امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام بہتر فرقوں کی تفصیل ذکر فرمائی ہے۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱، ص ۵۶۰، ۵۶۱]

☆☆☆

(۱۲)

﴿سودخوروں کا عبرتناک انجام﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۷۵]

ترجمہ

”جولوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہ ہوں گے مگر اس طرح کہ جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جیسے شیطان چھو کر خبطی بنادے، یہ اس لیے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، پس اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جس نے دوبارہ یہ کام کیا تو یہی لوگ جہنمی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

تشریح

سابقہ آیات میں صدقہ وخیرات کا بیان تھا، اب ان آیات میں سود کے احکامات ذکر فرما رہے ہیں کہ جو صدقہ وخیرات کی ضد ہے، اس لیے کہ صدقہ وخیرات سے اخلاق ومروّت اور مخلوق خداوندی کی نفع رسانی میں اضافہ ہوتا ہے اور سود میں سراسر

بے مروتی اور ضرر رسانی ہے، صدقہ و خیرات میں صلہ رحمی اور محتاجوں اور غریبوں کی مدد ہوتی ہے اور سود میں غریبوں پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے، اس لیے مناسب ہوا کہ صدقہ وخیرات کی فضیلت ذکر کرنے کے بعد سود کی مذمت اور اس کی حرمت کا ذکر کیا جائے تا کہ سود کی حرمت اور مذمت سے صدقہ وخیرات کی اہمیت اور فضیلت مزید راسخ ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جتنی قباحت سود میں ہے۔ اتنی بھلائی صدقہ وخیرات میں ہے۔ نیز صدقہ وخیرات سے مال بظاہر کم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں بڑھتا ہے اور سود کا معاملہ برعکس ہے کہ اس میں مال بظاہر بڑھتا ہے حقیقت میں وہ کم ہوتا ہے۔ نیز سابقہ آیات میں صدقہ خیرات کرنے والوں کا حال بیان فرمایا کہ دنیا و آخرت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا۔ اور آخرت میں وہ کسی غم میں مبتلا نہ ہوں۔ اب ان آیات میں سود کھانے والوں کا حال بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ قبروں سے مدہوش، وحشت زدہ اور حواس باختہ ہو کر اٹھیں گے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے حلال وحرام کو برابر کر دیا اور سود اور بیع کو یکساں سمجھا، ظاہر ہے کہ حلال وحرام کو برابر سمجھنا۔ حواس باختہ انسان کا ہی کام ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کی سزا یہ قرار دی گئی کہ قیامت کے دن اپنی قبروں سے دیوانوں کی طرح مخبوط الحواس اٹھیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے روز اپنی قبروں سے اس طرح اٹھیں گے۔ جس طرح وہ شخص اٹھتا ہے جس کو جنات نے لپٹ کر بدحواس بنا دیا ہو۔ سود کھانے والا انسان مال کی محبت اور اس کے خبط میں گرفتار رہا اور اسی خبط اور حالت میں مرا اور اسی حالت میں اس کا حشر ہو گا۔ اس کی یہ سزا اس لیے مقرر ہوئی کہ یہ لوگ حلال وحرام کو یکساں کرنا چاہتے ہیں اور سود کے حلال کرنے کے لیے استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ خرید وفروخت بھی تو سود کی طرح ہے کہ جس طرح خرید وفروخت میں مال میں زیادتی اور نفع ہوتا ہے اسی طرح سود میں بھی مال بڑھتا ہے اور اس میں نفع ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پھر بیع کو حلال اور سود کو حرام کیوں قرار دیا گیا؟......

فائدہ

کافروں نے سود کی حرمت کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لیے یہ کہا۔ ''اِنَّمَا الْبَیْعُ

مِثْلُ الرِّبٰوا''اگرچہ اصل کلام اس طرح تھا۔ ''انما الربوا مثل البیع''یعنی سود، خرید وفرخت کی طرح ہے۔ گویا کہ حلال ہونے میں سود اصل ہے اور بیع حلال ہونے میں اس (سود) کے مشابہ ہے۔

حاصل یہ کہ ان کفار نے محض اس بناء پر کہ دونوں میں چونکہ نفع وزیادتی مقصود ہوتی ہے اس لیے دونوں کو حلال خیال کیا، حالانکہ بیع اور ربوا میں زمین وآسمان کا فرق ہے، جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں۔ اگر بالفرض ان میں کوئی فرق نہ ہوتا تو اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ چونکہ مالک ومختار ہیں اس نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات پاک حاکم مطلق اور مالک مطلق ہے تو اسے اختیار کامل حاصل ہے کہ جسے چاہیں حلال کریں اور جسے چاہیں حرام کریں کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس کی وجہ معلوم کرے۔ جیسا کہ فرمایا: لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ۔''

بیع اور ربوا میں فرق

بیع میں جو نفع اور زیادتی حاصل ہوتی ہے وہ مال کے عوض اور مقابلہ میں ہوتی ہے اور سود میں جو نفع اور زیادتی حاصل ہوتی ہے وہ مال کے عوض میں نہیں ہوتی بلکہ بلاعوض کے ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نے ایک روپیہ کی قیامت کا کپڑا دو روپے میں فروخت کیا تو یہ دو روپے کپڑے کے عوض اور مقابلہ میں ہوں گے اور اگر ایک روپے کو دو روپے کا مقابلہ میں فروخت کیا تو ایک روپیہ تو ایک روپیہ کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا روپیہ بلاعوض کے ہوگا، کیونکہ تمام روپے ایک جنس ہیں اور کپڑا اور روپے علیحدہ علیحدہ قسم ہیں، ہر ایک کی غرض اور نفع بھی جدا جدا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایک روپے کے کپڑے کو ایک ہزار روپے میں بھی خریدے تو وہ سود نہ ہوگا یعنی یہ نفع عوض اور مقابلہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جنس مختلف ہے لہٰذا جب ایک روپیہ ایک روپیہ کے مقابلہ میں ہوگا تو دوسرا روپیہ عوض سے خالی ہوکر سود ہو جائے گا جس کو شریعت مطہرہ نے حرام قرار دیا ہے۔ بیع اور تجارت میں قابل معاوضہ چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور ربوا (سود) اصل قرض پر کچھ زیادہ لینے کو کہتے ہیں جو

تاخیر وقت کے عوض میں زیادتی کی جاتی ہے اور مہلت اور تاخیر نہ عقلاً مال ہے اور نہ عرفاً کوئی ایسی چیز ہے جس پر قبضہ ہو سکے اور عوض اور مقابل بن سکے اور جو چیز بلاعوض اور بلابدل کے حاصل کی جائے وہ باطل اور ناحق ہے۔

لہٰذا جو شخص بیع اور ربوا کو برابر سمجھتا ہے وہ معاوضہ اور مقابلہ میں بدحواسی سے کام لیتا ہے۔ اس لیے اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ اپنی قبر سے دیوانہ اور حواس باختہ ہو کر اٹھے گا۔ ہر عمل کی جزا اس کے مناسب ہوا کرتی ہے۔

سود خوار لوگوں کا سود کے حلال کرنے کے لیے یہ استدلال کرنا کہ جس طرح بیع اور تجارت میں مالی نفع اور زیادتی ہوتی ہے اسی طرح سود میں بھی نفع اور زیادتی ہوتی ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس استدلال کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ جس طرح بیوی عورت ہے اسی طرح ماں بھی تو عورت ہے، پھر ایک کے حلال اور دوسری کے حرام ہونے کی کیا وجہ ہے!

ربوا کی قسمیں

ربوا کی دو قسمیں ہیں: (۱) ربا نسیہ (۲) ربا فضل۔ ربا نسیہ اس سود کو کہتے ہیں جو قرض اور ادھار کی صورت میں ہو، زمانہ جاہلیت میں ربوا کی یہ قسم عام تھی، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص کسی کو متعین میعاد پر قرض دیتا اور اس پر کچھ ماہانہ مقرر کر لیتا، پھر اگر مقرر میعاد پر ادائیگی نہ ہوتی تو قرض خواہ اصل رقم میں کچھ بڑھا کر مقروض کو مہلت دے دیتا اور کبھی سود کو اصل میں جمع کر کے اس پر سود لگا دیتا۔ یہاں تک کہ سود اصل قرض سے کئی کئی گنا بڑھ جاتا اور ربا فضل اس سود کو کہتے ہیں کہ جو متحد الجنس چیزوں میں کمی و زیادتی کے ساتھ مبادلہ کرنے میں ہو مثلاً ایک کلو گندم کو ڈیڑھ کلو گندم کے عوض میں فروخت کیا جائے تو یہ ربا الفضل ہے۔ مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت ہذا ربا کی پہلی قسم کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن آیت اپنے عموم کی بناء پر ربا کی قسم ثانی کو بھی شامل ہے جیسا کہ متواتر احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال سے اس کی مزید

تشریح وتوضیح ہوتی ہے۔

حرمت ربوا کی وجہ

تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ غریبوں کی مدد کرنا عین مروت اور کمالِ انسانیت ہے اور غریبوں کی غربت اور ناداری کو حصول منفعت کا ذریعہ بنانا کمال درجہ کی دناءت اور نہایت قبیح اور خسیس فعل ہے۔

(۱) سود خوار بلاعوض نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، جب اس کی اصل رقم بعینہٖ واپس اسے مل گئی ہے تو یہ زائد رقم آخر کس چیز کا معاوضہ ہے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ زائد رقم اس مہلت اور تاخیر کا معاوضہ ہے کہ جو مقروض کو قرض خواہ کی طرف سے ملی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ اور مدت تو کوئی مال نہیں ہے جس کے عوض میں رقم لینا صحیح ہو۔

(۲) سود انسان کو بے رحم اور بے ایمان بنا دیتا ہے اور فریب کاری اور دھوکہ بازی کے نت نئے طریقہ اس کے دل میں ڈالتا ہے حتی کہ انسان کو انسانیت سے نکال دیتا ہے۔

(۳) سود سے ملکی ترقی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب مال دار سود کے ذریعہ اپنا مال بڑھائے گا تو تجارت زراعت اور صنعت وحرفت پر روپیہ نہیں لگائے گا جس پر ملکی ترقی کا دارومدار ہے۔

(۴) سودی کاروبار اور اس کے لین دین سے انسانی مروت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

(۵) سودی معاملات سے مال اور دنیا کی محبت ورغبت اس قدر بڑھ جاتی ہے اور دل میں راسخ اور پیوست ہو جاتی ہے کہ حرص وطمع میں مبتلا ہو کر وہ ہر برائی اور نافرمانی کر گزرتا ہے۔

(۶) تجارت اور کاروبار کا دارومدار باہمی رضامندی پر ہے اور اسی کی تکمیل کے لیے

شریعت مطہرہ نے خرید وفروخت کے معاملات میں خیارِ عیب، خیارِ شرط اور خیارِ رؤیت کو جائز رکھا ہے۔

تجارت میں جو شخص مثال کے طور پر غلہ خرید تا ہے تو وہ اپنے کھانے کے لیے یا کاشت کاری کے لیے یا آگے دوسرے کو فروخت کرنے کے لیے خرید تا ہے اور یہ سب کچھ بائع ومشتری کی باہمی رضامندی اور اختیار سے ہوتا ہے جبکہ سود کا ہر معاملہ مجبوری اور ناگوای کے طور پر ہوتا ہے، باہمی رضا ورغبت کے طور پر نہیں ہوتا، جو شخص بھی ایک سو روپیہ لے کر ایک سو دس روپے کا معاملہ کرتا ہے وہ ہرگز دلی خوشی سے نہیں کرتا بلکہ مجبور اور لاچار ہو کر انتہائی ناگواری کے ساتھ کرتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ اس سودی معاملہ سے اسے حقیقی فوائد حاصل نہیں ہوئے، صرف موہوم منافع کی توقع پر سودی قرض لیتا ہے۔

الغرض سودی کاروبار انسانی مروّت اور باہمی ہمدردی اور صلہ رحمی کے بھی خلاف ہے بلکہ لوگوں کی عام مصلحتوں اور ضرورتوں کے بھی خلاف ہے اور تجارتی اصول کے بھی خلاف ہے کہ اس معاملہ کی بنیاد ہی مجبوری اور لاچاری پر ہے، سودی معاملات میں انسان کا دل خوشی کی بجائے پریشانی کو محسوس کرتا ہے اور سودی قرض کو اپنی گردن پر ایک بارگراں خیال کرتا ہے، اس کے اظہار سے شرماتا اور انجام کار پچھتاتا ہے اور یہ کاروبار (سودی) معاشرہ کے لیے بھی ضرر رساں ہے، اخلاقی اور روحانی مفاسد اور خرابیوں کی بنیاد بنتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا جس میں کمال درجہ کا لوگوں پر رحم اور ان کے لیے غایت درجہ کی خیر خواہی کا پہلو موجود ہے۔

(۷) سودی معاملہ حکمت ودانائی کے بھی خلاف ہے، نیز درہم ودنانیر کی اصل وضع کے بھی منافی ہے۔ اس بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ''سود کی حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی روپیہ سے بیع وتجارت کر کے نفع حاصل کیا جائے اور روپیہ کی روپیہ سے تجارت کرنا اس کی اصل وضع کے منافی ہے، اس

لیے کہ درہم و دنانیر اصل مقصود نہیں بلکہ یہ ضروریات زندگی کے حصول کا سبب اور ذریعہ ہیں، ایک غیر مقصود چیز کو اس کی حد سے نکال کر اصل مقصود تک پہنچانا اس کی وضع کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب روپیہ کی روپیہ سے تجارت ہونے لگے گی تو یہ سبب اور ذریعہ نہیں رہے گا بلکہ مقصود اصلی بن جائے گا۔ سونا اور چاندی بالذات مقصود نہیں ہوتا، انسان کی ضروریات زندگی صرف سونے اور چاندی سے پوری نہیں ہوسکتی جب تک کہ سونے اور چاندی کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کا وسیلہ نہ بنایا جائے۔ سونا اور چاندی اپنی ذات کے اعتبار سے ایک پتھر کی مانند ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سونے اور چاندی کو ایک ترازو بنادیا ہے جس سے اشیاء کی قیمتوں کا وزن کیا جاتا ہے اور یہ ایک عجیب وغریب ترازو ہے کہ جو شخص اس کا مالک ہوگیا وہ درحقیقت تمام چیزوں کا مالک ہوگیا کہ اس کے ذریعہ جو چاہے خریدے، کپڑے سے کھانے کی ضرورت اور کھانے سے کپڑے کی ضروریات پوری نہیں ہوتی، البتہ روپیہ سے ہر طرح کی صفت پوری کی جاسکتی ہے مگر اس کے باوجود صرف سونے اور چاندی کی ذات سے نہ بھوک اور پیاس دور ہوسکتی ہے اور نہ گرمی وسردی دور ہوسکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی اپنی ذات میں مقصود نہیں بلکہ ضروریات مقصودہ کا ذریعہ ہیں، جیسا کہ نحوی حضرات حرف کے متعلق کہتے ہیں کہ حرف معنی فی نفسہ کے لیے وضع نہیں ہوتے بلکہ معنی فی غیرہ کے لیے وضع ہوتے ہیں، یہ درہم و دنانیر بھی ایسے ہی ہیں کہ خود مقصود نہیں بلکہ دیگر ضروریات مقصود کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہیں، نیز جس طرح آئینہ ہوتا ہے کہ وہ دیگر چیزوں کے رنگوں کے دیکھنے کا ذریعہ اور آلہ ہیں خود مقصود نہیں ہوتا، سونا چاندی بھی اسی طرح ہے نیز سونا اور چاندی بظاہر سب کچھ ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت روٹی کا سوکھا ٹکڑا اور پھٹے ہوئے کپڑے کا ٹکڑا بھی کام دے جاتا ہے مگر سونے اور چاندی کا ٹکڑا کام نہیں دیتا، تندرستی کے وقت غذا اور بیماری کے وقت دوا مقصود ہوتی ہے اور سونا اور چاندی اس مقصود کے حصول کا ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے کہ جس کے ذریعہ زندگی کی ضروریات کو حاصل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جس نے روپیہ کی روپیہ سے تجارت کر کے نفع حاصل کیا اس نے دراصل اس کو اصل وضع

کے خلاف استعمال کیا اور بڑا ظلم کیا، کیونکہ اسی چیز کو بے محل استعمال کرنا ہی ظلم کہلاتا ہے۔"

[احیاء العلوم، کتاب الشکر، ج۴، ص۷۹، الاتحاف شرح احیاء العلوم از علامہ زبیدی ج۹، ص ۶۳ تا ج ۹، ص ۶۶]

تمام آسمانی مذاہب میں سود کی حرمت

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "تمام آسمانی شرائع وادیان میں سود حرام رہا ہے، اللہ تعالیٰ سود کی قباحت و شناعت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ" یعنی یہودی لوگ سود لیا کرتے تھے حالانکہ ان کو تورات میں سود لینے سے منع کیا گیا تھا۔" [تفسیر قرطبی ج۳،ص ۳۶۶]

توریت سفر خروج باب ۲۲ درس ۲۵ میں ہے: "اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔"

اسی طرح انجیل لوقا باب ششم درس ۳۵ میں بھی سود کے بغیر قرض دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔

سُود، زوالِ معیشت کا سبب ہے

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سود خوری بڑھتی جارہی ہے۔ اس کے باوجود مسلمان مٹتے جاتے ہیں اور روز بروز بجائے ترقی کے تنزلی ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کے ترقی کا جو زمانہ گزرا ہے اس میں سود کا نام و نشان تک نہ تھا اور مغربی اقوام کی ترقی کی وجہ ان کی صنعت و حرفت ہے۔ اس کی وجہ سود نہیں ہے۔

بارہ سو سال تک مسلمانوں کو عروج اور ترقی حاصل رہی حالانکہ اتنے عرصہ میں ان کو کبھی بھی سود کی ضرورت پیش نہیں آئی، جب سے مسلمان حکمرانوں اور مالداروں نے دین سے انحراف کیا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا شروع کی اور رقص و سرود میں مبتلا ہوئے تب سے زوال شروع ہوا جو اب تک مسلسل جاری ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس دور میں سود کے بغیر کاروبار کیونکر ممکن ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج بھی اسی طرح

سود کے بغیر کاروبار چل سکتا ہے جس طرح پہلے چلتا تھا بلکہ خوب چلتا تھا، راشی لوگ بھی رشوت کے جواز میں یہی دلیل دیتے ہیں کہ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جس کو اس کے پروردگار کی جانب سے نصیحت پہنچ گئی یعنی سود کی حرمت اور اس کی ممانعت اس کو معلوم ہوگی، پھر وہ باز آ گیا یعنی اس فعل حرام اور قول کفر سے باز آ گیا کہ اس نے سود لینا بھی چھوڑ دیا اور یہ کہنا بھی چھوڑ دیا کہ بیع اور سود دونوں میں یکسانیت ہے تو سود کی حرمت سے پہلے جس قدر وہ لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہ لیا جائے گا وہ اس کا مالک ہوگا اور اللہ کے ہاں اس پر کوئی مواخذہ بھی نہ ہوگا اور دل کا حال اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے کہ اگر صدق نیت سے باز آیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جزا دے گا اور اگر کسی دنیاوی غرض کی بناء پر توبہ تائب ہوا ہے تو اس کے مناسب معاملہ ہوگا۔ لیکن جو شخص اس نصیحت کے بعد بھی اسی فعل حرام اور قول کفر کی طرف عود کرے گا یعنی حرمت سود کے بعد بھی سود سے باز نہ آئے گا اور سودی معاملہ کرتا رہے گا اور بیع اور سود کو ایک جیسا کہتا رہے گا تو ایسے لوگ ہی دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، کیونکہ حرام کو حلال جاننا کفر ہے جو ہمیشہ کے لیے جہنم میں جانے کا سبب ہے۔

لطائف واحکام

(۱) جو شخص سود کو حلال سمجھے وہ باجماعِ امت مرتد اور کافر ہے اور اگر سود کو حلال تو نہیں سمجھتا اور اس کو چھوڑتا بھی نہیں ہے تو حاکم وقت پر لازم ہے کہ ایسے شخص کو توبہ تائب ہونے تک قید خانہ میں ڈالے رکھے اور اگر اس قسم کا گروہ ہے جن کو پابندِ سلاسل کرنا مشکل ہو تو حاکم وقت پر واجب اور لازم ہے کہ ایسے گروہ سے قتال اور جہاد کرے بلکہ جو شخص فرائض جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ کا تارک ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ [احکام القرآن للجصاص ج ۱، ص ۴۷۳]

(۲) امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو اس لیے حرام قرار دیا کہ لوگ قرض کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو دو مرتبہ قرض دینا ایک مرتبہ صدقہ دینے کے برابر ہے۔

[تفسیر قرطبی ج۳، ص ۳۵۹]

(۳) حرام مال سے توبہ کی صورت یہ ہے کہ سود اور رشوت وغیرہ کی جو رقم اپنے پاس ہے وہ حقدار کو واپس دیدیے یا اس سے معاف کرالے اور اگر صاحب حق کو تلاش کرنا یا اس کا ملنا مشکل ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کردے اور ایسے مصرف میں اس کو صرف کرکے کہ جس میں مسلمانوں کا عام نفع ہو اسی طرح اگر کسی کی ساری آمدنی ہی حرام کی ہو تو سب کا صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ ستر عورت کا کپڑا مستثنیٰ ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی کوئی چیز اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں ہے۔ [تفسیر قرطبی ج ۳، ص ۳۶۶]

(۴) فقہائے کرام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مال حرام پر زکوٰۃ نہیں ہے لہٰذا جس کے پاس سود یا رشوت وغیرہ کا کروڑوں روپیہ بھی موجود ہو اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ مال حلال پر واجب ہوتی ہے۔ سود، رشوت، دھوکہ بازی، چوری اور خیانت وغیرہ سے حاصل شدہ مال تو دوسروں کا حق ہے۔ اس پر زکوٰۃ کیسے واجب ہوسکتی ہے!

بلکہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو شخص حرام مال صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے اس پر اجر و ثواب کی امید بھی رکھے تو اس کے بارے میں کفر کا اندیشہ ہے، بارگاہ رب العزت میں ناپاک چیز پیش کرکے اللہ تعالیٰ سے رضا اور خوشنودی کی امید رکھنا انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہے۔

(۵) سود کے احکام کو "وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ" پر اس لیے ختم فرمایا تاکہ دنیا اور دنیا کے مال و متاع کا زوال اور آخرت کی رغبت اور اس کی طرف رجوع اور پائی پائی کا وہاں حساب کتاب نظروں کے سامنے آجائے اور دنیا اور اس کے مال و دولت کے دل دادہ اور حریص لوگ ہوش کے ناخن لیں، کیونکہ جو

شخص دنیا کی محبت میں گرفتار ہو اس کا علاج صرف یاد آخرت میں ہے۔[معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج ۱، ص ۴۱۳ تا ۴۲۲]

اب ذیل میں سود کی قباحت وشفاعت اوراس کی مذمت اور وعید کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں انہیں ذکر کیا جاتا ہے۔

سُود کی مذمت میں واردشدہ چند احادیث کا ذکر

(۱) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج کے واقعہ میں فرمایا، پھر جبریل علیہ السلام مجھے لے کر بہت سارے لوگوں کے پاس پہنچے، ان میں سے ہر ایک کا پیٹ بڑی کوٹھڑی کی طرح تھا، یہ لوگ فرعون کے ساتھیوں کی گزرگاہ کے بالکل سامنے موجود تھے، ان فرعونیوں کی صبح وشام پیشی ہوتی ہے اور وہ فرعونی بھڑکائے ہوئے ان اونٹوں کی طرح جو اندھا دھند پتھروں اور درختوں کو روندتے چلے جاتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں، سامنے سے دوڑے آرہے تھے۔ جب ان پٹیل لوگوں کو ان کی آہٹ محسوس ہوئی تو وہ (راستہ سے ہٹنے کے لیے) کھڑے ہونے لگے لیکن ان کے پیٹ ان کو لے جھکے، آخر وہ پچھڑ گئے، پھر ان میں سے ایک شخص اٹھنے لگا لیکن اس کا پیٹ اس کو لے جھکا اور وہ بھی پچھڑ گیا، غرض وہ ہٹ نہ سکے، اتنے میں وہ فرعونی لوگ ان پر آپہنچے اور ان کو آتے جاتے روندتے رہے، ان پر یہ عذاب دنیا وآخرت کے درمیان برزخ میں ہو رہا تھا، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فرعوانی کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! قیامت برپا نہ کرنا، کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالو، میں نے پوچھا کہ جبرائیل علیہ السلام یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھایا کرتے تھے، یہ لوگ اس طرح اٹھیں گے جس طرح آسیب زدہ انسان جنات کے جھپٹے کی وجہ سے اٹھتا ہے۔[رواہ البغوی]

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''شب

معراج کے موقع پر میں ایسے لوگوں کے پاس پہنچا جن کے پیٹ کوٹھڑی کی طرح تھے جس میں سانپ بھرے ہوئے تھے اور پیٹ کے باہر سے ہی سانپ نظر آ رہے تھے، میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ سودخور لوگ ہیں۔'' [رواہ احمد و ابن ماجہ]

(۳) ابو یعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت (مذکورہ بالا) کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن وہ لوگ (سودخور) اس علامت سے پہچانے جائیں گے کہ وہ اس طرح کھڑے ہوسکیں گے جس طرح آسیب زدہ آدمی لرزتا ہوا اٹھتا ہے۔

(۴) ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ سود کھانے والے لوگ دیوانوں کی حالت میں اٹھیں گے۔

(۵) حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے اور سود کھلانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ [صحیحین]

(۶) حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سود کا ایک درہم بھی دانستہ طور پر لیتا ہے اس کا گناہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔'' [رواہ احمد و الدار قطنی]

(۷) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں اتنا زائد منقول ہے کہ جس کا گوشت، حرام مال سے پلا بڑھا ہو جہنم کی آگ ہی اس کا زیادہ مناسب ہے۔ [سنن البیہقی]

(۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سُود ستر گناہوں کا مجموعہ ہے، جن میں سے سب سے چھوٹا گناہ ماں سے زنا کرنا ہے۔'' [رواہ البیہقی و ابن ماجہ]

(۹) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھواروں کو کھانے کے قابل ہونے سے پہلے خریدنے سے منع فرمایا اور فرمایا

کہ جب کسی بستی میں سود کھلم کھلا ہو جاتا ہے تو اس بستی والے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اتار لیتے ہیں۔'' [رواہ الحاکم وصححہ]

(۱۰) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس قوم میں سود کھلم کھلا شروع ہو جاتا ہے ان کی پکڑ قحط کی صورت میں ہوتی ہے اور جس قوم میں رشوت کھلم کھلا ہو جاتی ہے وہ دشمنوں کے خوف (کے عذاب) میں گرفتار کیے جاتے ہیں۔''

[رواہ احمد، تفسیر مظھری ج ۲، ص ۵۸، ۵۹، ۵۷]

☆☆☆

(۱۴)

﴿بری صحبت سے پرہیز کا حکم﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۔ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا﴾ [النسآء: ۱۴۰]

ترجمہ

''اللہ تعالیٰ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ جب تم کسی مجلس میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجلس میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں کرنے نہ لگیں (ورنہ) تم بھی اس وقت ان ہی کی طرح ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور سب منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ جب میں نے منع کر دیا ہے کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اس میں نہ بیٹھو، اگر تم ایسی مجالس میں شریک ہوتے رہو گے تو یاد رکھو کہ پھر میرے ہاں تم بھی ان کے شریک کار سمجھے جاؤ گے اور ان کے گناہ میں تم بھی ان ہی کے طرح ہو جاؤ گے جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں ہے کہ ''جس دستر خوان پر شراب نوشی ہو رہی ہو اس پر ایسے شخص کو نہیں بیٹھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور

قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔‘‘

اس آیت کریمہ میں جس ممانعت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سورۂ انعام کی یہ آیت ہے:

﴿ وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ﴾ [الانعام:٦٨]

یعنی ’’جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میری آیتوں پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں تو ان سے منہ موڑلو۔‘‘

حضرت مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت ہذا کا یہ حکم کہ ’’اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ‘‘ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ’’وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰکِنْ ذِکْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ‘‘ سے منسوخ ہو چکا ہے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ڈرتے ہیں ان پر حساب کا کوئی بوجھ نہیں ہے البتہ نصیحت ہے ہوسکتا ہے کہ وہ بچ جائیں۔‘‘

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ’’اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ منافقین یہاں دنیا میں ان کافروں کے کفر میں شریک ہیں، قیامت کے دن جہنم میں ہمیشہ رہنے اور وہاں کے سخت ترین عذاب کے برداشت کرنے میں بھی ان کے شریکِ حال ہوں گے وہاں کی قید و بند، طوق و زنجیر، گرم پانی کے کڑوے گھونٹ گلے سے اتارنے اور لہو کے پینے میں بھی ان کے ہمراہی ہوں گے اور دائمی عذاب کا مژدہ ان سب کو ایک ساتھ سنایا جائے گا۔

☆☆☆

(۱۴)

﴿حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ [آل عمران : ۵۹]

ترجمہ

’’بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ہو بہو آدم علیہ السلام کی طرح ہے جسے مٹی سے پیدا کر کے کہا کہ ہو جا پس وہ ہو گیا۔‘‘

شانِ نزول

مفسرین لکھتے ہیں کہ نصارائے نجران کا وفد آیا اور اس نے کہا کہ آپ (علیہ السلام) ہمارے صاحب کو برا بھلا کیوں کہتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں کیا کہتا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو عبد (بندہ) کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں، وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اللہ کا کلمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے کنواری مریم بتول علیہا السلام کی طرف القاء کیا، (یہ سن کر) وہ سیخ پا ہو گئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر باپ کے بھی کوئی انسان دیکھا ہے؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے ہیں تو اس کی مثال دکھائیے؟ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نجران کے دو راہب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر اسلام کی دعوت پیش کی۔ ایک کہنے لگا کہ ہم تو آپ سے پہلے کے مسلمان ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم جھوٹے ہو، تین

باتیں تمہارے دعویٰ اسلام سے مانع ہیں، تم صلیب کو پوجتے ہو، خنزیر کا گوشت کھاتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہو" انہوں نے پوچھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ حکم الٰہی آنے سے قبل کسی کام میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے، چنانچہ مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔[آیاتِ قرآنی کے شان نزول ص ۱۱۲]

تشریح

اس آیت کریمہ میں اللہ جل شانہ نے نجران کے نصاریٰ کے ایک استدلال اور شبہ کا جواب دیا ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا اور اس کے بیٹے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہوا کوئی قابل تعجب امر نہیں ہے، دیکھو! ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن وہ اپنی جنس کے ایک فرد سے تو پیدا ہوئے مگر آدم علیہ السلام تو غیر جنس سے پیدا ہوئے ہیں پس اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا الوہیت کی دلیل ہے تو آدم علیہ السلام تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے وہ پھر اس کے زیادہ لائق و مستحق ہیں کہ ان کو خدا کا مقام و رتبہ دیا جائے۔

نکتہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ روح الامین (جبریل علیہ السلام) کے نفخہ سے پیدا ہوئے اور روح الامین کی طرح ان کا لقب بھی روح اللہ قرار پایا تو اس سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ صورت و شکل کے اعتبار سے بشر اور انسان تھے لیکن حقیقت کے لحاظ ملائکہ کی جنس میں سے تھے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اٹھایا تا کہ اپنے ہم جنس ملائکہ میں زندگی گزاریں اور عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو بھی رفع آسمانی کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، وہ یہ ہے کہ مٹی کا پتلا بنا کر اس میں پھونکتے تو وہ بحکم الٰہی پرندہ بن کر اڑنے لگتا تھا۔اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ ایک دن عیسیٰ علیہ السلام بھی اس طرح اڑ کر آسمان کی طرف چلے جائیں گے، پھر چونکہ عیسیٰ علیہ السلام، آدم علیہ السلام کے مشابہ ہیں۔

اس لیے قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے جیسے آدم علیہ السلام آسمان سے زمین پر اترے تھے اور جس طرح آدم علیہ السلام کا آسمان سے نزول جسمانی تھا اس طرح عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی جسمانی ہوگا۔[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۱، ص ۴۹۶ تا ۴۹۷]

فائدہ

آیت بالا سے قیاس کا شرعی حجت ہونا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق پر قیاس کرتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ پس جو لوگ صرف قرآن وسنت اور اجماع امت کو شرعی احکام کی علت مانتے ہیں اور قیام کو دلیل شرعی نہیں مانتے اس آیت سے ان کے اس قول کی تغلیط معلوم ہوتی ہے۔[تفسیر مظہری ج ۲، ص ۱۷۲]

☆☆☆

(۱۵)

﴿شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات﴾

آیتِ کریمہ:

﴿قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۠ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ﴾ [الانعام: ۷۱]

ترجمہ

''آپ ﷺ فرمادیں کہ کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ اس شخص کی طرح جسے شیطان نے صحرا میں بھٹکا دیا ہے اور وہ حیران وسرگرداں پھر رہا ہے۔ دراں حالیکہ اس کے ساتھی اس کو پکار رہے ہوں کہ ادھر آؤ۔''

تشریح

ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ دین اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ ایسی چیز کو معبود بنالیا جائے جو کسی طرح کے بھی نفع ونقصان کی مالک نہ ہو، مضحکہ خیز تو یہ بت پرست لوگ ہیں جو ضلالت و جہالت کے اندھیروں میں حیران وسرگرداں پھر رہے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ آپ ان مشرکوں سے فرمادیں کہ کیا ہم اللہ کے سوا کسی ایسی چیز کو اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکے اور نہ نقصان، یعنی کیا ہم محض تمہارے کہنے سے بت پرستی کرنے لگیں جو محض عاجز ہیں اور کسی کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں کفر سے نکال کر سیدھے راستہ پر چلا دیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس سیدھے راستہ کو چھوڑ کر پھر اسی گمراہی کے راستہ کی طرف الٹے پاؤں پھر جائیں، لہٰذا تمہاری یہ توقع بالکل فضول اور بے کار ہے کہ ہم کفر اختیار کر لیں، ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اگر معاذ اللہ (بالفرض) ایسا ہو جائے کہ ہم توحید کی واضح اور سیدھی راہ چھوڑ کر شرک کی راہ پر گامزن ہو جائیں تو ہماری مثال اس شخص کی سی ہوگی جس کو جنات نے جنگل میں لے جا کر سراسیمہ اور حیران و پریشان کر دیا ہو اور وہ بھٹکتا پھرتا ہو جسے یہ خبر نہ ہو کہ کہاں جانا ہے۔ اس کے کچھ دوست جو کہ راہ راست پر ہوں اس کو سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے ان مشرکوں کی مثال بیان کی ہے جو توحید کو چھوڑ کر بت پرستی کرتے ہیں اور مسلمان ان کو راہ راست کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرک کی مثال اس مسافر کی سی ہے جس کو جنات نے جنگل میں سیدھے راستہ سے بہکا کر اس کے ہم سفر ساتھیوں سے جدا کر دیا ہے اور وہ چہار سو بھٹکتا پھرتا ہے اور اس کے ساتھی خیر خواہی کے جذبہ سے اس کو بلا رہے ہیں کہ ادھر آؤ، سیدھا راستہ اس طرف ہے، مگر وہ حیران و سرگرداں اور حواس باختہ ہے۔

عالم حیرانی میں ہے، کچھ نہیں سوجھتا کہ جائے کہاں! اور کس کی بات سنے! اب اگر اس صورت میں اس نے جنات کا کہا مانا تو سیدھا راستہ اسے کبھی نہ مل سکے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا اور اگر اس نے اپنے دوستوں کا کہنا مانا تو اس خوفناک اور خطرناک جنگل و بیاباں سے نجات پا جائے گا اور راہ راست پر آ جائے گا۔ اسی طرح سمجھو کہ توحید اور اسلام ایک سیدھی راہ ہے اور یہ راہ حضور نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کی رفاقت اور معیت میں ہی طے ہوسکتی ہے جو ان کی دعوت پر لبیک کہے گا اور ان کی آواز پر کان دھرے گا وہ منزل مقصود کو پہنچے گا اور جو جن و انس میں موجود شیاطین کی آواز پر چلے گا وہ ضلالت و گمراہی کے صحرا اور جہالت و حیرت کے بیابان میں حیران و سرگرداں اور بھٹکتا پھرتا رہے گا، بالآخر وہ ہلاک و برباد ہو جائے گا۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج ۲، ص ۴۷۹، ۴۸۰]

(۱۶)

﴿مسلمان اور کافر کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الانعام: ۱۲۲]

ترجمہ

''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو روشنی عطا کی جس کو لے کر وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو، کافروں کے لیے تو اس طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔''

شانِ نزول

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق حمزہ بن عبدالمطلب اور ابو جہل ہیں۔ قصہ یہ ہوا کہ ابو جہل نے رسول اکرم ﷺ پر (نعوذ باللہ) گوبر پھینکا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اپنا تیر کمان لے کر غصہ سے بھرے ہوئے ابو جہل کے پاس گئے اور اس سے پوچھ گچھ کرنے لگے تو ابو جہل نے کہا کہ اے ابو یعلی! کیا آپ کو پتہ نہیں کہ وہ کیا دین لے کر آیا ہے؟ اس شخص نے ہمیں بے وقوف بنا رکھا ہے، ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے اور آباؤ اجداد کی مخالفت کرتا ہے؟ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بھلا تم سے بڑا بے وقوف کون ہو گا؟ خدا کو چھوڑ کر پتھروں کو پوجتے ہو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا

کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت

''اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ'' کا مصداق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں اور ''كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا'' کا مصداق ابوجہل بن ہشام ہیں۔''

[تفسیر قرطبی ج۷، ص۷۸، آیات قرآنی کے شان نزول ص ۲۳۹ تا ۲۴۰]

تشریح

ان آیات میں اللہ تعالیٰ مسلمان اور کافر کی مثال بیان فرما رہے ہیں تاکہ دونوں میں فرق اور امتیاز ہو جائے اور سب کو معلوم ہو جائے کہ ان میں سے اتباع اور محبت کے لائق کون ہے اور نفرت کے لائق کون ہے۔

وہ مثال یہ ہے کہ جو شخص کفر کے بعد مسلمان ہو گیا تو وہ گویا کہ زندہ ہو گیا اور اس کو روشنی مل گئی، یقیناً ایسا شخص لائق اتباع اور قابل اطاعت ہے اور جو شخص اپنے کفر پر قائم رہا اور اندھیروں میں بھٹکا ہوا ہے اور حیران و سرگرداں اور انگشت بدنداں ہے، نجات کی کوئی راہ اس کو نظر نہیں آتی، بھلا ایسا شخص اتباع اور پیروی کے قابل کیسے ہو سکتا ہے۔

[تفسیر کبیر ج ۴، ص ۱۴۳]

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت کا مصداق بعض معیّن حضرات کو قرار دیا ہے لیکن امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ہر مومن اور کافر کو شامل ہے یعنی ہر مسلمان اور کافر کی مثال ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا وہ شخص جو پہلے اپنے کفر کی وجہ سے مردہ تھا پھر ہم نے ایمان و ہدایت سے نواز کر اسے زندہ کیا اور ہم نے اسے ہدایت کی ایسی روشنی سے نوازا جس کو وہ وقت اور ہر لمحہ لوگوں میں اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے کیا یہ اس شخص کی مانند اور برابر ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ گمراہی کے ایسے اندھیروں میں پڑا ہوا ہے کہ جن سے وہ کسی طرح بھی باہر نہیں نکل سکتا، ظاہر ہے کہ یہ

دونوں برابر نہیں ہو سکتے، بلکہ پہلا شخص دوسرے سے ہر اعتبار سے بہتر ہے۔ معلوم ہوا کہ مسلمان، کافر سے بہتر ہے کیونکہ پہلی مثال مسلمان کی ہے اور دوسری مثال کافر کی ہے۔ ایمان کو حیات اور روشنی سے تشبیہ دی ہے اور کفر کو موت اور اندھیرے سے تشبیہ دی ہے اور ظاہر ہے کہ حیات، موت سے اور نور، ظلمت سے بہتر ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اسی طرح کافروں کے لیے ان کے اعمال خوشنما اور آراستہ بنا دیئے گئے ہیں، یعنی جس طرح مسلمانوں کے دلوں میں ایمان اور اعمال صالحہ کا حسن اور اس کی خوبی بٹھا دی گئی ہے۔ اسی طرح کافروں کے دلوں میں کفر اور اعمال قبیحہ کا حسن اور اس کی خوبی ڈال دی گئی ہے۔ ہر شخص اپنے ہی طریقہ کو اچھا گمان کرتا ہے۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج۲، ص ۵۲۷]

نکات و لطائف

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مختلف جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت تو وہ تھی کہ جو اپنے فہم و فراست کی وجہ سے بعثت کی ابتداء ہی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئی تھی۔ اس جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور اس جماعت کے رئیس (سر دفتر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور آیت کریمہ: "فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ" میں ان ہی لوگوں کا بیان ہے جن کی فطرت میں توحید، ایمان، ترک اصنام، ترک زنا اور ترک شراب جیسے عمدہ اعمال ابتدائے خلقت میں ودیعت کیے گئے تھے اور اس کے بارے میں ان لوگوں نے بہت سے خواب بھی دیکھے تھے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت پر دلالت کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر محض دعوت دینے سے ایمان لے آئے اور انہیں دوبارہ دعوت اسلام دینے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ اور دوسری جماعت وہ تھی کہ جو ایک عرصہ تک کفر میں اور اسلام دشمنی میں قائم رہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی انکار کرتی رہی، ان ہی لوگوں کو اللہ جل شانہ نے مردوں سے تعبیر کیا ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی اور وہ اسلام کے شرف و اعزاز سے نوازے گئے اور پھر انہوں نے حقیقی حیات حاصل کی اور بہترین اور مخلص مسلمان قرار

پائے جیسے حضرت حمزہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما وغیرہ۔ اس جماعت کے رئیس (سردفتر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور آیت کریمہ: ''اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ الآیۃ'' میں اللہ تعالیٰ نے ان ہی لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور ''وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ'' میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ شخص ہادی ومہدی ہوگا اور مسلمانوں کو اس سے عظیم نفع حاصل ہوگا، اس جماعت میں، یہ صفت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات میں منحصر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیاتِ معنوی اور نورِ ہدایت کی صفت کے ساتھ موصوف فرمایا، ان آیات سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں حضراتِ شیخین کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ شرحِ صدر، صدیقیت کی حقیقت ہے اور نورِ ہدایت کا عطاء ہونا، محدَّثیت کی حقیقت ہے اور ان ہی کے طریقہ کو اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم فرمایا ہے۔ اور ''كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا'' میں ظلمات سے مراد کفر اور ضلالت کی ظلمتیں ہیں۔

حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق پہلی آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور دوسری آیت، ابوجہل کے بارے میں ہے، کیونکہ دونوں ابتداء میں کافر تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیاتِ حقیقی عطا فرمائی اور ابوجہل کو کفر وضلالت کی تاریکی میں رکھا۔ اس طرح ان آیات میں تعریض کے طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کا حال (تمثیل کے طور پر) بیان کیا گیا ہے۔

اور تیسری جماعت فقراء اور ضعفاء مسلمین کی تھی جن کو قریش کے سربرآوردہ لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے کو اپنے لیے باعث ننگ وعار سمجھتے تھے، ان ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ'' اور آیت کریمہ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ ...... '' میں اس قتالِ مسلمین کی طرف اشارہ ہے جو چونتیس سال بعد واقع ہونے والا تھا۔ [ازالۃ الخفاء]

☆☆☆

(۱۷)

﴿اللہ تعالیٰ ہی تمام عالم کا مدبر اور متصرف ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ○ وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ﴾ [الاعراف: ۵۷،۵۸]

ترجمہ

''اور وہی ہے کہ جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ زمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں بارش برسا کر طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے، اس طرح ہم مردوں کو نکالتے ہیں شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو، جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا، اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔''

تشریح

ان مبارک آیات میں اللہ تعالیٰ سفلیات، ارضیات اور کائنات الجو میں اپنی تدابیر اور تصرفات کا ذکر فرماتے ہیں کہ تمام علویات وسفلیات میں وہی ذات مدبر اور متصرف ہے سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، لہٰذا جو کچھ مانگنا ہو اس سے مانگنا چاہیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ وہ ہے جو اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے بھیجتا ہے، باران رحمت سے پہلے نرم نرم ہوائیں چلتی ہیں جو بارش کی آمد کی خوشخبری سناتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں پانی کے بوجھ سے لدے بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم اس بادل کو ایک مردہ اور خشک زمین کی طرف ہانک دیتے ہیں جو ایک عرصہ سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے بے جان پڑی تھی، پھر ہم اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر ہم اس پانی سے طرح طرح کے پھل زمین سے نکالتے ہیں، ہم یوں ہی مردوں کو قبروں سے نکالیں گے شاید تم اس مشاہدہ سے نصیحت حاصل کرو کہ جو ذات خشک اور بے جان زمین سے اس کو زندہ کر کے اس سے طرح طرح کے تازہ پھل نکالتی ہے وہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے جس طرح وہ ذات اپنی قدرت کاملہ سے مردہ زمین کو زندہ اور سرسبز و شاداب کر سکتی ہے اسی طرح وہ ذات تمہیں قیامت کے دن زمین سے دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے اس کے لیے مردہ زمین اور مردہ انسان کا زندہ کرنا برابر ہے اور ہمارا یہ کلام ہدایت اگرچہ باران رحمت کی طرح فیض رسانی میں یکساں ہے مگر جن قلوب کی زمینوں پر یہ بارش نازل ہوتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مختلف ہیں جس طرح ہر زمین اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق بارش کا اثر قبول کرتی ہے اسی طرح دل کی ہر زمین اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق باران رحمت و ہدایت کا اثر قبول کرتی ہے۔ عمدہ اور پاکیزہ زمین جب اس پر بارش برستی ہے تو اللہ کے حکم سے اس کا سبزہ خوب نکلتا ہے اور خراب زمین یعنی جو زمین شور اور بنجر ہوتی ہے اول تو اس زمین سے کچھ نہیں نکلتا اور اگر نکلتا ہے تو ناقص اور خراب کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ عمدہ اور پاکیزہ زمین سے مومن کا دل مراد ہے اور ناقص اور خراب زمین سے کافر کا دل مراد ہے اور قرآن

کریم باران رحمت اور آب حیات کے مثل ہے اور مومن کی زمین دل پر برسنے والی بارش اور پھر اس سے طرح طرح کے ثمرات و برکات کا ظہور اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے قرآن حکیم کے مواعظ و نصائح سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کافر کی زمین دل شور اور بنجر تھی اس نے باران رحمت کا کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ اس میں کفر اور الحاد کے کانٹے اور جھاڑ جھنکاڑ ہی نکلے۔

باراں کہ درلطافت طبعش خلاف نیست
درباغ لالہ روید ودرشورہ بوم خس

اس کے بعد فرمایا کہ ہم اسی طرح بار بار نشانیاں ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو شکر کرتے ہیں اور نعمت ہدایت کی قدر کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ مردہ اور خشک زمین کا زندہ کرنا اور ہر زمین سے الگ الگ نباتات کو اگانا اسی ذات کی کمال قدرت اور کمال حکمت کی دلیل ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج۳، ص ۶۳]

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس علم و ہدایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین پر بہت زیادہ بارش برسے، زمین کے ایک عمدہ حصے نے تو پانی قبول کیا، گھاس چارہ اور بہت سا سبزہ اس میں سے نکلا، ان میں سے بعض حصے ایسے بھی تھے جن میں پانی جمع ہو گیا اور وہاں رک گیا۔ پس اس سے بھی لوگ مستفید ہوئے، خود بھی پیا اور دوسروں کو بھی پلایا، کھیتی باڑی کی، باغات کو سیراب کیا، لیکن زمین کے جو چٹیل سنگلاخ حصے تھے ان پر بھی وہ پانی برسا لیکن وہ پانی نہ تو وہاں رکا اور نہ وہاں کچھ اگا۔ یہی مثال ہے اس کی جس نے دین حق میں سمجھ بوجھ پیدا کی اور میری بعثت سے فائدہ اٹھایا، خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا، اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ انہوں نے اس کی طرف سر تک نہ اٹھایا اور اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت ہی حاصل نہ کی جسے دے کر مجھے بھیجا گیا۔ [رواہ مسلم والنسائی][تفسیر ابن کثیر ج۲، ص ۱۷۳، ۱۷۴]

☆☆☆

(۱۸)

﴿دین حق سے انحراف اور دنیا پرستی کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ج فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ج اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ط ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ج فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ سَآءَ مَثَلَاِ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ﴾ [الاعراف: ۱۷۵،۱۷۶،۱۷۷]

ترجمہ

''اور ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کو چھوڑ نکلا، پھر شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا، اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، آپ یہ حکایات ان لوگوں کو سناتے رہو۔ شاید کہ وہ غور وفکر کریں، بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور آپ

اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔"

شانِ نزول

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی، بلعم بن باعورا کے متعلق نازل ہوئی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر مفسرین کرام کے نزدیک اس سے مراد بلعم بن باعورا ہے اور والبی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ شہر جبارین کا ایک آدمی تھا جس کا نام بلعم تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم جانتا تھا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کا لشکر لے کر پہنچے تو اس کی قوم کے لوگ اس کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے کہ موسیٰ (علیہ السلام) بڑے سخت آدمی ہیں اور ان کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے، اگر وہ ہم پر چڑھائی کریں گے تو ہم ہلاک ہو جائیں گے، اس لیے آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہ آنے والے لشکر کو واپس پلٹ دے۔ بلعم نے کہا کہ اگر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کردی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں کو واپس پلٹ دے تو میری دنیا و آخرت تباہ و برباد ہو جائے گی، لوگوں نے اصرار کیا تو بلعم بن باعورا نے دعا کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری بزرگی چھین لی، آیت مبارکہ میں "فَانْسَلَخَ مِنْهَا" کے یہی معنی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ، امیہ بن ابی الصلت الثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس نے کتابیں پڑھی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت ایک پیغمبرؐ بھیجنے والے ہیں اور اسے امید تھی کہ وہ خود پیغمبر ہوگا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (نبوت کا) انکار کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایک آدمی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے تین دعاؤں کی قبولیت کا وعدہ کیا تھا۔ ایک عورت تھی جس کا نام "بسوس" تھا جس کے بطن سے اس کا ایک لڑکا تھا جس سے اس کو بے حد محبت تھی، اس عورت نے کہا کہ ایک دعا میرے لیے خاص کردو، اس نے کہا کہ ٹھیک

ہے، ایک دعا تیرے لیے ہے، بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟ عورت نے کہا کہ خدا تعالیٰ دعا کرو کہ سارے بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت عورت میں بن جاؤں، چنانچہ اس نے دعا کی اور وہ سب سے زیادہ حسین وجمیل عورت بن گئی، جب اس عورت نے یہ محسوس کیا کہ اس جیسی حسین عورت اب کوئی نہیں ہے تو وہ اپنے شوہر سے بے رغبتی اختیار کرنے لگی اور اس کے ارادے بدل گئے تو اس (بلعم) نے دعا کی کہ وہ کتیا بن جائے جو بھونکتی پھرے، اس طرح اس کی دو دعائیں پوری ہوگئیں، پھر اس کے بچے آ کر کہنے لگے کہ ہم سے تو نہیں دیکھا جا رہا کہ ہماری ماں کی یہ حالت ہو اور لوگ بھی ہمیں اس پر عار دلا رہے ہیں، پس آپ دعا کریں کہ وہ اپنی سابقہ حالت میں واپس آ جائے، چنانچہ اس نے دعا کی تو وہ عورت جیسی پہلے تھی ویسی ہی ہوگئی، اب تینوں دعائیں صرف ہوگئیں، پھر وہ عورت (بسوس) نحوست میں ضرب المثل بن گئی، کہا جانے لگا کہ ''اشأم من البسوس'' یعنی فلاں شخص، بسوس سے زیادہ منحوس ہے۔ [آیات قرآنی کے شان نزول ص ۲۴۱ تا ۲۴۳]

تشریح

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ایسے دنیا پرست اور حرص وطمع میں گرفتار لوگوں کا حال وانجام اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ جو دین حق کو قبول کرنے کے بعد محض دنیاوی حرص وطمع کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے احکامات سے منحرف ہو جاتے ہیں اور نفس شیطان کے اشاروں پر چلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد و میثاق کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، ایسے لوگوں کا انجام بہت برا ہوتا ہے اس لیے وعظ و تذکیر کے لیے اس آیت میں ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے جیسا کہ شان نزول سے واضح ہوتا ہے اور اس سے مقصود بنی اسرائیل کو سنانا ہے کہ جب ایک عالم اور صاحب تصرف بزرگ ایک پیغمبر کی مخالفت سے مردود ہو گیا تو تم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ کرو ورنہ تمہارا حال بھی یہی ہوگا، بہر حال شان نزول جو بھی ہو اس واقعہ میں علماء کے لیے خاص طور پر تنبیہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ علم و ہدایت سے نوازے اسے چاہیے کہ خواہشات نفس کی ہرگز پیروی نہ کرے اور یہ آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ہر خواہش پرست عالم کو شامل ہے، ہر عالم کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے اور خدا سے پناہ

مانگنی چاہیے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے پیغمبرؐ! آپ ان لوگوں کو عبرت و نصیحت کے لیے اس شخص کا حال اور قصہ سنایئے جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا پس وہ ان آیات کے علم سے ایسا باہر نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی سے باہر نکل آتا ہے اور کینچلی سے اس کو کوئی تعلق نہیں رہتا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا کہ وہ اس کو چھوڑتا ہی نہیں، سو وہ آیتوں کا عالم ایسے گمراہوں میں سے ہو گیا جس کی ہدایت کی کوئی توقع نہیں رہی۔ مشہور قول کی بنا پر ان آیات میں بلعم بن باعورا کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کا ایک زبردست مستجاب الدعوات اور صاحب کرامات شخص تھا۔ اس نے بعض شر پسند لوگوں کو بہکانے سے رشوت لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی کرامات سلب ہو گئیں اور کتے کی طرح اس کی زبان باہر نکل آئی اور دنیا میں ذلیل و خوار اور آخرت میں عظیم عذاب کا مستحق ہوا۔ آگے فرماتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے سبب اس کو بلند مرتبہ عطا کرتے یعنی اگر وہ ان آیتوں پر عمل کرتا تو اس کا مقام اور رتبہ اتنا بلند ہوتا کہ شیطان کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکتی، لیکن وہ بلند کے بجائے پستی کی طرف یعنی دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور نفسانی خواہشات کا پیروکار بن گیا۔ اس لیے ہم نے اس کو توفیق و عنایت کے بلند مقام سے دناءت اور حقیر حالت کی طرف پھینک دیا، پس اس ذلت و حقارت میں اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے یا اس پر کوئی بوجھ وغیرہ ڈالے تو وہ اپنی زبان باہر نکال دیتا ہے یا تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے تو بھی زبان باہر نکالے رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کتا دونوں حالتوں میں یکساں ہے، کسی حالت میں اپنی عادت نہیں چھوڑتا، تمام حیوانات کا قاعدہ ہے کہ جب ان پر کوئی مشقت آتی ہے یا ان کو پیاس وغیرہ لگتی ہے تو اپنی زبان باہر نکال لیتے ہیں اور آرام و سکون کی حالت میں زبان نہیں نکالتے لیکن کتے کی حالت اس کے خلاف ہے کہ اس پر مشقت وغیرہ پڑے یا نہ پڑے وہ ہر حال میں اپنی زبان باہر لٹکائے رہتا ہے جو اس کی خساست و دناءت کی دلیل اور علامت ہے اور یہ اس کی طبعی خصوصیت ہے، کتے کا ہانپتے رہنا اس کی اندرونی حرص و طمع کی ظاہری نشانی ہے جو کسی وقت اس سے جدا نہیں ہوتی، پیاسا جانور تو صرف پیاس

کے وقت زبان لٹکا تا ہے لیکن کتا ہر وقت زبان کو لٹکائے رہتا ہے اور حرص وطمع کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی، یہی حال دنیا پرست عالم کا ہے کہ اس کی زبان حرص وطمع کی وجہ سے ہر وقت لٹکی رہتی ہے اور بدحواسی اور پریشانی سے ہر وقت ہانپتا رہتا ہے اور یہ اضطراب اور بے آرامی اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ آیت کریمہ دنیا پرست عالم کے لیے انتہائی درجہ کی عبرت آمیز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو نہایت خسیس اور حقیر جانور کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جو عالم، علم و ہدایت سے نکل کر دنیا پرستی کی طرف مائل ہوا وہ کتے کے مثل ہے جو خسیس ترین اور حریص ترین جانور ہے جسے نجاست اور مردار، حلوے سے زیادہ لذیذ ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہی حال اور مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں دیدہ دانستہ تکبر اور عناد کے طور پر ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یعنی یہ صرف علماء کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ یہ مثال تمام مکذبین اور معاندین کفار پر منطبق آتی ہے جو حق واضح ہو جانے کے بعد بھی کتے کی طرح حرص وطمع میں پڑے رہتے ہیں اور نفسانی خواہشات کے پیروکار بنے رہتے ہیں پس اے نبیؑ! ان کو یہ قصے سنا ہے! شاید کہ وہ کچھ غور وفکر کریں اور انجام بد سے ڈریں۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جان بوجھ کر ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور یہ لوگ تکذیب کر کے اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں یعنی ہمارا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا، دنیا پرستی کی بناء پر یہ لوگ دنیا میں کتوں کے مثل بنے اور آخرت میں بھی کتوں جیسا سلوک ہوگا۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج۳، ص ۱۶۵ تا ۱۶۷]

عبرت آموز واقعہ

امام سدّیؒ فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو وادی تیہ میں چالیس سال کا عرصہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو نبی بنا کر ان کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہیں لے کر جاؤں اور ان جبارین سے جہاد کروں، وہ تیار ہو گئے اور انہوں نے جہاد پر بیعت بھی کر لی، ان لوگوں میں ایک بلعم نامی شخص بھی تھا جو بڑا عالم تھا، اسم اعظم جانتا تھا وہ بدنصیب کافر و مرتد ہو کر قوم جبارین سے جا ملا اور

ان سے کہا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، جب بنی اسرائیل کا لشکر آ جائے گا تو میں ان کے خلاف بددعا کروں گا تو وہ یکلخت ہلاک ہو جائے گا، اس کے پاس تمام دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ تھی لیکن وہ عورتوں سے عظمت کی بناء پر نہیں ملتا تھا اور اس نے ایک گدھی بھی پال رکھی تھی۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے جب اس بلعم سے درخواست کی کہ آپ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کریں تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے میں اللہ تعالیٰ سے مناجات کرلوں، جب اس نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی تو اسے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل مسلمان ہیں اور ان میں اللہ کے نبی موجود ہیں۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے بددعا کرنے سے روک دیا گیا ہے، لوگوں نے بہت سارے تحفے تحائف جمع کر کے (بطور رشوت کے) اس کو دیئے جو اس نے سب کے سب رکھ لیے، پھر دوبارہ درخواست کی کہ ہمیں ان سے بہت خوف اور خطرہ ہے، آپ ان کے خلاف ضرور بددعا کردیں، بلعم نے جواب دیا کہ جب تک میں اللہ تعالیٰ سے حکم (اجازت) نہ لے لوں میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ چنانچہ اس نے دوباہ مناجات کی تو اسے کچھ معلوم نہ ہوا۔ اس نے لوگوں کو بھی یہی جواب دیا، تو لوگ کہنے لگے کہ دیکھو! اگر آپ کو منع کرنا مقصود ہوتا تو آپ کو روک دیا جاتا، جیسا کہ اس سے پہلے روکا گیا تھا، اس کی سمجھ میں بات آ گئی، چنانچہ وہ اٹھا اور اس نے بددعا کرنی شروع کردی، اللہ کی شان! ان کے خلاف بددعا کرنے کی بجائے الٹا اپنی ہی قوم کے لیے بددعا زبان سے نکلی اور جب وہ اپنی قوم کی فتح کے لیے دعا کرنا چاہتا تو بنی اسرائیل کی فتح و نصرت کی دعا زبان سے نکلتی، (یہ دیکھ کر) قوم نے کہا کہ آپ ہم پر کیا غضب ڈھا رہے ہیں؟ بلعم نے کہا کہ میں کیا کروں؟ میری زبان میرے اختیار اور قابو میں نہیں ہے یاد رکھو! اگر میری زبان سے واقعی ان کے لیے بددعا نکلی بھی تو قبول نہ ہوگی، سنو! اب میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں، اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لو کہ بنی اسرائیل ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ تم لوگ اپنی جوان لڑکیوں کو بناؤ سنگھار کرا کے ان کے لشکر میں بھیج دو اور انہیں ہدایت دو کہ وہ (لوگ) ان کی طرف اگر مائل ہوں تو وہ انکار نہ کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ مسافرت کی وجہ سے زنا کاری میں مبتلا ہو جائیں، اگر ایسا ہو گیا تو چونکہ حرام کاری، اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، اس لیے فوری طور پر ان پر عذاب

نازل ہو جائے گا اور وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ لوگوں نے بلعم کی ترکیب کو مان لیا اور اسی طرح کیا، بلکہ بادشاہ کی بڑی حسین وجمیل لڑکی بھی خوب بن ٹھن کر نکلی، اس کو کہا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی کو اپنا نفس نہ سونپے، یہ عورتیں بن سنور کر جب بنی اسرائیل کے لشکر میں پہنچیں تو عام لوگ اپنے آپ پر قابو نہ پاسکے اور حرام فعل میں مبتلا ہو گئے۔ شہزادی، بنی اسرائیل کے ایک سردار کے پاس پہنچی، سردار نے اس پر ڈورے ڈالے لیکن اس لڑکی نے انکار کیا، اس نے بتایا کہ میں فلاں ہوں، اس نے اپنے باپ یا بلعم سے معلوم کروایا اور اس کی اجازت لی تو اس نے اجازت دے دی، وہ حرام کاری میں مبتلا تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی آدمی نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے نیزے سے دونوں کو پرو دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنا طاقتور بنایا کہ اس نے اسی طرح ان دونوں کو چھدے ہوئے اٹھالیا، تمام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اب اس لشکر پر خدا کا عذاب، طاعون کی شکل میں آیا اور اسی وقت ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، بلعم اسے مارتا لیکن وہ قدم نہ اٹھاتی، آخر کار گدھی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟ سامنے دیکھو کون ہے؟ بلعم نے دیکھا تو شیطان لعین کھڑا تھا، بلعم نیچے اترا اور سجدے میں گر پڑا اور یوں ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کا نام بلعام یا بلعم بن باعورا یا بن ابر بار بن باعور بن شہوم بن قوشتم بن ماب بن لوط بن ہارون یا بن مران بن آزر تھا۔ یہ بلقاء کا رئیس تھا اور اسم اعظم جانتا تھا لیکن آخر عمر میں دین حق سے منحرف ہو گیا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ قوم کے زیادہ کہنے سننے سے جب وہ اپنی گدھی پر سوار ہو کر بد دعا کے لیے چلا تو اس کی گدھی بیٹھ گئی۔ اس نے مار پیٹ کر اسے اٹھایا، کچھ دور چلی تھی کہ پھر بیٹھ گئی۔ اس نے پھر مار پیٹ کر اس کو اٹھایا، اللہ نے اسے زبان دی۔ اس نے کہا کہ تیرا ستیاناس ہو! تو کہاں اور کیوں جا رہا ہے، کیا تو اللہ کے رسول کے مقابلے میں لڑنے جا رہا ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے جا رہا ہے؟ دیکھو تو فرشتے میرا راستہ روک رہے ہیں، بلعم نے پھر بھی کوئی توجہ نہ دی، وہ اور آگے بڑھا، حبان نامی پہاڑ پر چڑھ گیا، جہاں سے بنی اسرائیل کا لشکر سامنے سے نظر آ رہا تھا، اب ان کے لیے بد دعا اور اپنی قوم کے لیے دعا کرنے لگا لیکن اس کی زبان الٹ گئی، دعا کی بجائے بد دعا اور بد دعا کی بجائے

دعا نکلنے لگی، قوم نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں عاجز اور بے بس ہوں، پھر اسی وقت اس کی زبان سینہ پر لٹکنے لگی، اس نے کہا کہ لو میری دنیا بھی برباد ہوگئی اور دین تو بالکل برباد ہوگیا، پھر اس نے حسین لڑکیوں کی تدبیر بتائی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور اس نے کہا کہ اگر ان میں سے ایک نے بھی بدکاری کر لی تو ان پر خدا کا نام کستی تھا جو صور نامی ایک سردار کی بیٹی تھی وہ جب بنی اسرائیل کے سردار زمری بن شلوم کے پاس سے (بن سنور کر) گزری، جو شمعون بن یعقوب کی اولاد میں سے تھا تو وہ اس پر فریفتہ ہوگیا، بڑی دلیری کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے موسیٰ علیہ السلام کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ کو شاید یہی کہیں گے کہ یہ مجھ پر حرام ہے! موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یقیناً میں یہی کہوں گا، اس نے کہا کہ میں تو آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا، پھر اسے اپنے خیمہ میں لے گیا اور اس کے ساتھ بدکاری کرنے لگا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے طاعون کی شکل میں عذاب بھیجا۔

حضرت طحاص بن غیرار بن ہارون اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے جب آئے اور انہوں نے ساری حقیقت ملاحظہ کی تو غصے سے بیتاب ہو کر اس سردار بدکردار کے پاس اس کے خیمہ میں پہنچے اور اپنے نیزے میں ان دونوں کو پرو دیا اور اپنے ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے انہیں اوپر اٹھائے باہر آئے، پھر کہنے لگے کہ اے اللہ! ہمیں معاف فرما دے ہم سے یہ وبا (طاعون) دور فرما دے، دیکھ لے ہم تیرے نافرمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں، ان کی دعا کی برکت اور انتقامی عمل سے طاعون کی وبا دور ہوگئی، لیکن اتنے عرصہ میں جب حساب کیا گیا تو ستر ہزار آدمی اور ایک روایت کے مطابق بیس ہزار ہلاک ہوچکے تھے ان آیات میں اسی بلعم بن باعورا کا ذکر ہے کہ بلعم کی زبان نیچے کو لٹک گئی تھی، کتے کی طرح ہانپتا رہتا تھا اور زبان باہر لٹکائے رہتا تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کو پند و نصیحت کرتے رہیں، ممکن ہے کہ وہ غور و فکر کر کے راہ راست پر آجائیں اور یہ سوچیں کہ بلعم ملعون کا حال وانجام کیا ہوا؟ جو دین و دنیا دونوں سے تہی دامن ہوگیا۔

[تفسیر ابن کثیر ملخصا، ج ۲، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸]

(۱۹)

﴿مسجد ضرار اور مسجد تقویٰ کا ذکر﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۰۹]

ترجمہ

''کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے خوف پر رکھی ۔بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گر پڑنے والی کھائی کے کنارے پر رکھی جو اسے جہنم کی آگ میں لے گری، اللہ تعالیٰ ناانصافی کرنے والوں کی رہبری نہیں فرماتے۔''

تشریح

سابقہ آیات میں منافقین کی ایک خاص خباثت کا ذکر ہوا تھا کہ انہوں نے مسجد قبا کے مقابلہ میں از راہ عناد و بغض ایک مسجد بنائی ،جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسجد کے نام سے ان کا ایک اڈا قائم ہو جائے جس میں بیٹھ کر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف مشورے اور منصوبے بنایا کریں گے، اس کا واقعہ یہ ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ جب ہجرت فرما کر آئے تو پہلے مدینہ منورہ سے باہر قباء میں فروکش ہوئے ، چند روز وہاں قیام کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں مسجد نبویؐ تعمیر فرمائی، اہل قباء نے بھی مسجد قباء کے نام سے ایک مسجد تعمیر کی، حضور اکرم ﷺ اکثر و بیشتر ہفتہ کے دن وہاں جایا کرتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے۔ منافقین نے ارادہ کیا کہ ہم بھی قباء والوں کی ضد اور

عناد میں ایک مسجد بناتے ہیں اوراس میں جمع ہو کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا کریں گے اور بعض سادہ لوح مسلمان بھی اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آجایا کریں گے۔اس طرح کچھ مسلمان ادھر سے کٹ کر ہمارے ساتھ آملیں گے۔اس ناپاک منصوبہ کا اصل محرک اور سرکردہ لیڈر ابو عامر راہب خزرجی تھا، جو ہجرت سے قبل نصرانی ہوگیا تھا اور اس نے راہبانہ زندگی گزارنا شروع کردی تھی، مدینہ کے اردگرد کے لوگ اس کی بزرگی اور درویشی کے معتقد ہوگئے تھے اوراس کا بڑا احترام واکرام کرتے تھے اوراس کو اپنا سردا کہنے لگے تھے۔آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آفتاب رسالت کے سامنے اس کی سرداری کا چراغ بالکل گل ہوگیا، اس لیے اس کو اپنی ریاست کے زوال کی بناء پر آنحضور ﷺ سے عداوت، بغض اور حسد پیدا ہوگیا۔غزوہ بدر میں جب اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا تو یہی ابو عامر راہب تھا جس نے اہل قریش کو اکسایا تھا اور احد میں آنحضور ﷺ کے مقابلہ میں ان کو لایا تھا بلکہ خود بھی ان کے ساتھ آیا، اس کے بعد بھی مسلسل سازشیں کرتا رہا، مسلمانوں کے مقابلہ میں جو جماعت بھی اُٹھی ابو عامر راہب نے اس کا ساتھ دیا اس نے یہ عہد کررکھا تھا کہ جو قوم بھی محمد (ﷺ) کے ساتھ لڑے گی میں بھی اس کے ہمرکاب ہو کر لڑوں گا۔

بالآخر غزوہ حنین میں جب ہوازن شکست سے دوچار ہوئے تو ابو عامر راہب ملک شام بھاگ گیا اور وہاں سے مدینہ کے منافقوں کو یہ پیغام کہ جس قدر ممکن ہو محمد (ﷺ) کے مقابلہ کے لیے اسلحہ وہتھیار جمع کرو اور میرے لیے ایک مسجد تعمیر کرو، میں عنقریب قیصر روم کے پاس جاؤں گا اور اسے بھی مسلمانوں کے خلاف مقابلہ کے لیے آمادہ کروں گا اور پھر وہاں سے ایک لشکر جرار لے کر آؤں گا اور محمد (ﷺ) اور ان ساتھیوں کو مدینہ سے باہر نکال دوں گا۔اس کی ہدایت پر منافقوں نے مسجد قباء کے مقابلہ میں ایک مسجد بنائی تاکہ مسجد قباء کے نمازی ٹوٹ کر اس میں آنا شروع ہوجائیں اور اس مسجد میں جمع ہو کر مشورے اور منصوبے تیار کریں چنانچہ ان لوگوں نے ایک مسجد بنائی اور ابو عامر راہب کا انتظار کرنے لگے کہ وہ آئے اور اس مسجد میں ٹھہرے جس وقت یہ مسجد بنائی

گئی اس وقت حضور اقدس ﷺ غزوہ تبوک کے لیے روانہ ہونے کا عزم فرما چکے تھے۔ منافقوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! ہم نے لوگوں کی سہولت اور آرام کی غرض سے یہ مسجد بنائی ہے تا کہ نمازیوں اور خاص طور پر بیماروں اور کمزور ناتواں لوگوں کو سہولت رہے، اس لیے ہماری درخواست ہے کہ آنحضور ﷺ ایک بار وہاں جا کر نماز ادا فرمالیں۔ ہمارے لیے آپ ﷺ کا تشریف لانا باعث برکت وسعادت ہوگا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ پابرکاب تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب تو میں جا رہا ہوں، واپسی پر ان شاء اللہ ایسا ہو سکے گا۔ چنانچہ آپ ﷺ غزوہ تبوک سے واپسی پر مدینہ کے قریب پہنچے تھے کہ جبریل علیہ السلام مذکورہ آیات لے کر نازل ہوئے اور آپ ﷺ کو منافقین کے ناپاک عزائم سے آگاہ کر دیا گیا، آپ ﷺ کو وہاں نماز پڑھنے بلکہ کھڑے ہونے کی بھی ممانعت کر دی گئی اور بتا دیا گیا کہ اس مسجد کی اصل غرض مسلمانوں کو ضرر پہنچانا ہے اسی وجہ سے وہ مسجد، مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہوئی، اور بتا دیا کہ مسجد قباء ہی مسجد تقویٰ ہے جو اس لائق ہے کہ آپ ﷺ اس میں جا کر کھڑے ہوں۔ آپ ﷺ نے اسی وقت مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ اس مکان کو جس کا نام دھوکہ وفریب سے مسجد رکھا گیا ہے، جا کر جلا دو اور پیوند خاک کر دو، حکم کی تعمیل ہوئی اور اس عمارت کو گرا کر پیوند خاک کر دیا گیا۔ پس جب دونوں مسجدوں کا حال معلوم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ درج بالا آیت کریمہ میں فرماتے ہیں کہ کیا جس شخص اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی ہو وہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسی کھائی کہ کنارے پر رکھی ہو جو گرنے والی ہو، پھر وہ اس کو لے کر آتش دوزخ کے گڑھے میں جا گرے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں عمارتیں برابر نہیں ہیں، کیونکہ مسجد تقویٰ کی بنیاد تقویٰ اور اخلاص نیت پر ہے اور مسجد ضرار کی بنیاد نفاق اور ضرر پر ہے اور ایسی عمارت ناپائیداری اور برے انجام کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے کوئی عمارت پانی کی کمزور کھائی کے کنارے پر بنائی جائے کہ جب پانی کے ذرا تھپیڑے لگے تو ساری عمارت یکدم سے آ گرے اور اس کے رہنے والے سب کے سب ہلاک وتباہ ہو جائیں، اسی

طرح مسجد ضرار کی بنیاد جہنم کے کنارے پر ہے، وہ ان کو اپنے ساتھ لے کر آتش دوزخ میں جا گرے گی۔

آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ نہیں بتاتے، یعنی ایسی راہ نہیں بتاتا جس سے وہ منزل مقصود تک پہنچ جائیں یا کم از کم گرنے سے محفوظ ہو جائیں۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلوی ملخصاً ج ۳، ص ۴۰۷ تا ۴۰۹]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد ضرار سے دھواں نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے اس مسجد کو توڑا اور اس کی بنیادیں اکھیڑ پھینکیں۔ انہوں نے اس کے نیچے اس دوران دھواں نکلتے پایا۔

خلف بن یامعین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے منافقوں کی اس مسجد ضرار کو جس کا ذکر ان آیات میں ہے، دیکھا ہے کہ اس کے ایک پتھر سے دھواں نکل رہا تھا، اب وہ کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔[تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۹۹]

الغرض جس مسجد کا اس آیت میں ذکر ہے وہ مسجد قباء ہے بہت سے سلف صالحین نے اس کی تصریح کی ہے لیکن ایک حدیث صحیح میں یہ بھی ہے کہ تقویٰ کی بنیاد پر بننے والی مسجد، مسجد نبویؐ ہے، جو مدینہ منورہ کے درمیان واقع ہے، ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ جب مسجد قباء روز اول سے تقویٰ کی بنیاد پر ہے تو مسجد نبیؐ اس وصف کی اس سے بھی زیادہ مستحق اور لائق ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ جو مسجد اللہ کے خوف پر بنائی گئی وہ یہ میری مسجد ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ دو آدمیوں کا اس بارے میں اختلاف ہوا کہ اس آیت میں کون سی مسجد مراد ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ میری یہ مسجد ہے، ان دونوں میں سے ایک کا کہنا یہ تھا کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے اور دوسرے کا کہنا تھا کہ اس سے مراد مسجد نبوی ہے۔ [ترمذی، نسائی] ان دو آدمیوں میں سے ایک کا تعلق بنو خدرہ (قبیلہ) سے تھا اور دوسرے کا تعلق بنو عمر بن عوف سے تھا، خدری کا دعویٰ یہ

تھا کہ وہ مسجد نبویؐ ہے اور عمری کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ مسجد قباء ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گھر جا کر دریافت کیا کہ وہ مسجد کہاں ہے جس کی بنیادیں شروع دن سے ہی تقویٰ پر ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند کنکر اٹھا کر انہیں زمین پر پھینک کر فرمایا کہ وہ تمہاری یہی مسجد ہے۔ [صحیح مسلم]

اسلاف واخلاف کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اس سے دونوں مسجدیں مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالی سے یہ ثابت ہوا کہ جن مساجد کی اوّل دن سے ہی بنیاد اللہ تعالیٰ کے خوف اور تقویٰ پر رکھی گئی ہو وہاں نماز پڑھنا مستحب ہے اور جہاں اللہ کے نیک بندوں کی جماعت موجود ہو جو دین کے حامل ہوں، وضو اور طہارت اچھی طرح کرتے ہوں کامل طہارت کے ساتھ رہتے ہوں، نجاستوں سے دور رہتے ہوں۔ ان کے ہمراہ نماز پڑھنا مستحب ہے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ روم کی تلاوت فرمائی، نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ سہو سا ہو گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کی قرأت میں خلط ملط ہونے کا باعث تم میں سے وہ لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ نماز میں شامل ہوتے ہیں لیکن وہ وضو اچھی طرح نہیں کرتے۔ ان کو چاہیے کہ وضو اچھی طرح کیا کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامل طہارت، عبادات کے بجالانے اور انہیں کامل اور شرعی حیثیت سے ادا کرنے میں سہولت اور آسانی پیدا کرتی ہے۔

ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پانی سے استنجاء کرنا بلاشبہ طہارت ہے لیکن اعلیٰ طہارت گناہوں سے بچنا ہے۔ حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گناہوں سے توبہ کرنا اور شرک سے بچنا کامل طہارت و پاکیزگی ہے۔ جب اہل قباء سے ان کی اعلیٰ طہارت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا تو انہوں نے جواب میں پانی سے استنجاء کرنے کا ذکر کیا۔

(۲۰)

﴿فانی اور ناپائیدار دُنیا کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ط حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَا لا اَتٰـهَا اَمْرُنَا لَیْلاً اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰـهَا حَصِیْدًا کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ط کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ [یونس: ۲۴]

ترجمہ

''دنیا کی زندگی کی مثال تو بالکل بارش جیسی ہے جسے ہم آسمان سے برساتے ہیں، پھر اس سے زمین کا سبزہ اور روئید گی مل جل کر وہ چیزیں اُگتی ہیں جو انسان بھی کھاتے ہیں اور چوپائے بھی، یہاں تک کہ جب زمین سرسبز ہو کر آراستہ پیراستہ ہوگئی اور وہاں کے رہنے والوں نے اندازہ لگا لیا کہ اب ہم اس سے نفع پانے پر قادر ہوگئے کہ اچانک اس پر حکم الٰہی رات کو یا دن کو آ پہنچا اور ہم نے اسے جڑ سے اکھیڑ پھینکا اس طرح کہ گویا کل کچھ بھی نہ تھا، ہم اس طرح غور و فکر کرنے والوں کے لیے کھول کھول کر اپنی نشانیاں بیان فرماتے ہیں۔''

تشریح

گزشتہ آیات میں لوگوں کی سرکشی کا بیان تھا جس کا سبب دنیا کی زیبائش اور عیش وعشرت تھا، جس کی وجہ سے لوگ دنیا کی زندگی کے نشہ میں سرشار ہیں۔ اب اس آیت کریمہ میں دنیا کے زوال، فناء اور ناپائیداری کی ایک عمدہ مثال بیان فرماتے ہیں، جس میں غور کرنے سے دنیا کی حقیقت اور اس کی بے ثباتی دل پر منقش ہو جاتی ہے اور سرکشی کا جو اصل سبب تھا یعنی دنیا کی زیبائش اور عیش وعشرت اس کی حقیقت کھل جانے سے مزاج اعتدال پر آ جائے گا۔ اس آیت کریمہ میں دنیا کی فانی اور ناپائیدار زندگی کو پانی اور مٹی کے ساتھ تشبیہ دی کہ جس طرح پانی (بارش) زمین پر برستا ہے اور اس سے کھیتی پیدا ہوتی ہے اور کسان اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ کھیتی تیار ہوگئی اور اب ہم اس سے نفع اٹھائیں گے کہ پھر اچانک اس پر کوئی آسمانی آفت آ جاتی ہے تو کہیں اولے برستے ہیں، کہیں آگ لگتی ہے اور وہ کھیتی نیست ونابود ہو جاتی ہے اور کسان کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے اور وہ کفِ افسوس ہی ملتا رہ جاتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے کہ نطفہ، پانی کی طرح ہے اور رحم مادر، زمین کے مثل ہے۔ نطفہ جب رحم میں جاتا ہے تو اس سے انسان پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے اور طرح طرح کی خواہش اپنے دل میں رکھتا ہے کہ پھر اچانک موت کا پیغام آ جاتا ہے اور سب حسرتیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اصل مقصود یہ ہے کہ آخر تم اس فانی، ناپائیدار دنیا کی خاطر اس جاودانی زندگی کو کیوں ترک کر دیتے ہو اور میرے بھیجے ہوئے پیغمبر کی اتباع کیوں نہیں کرتے تاکہ تمہیں ہمیشہ کی عیش وعشرت حاصل ہو اور حسرتوں سے محفوظ ہوسکو۔ نیز اس مثال میں حشر ونشر کے منکرین کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیاوی زندگی کی مثال فنا وزوال اور ناپائیداری میں ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی (بارش) اتارا، پھر اس پانی کی وجہ سے مختلف قسم کا گنجان سبزہ اُگا جس میں سے بعض کو انسان کھاتے ہیں اور بعض کو چوپائے کھاتے ہیں، یعنی ہر قسم کی پیداوار خوب ہوگئی اور خوب خوشنما تیار ہوگئی۔ یہاں تک کہ زمین نے اپنا بناؤ سنگھار کو حاصل کرلیا اور خوب آراستہ اور پررونق ہوگئی، اور دیکھنے والوں کو خوشنما معلوم ہونے لگی اور

اس کے مالکوں نے جان لیا کہ ہم اس کھیتی کے کاٹنے اور سمیٹنے پر پوری طرح قادر ہیں تو اس وقت اچانک اس کھیتی کی ہلاکت و بربادی کے متعلق رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ پہنچا یعنی اس پر اولا اور پالا یا آندھی وغیرہ آ پہنچی، پس ہم نے اس کھیتی کو جڑ سے کٹا ہوا ڈھیر کر دیا، گویا کہ کل تھی ہی نہیں، یعنی اس کھیتی کو ایسا ملیامیٹ کر دیا کہ گویا اس زمین پر ان چیزوں کا وجود بھی نہ تھا، اسی طرح سمجھو کہ دنیا کی زندگی بھی اسی طرح اچانک ختم ہو جائے گی اور تم دیکھتے اور ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ ہم اس طرح غور وفکر کرنے والوں کے لیے اپنی نشانیاں مفصل طور پر بیان کرتے ہیں تا کہ سمجھیں کہ اس فانی زندگی کے چند روز عیش وعشرت سے دھوکہ کھانا ایسی حماقت ہے جیسے کوئی کسان کھیتی کے سرسبز وشاداب ہونے پر دھوکہ کھاتا ہے کہ اچانک اس پر بجلی یا سرد ہوا یا آندھی آئی اور یکدم ساری ہری بھری اور تر و تازہ کھیتی ایسی تباہ ہوگئی کہ گویا اس سے پہلے کبھی بھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔ لہٰذا اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ فانی دنیا بھی آفات کا محل ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا محض حماقت ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مثال کو نہایت لطیف انداز میں خاص طور پر حیات انسانی پر منطبق کیا ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''پانی کی طرح روح، آسمان سے آئی اور اس جسم خاکی میں مل کر اس نے قوت پکڑی، دونوں کے ملنے سے آدمی بنا، پھر کام کیے انسانی اور حیوانی دونوں طرح کے جب ہنر میں پورا ہوا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسہ ہوگیا تو ناگہاں موت آ پہنچی جس نے ایک دم میں سارا بنا بنایا کھیل ختم کر دیا، پھر ایسا نام ونشان ہوا کہ گویا زمین پر آباد ہی نہ ہوا تھا۔''

[معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج ۳، ص ۴۶۰ تا ۴۶۲]

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو جو دنیا میں بڑی عیش وعشرت اور نعمت وناز میں پلا ہوگا، لایا جائے گا اور جہنم میں ایک غوطہ دے کر اس سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ! تمہاری زندگی کیسی گزری؟ وہ جواب دے گا کہ میں نے تو کبھی کوئی راحت دیکھی ہی نہیں، کبھی آرام کا نام بھی نہیں سنا۔ اسی طرح وہ شخص جس کی زندگی میں ایک گھڑی بھی آرام اور راحت سے نہیں گزری ہوگی۔ اسے بھی لایا جائے گا اور جنت میں ایک غوطہ کھلا کر

پوچھا جائے گا کہ بتاؤ دنیا کی زندگی کیسی گزری؟ وہ جواب دے گا کہ پوری زندگی کبھی رنج وغم کا نام بھی نہیں سنا کبھی دکھ اور تکلیف دیکھی بھی نہیں۔'' اللہ تعالیٰ اسی طرح عقلمندوں کے لیے واقعات بیان کرتا ہے تاکہ وہ عبرت حاصل کریں، ایسا نہ ہو کہ اس ناپائیدار، فانی دنیا کی ظاہری زیبائش و آرائش میں پھنس کر اس ڈھلنے والے سایہ کو اصلی اور پائیدار سمجھ بیٹھیں، دنیا کی رونق تو چند روزہ ہے، یہ وہ چیز ہے جو اپنے چاہنے والوں سے دور بھاگتی ہے اور نفرت کرنے والوں سے لپٹتی ہے۔

(۲۱)

﴿مومن اور کافر کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ [ھود: ۲۴]

ترجمہ

''ان دونوں فریقوں کی مثال اندھے بہرے اور بینے اور شنوے جیسی ہے کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟ کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ کافر بدبخت لوگ اور مومن متقی اور خوش نصیب لوگ وہی نسبت رکھتے ہیں جو اندھے بہرے اور بینے اور شنوے میں ہے، کافر دنیا میں حق کو دیکھنے میں اندھے تھے اور آخرت میں بھی بھلائی کی راہ نہیں پائیں گے اور نہ اسے دیکھیں گے، وہ دین حق کے دلائل سننے سے بہرے تھے، نفع رسانی والی بات سنتے ہی نہ تھے، اگر ان میں کوئی بھلائی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور سناتا، اس کے مقابلہ میں مومن سمجھدار، عقلمند، عالم، دیکھنے، سننے والا، سوچنے سمجھنے والا، حق و باطل میں تمیز کرنے والا، بھلائی کو اختیار کرنے والا اور برائی سے اجتناب کرنے والا اور دلیل وشبہ میں امتیاز کرنے والا ہوتا ہے، اب بتلایئے کہ یہ دونوں کیسے برابر ہوسکتے ہیں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لَا يَسْتَوِىْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ الخ یعنی جہنمی اور جنتی برابر نہیں ہوتے کیونکہ جنتی تو کامیاب ہیں۔ ایک آیت کریمہ میں ہے ''کہ نابینا اور بینا برابر نہیں، اندھیرا اور اجالا برابر

نہیں، سایہ اور دھوپ برابر نہیں، زندہ اور مردہ برابر نہیں، اللہ تعالیٰ تو جسے چاہتا ہے سنا سکتا ہے آپ قبر والوں کو نہیں سنا سکتے، آپ تو صرف انہیں آگاہ کرنے والے ہیں، ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، ہر امت میں ڈرانے والا گزرا ہے۔" [تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۴۷۳]

اس کے بعد فرمایا کہ کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے، یعنی تم دل کے بینا بن جاؤ تاکہ آخرت کی تجارت میں حصہ لے سکو اور اگر خود بینا نہیں ہو تو کسی بینا کی سنو اور اس کے کہنے پر چلو۔ اصل بینا وہ ہے کہ جو حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھے اور حق کی اتباع و پیروی اور باطل سے اجتناب اور پرہیز کرے اور جو حق کو نہ دیکھتا ہو اور نہ سنتا ہو وہ نابینا اور بہرا ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۳، ص ۵۳۷]

☆☆☆

(۲۲)

﴿مشرکوں اور ان کے معبودوں کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْهِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ﴾ [الرعد:۱۴]

ترجمہ

''اللہ تعالیٰ سچی پکار کے لائق ہے اور جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں وہ ان کی پکار کا کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے۔ مگر جیسے کہ کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ اس کے منہ تک پانی پہنچ جائے تو وہ پانی اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں، ان کافروں کی تمام پکار بے کار اور بے سود ہے۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیوں کو بطور نتیجہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سچی دعا اور پکار خدائے برحق ہی کے لیے سزاوار ہے، یعنی اللہ سے دعا مانگنا، اس کو یاد کرنا اور اس کی طرف ہر لحہ رجوع کرنا صحیح اور درست ہے، کیونکہ وہی دعاؤں کو سنتا ہے اور تمام حاجتیں اور مشکلات حل کرتا ہے اور جو لوگ اس کے سوا اور معبودوں کو پکارتے ہیں وہ معبود ان کو ان کی پکار کا کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے، ان کا پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے تا کہ وہ پانی آپ سے آپ اس کے منہ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں ہے، کیونکہ پانی، جماد، بے حس اور بے شعور

چیز ہے نہ اسے ہاتھ پھیلانے والے کی خبر ہے، نہ اس کی پیاس کی خبر اور نہ اس میں یہ قدرت اور طاقت ہے کہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دے سکے، بعینہ یہی مثال ان مشرکوں اور ان کے معبودوں کی ہے کہ ان کے معبود نہ ان کی دعا کو سنتے ہیں اور نہ ان کو جواب دے سکتے ہیں، حاصل یہ کہ مشرکوں کا بتوں کو پوجنا اور پکارنا محض بے سود اور بے کار ہے اور کافروں کی اپنے بتوں کو جس قدر بھی پکار ہے وہ سب بے کار ہے، بتوں کو پکارنا یہ ایسی دعوت جہالت وضلالت ہے جو ہلاکت اور تباہی تک پہنچانے والی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت صحیح اور درست ہے اور دوسروں کی پرستش بالکل بے کار، رائیگاں اور فضول اور بے سود ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پیاسا پانی کے پاس جا کر اس بات کا منتظر رہے کہ یہ پانی خود بخود میرے منہ میں آ جائے حالانکہ وہ (پانی) کبھی آپ سے آنے والا نہیں۔ اسی طرح غیر اللہ کی پرستش سے جو لوگ نفع کی امید رکھتے ہیں ان کی امید کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کافر جن کو پکارتے ہیں بعض خیالات واوہام ہیں اور بعض جن وشیاطین اور بعض ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں کچھ خواص ہیں لیکن اپنے خواص کے مالک نہیں پھر کیا حاصل ان کا پکارنا جیسے آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں، یہ اس کی مثال فرمائی (انتہیٰ)۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج۴، ص ۹۳، ۹۴]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ کے لیے دعوت حق ہے'' اس سے مراد توحید ہے۔ محمد بن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔

اس آیت کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنی مٹھیوں میں پانی بند کرنا چاہیے تو وہ بند ہونے والا اور رکنے والا نہیں، پس جس طرح پانی مٹھی میں روکنے والا محروم رہتا ہے۔ اسی طرح یہ مشرکین بھی جو اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، محروم رہیں گے۔ [تفسیر ابن کثیر ج۳، ص ۴۱]

☆☆☆

(۲۳)

حق و باطل کی مثال

آیتِ کریمہ:

﴿اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَ مِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡهِ فِی النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡیَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَ الۡبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡكُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ﴾

[الرعد: ۱۷]

ترجمہ

''اس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اپنی سمائی (گنجائش) کے مطابق نالے بہہ نکلے پھر پانی کے ریلے نے اوپر چڑھے جھاگ کو اٹھایا اور اس چیز میں بھی جس کو آگ میں ڈال کر تپاتے ہیں زیور یا سازوسامان کے لیے اسی طرح کے جھاگ ہیں، اللہ تعالیٰ اسی طرح حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، اب جھاگ تو ناکارہ ہو کر چلا جاتا ہے لیکن جو لوگوں کو نفع دینے والی چیز ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔''

تشریح

سابقہ آیت میں کافروں کو اندھوں سے مسلمانوں کو بینا سے اور کفر کو ظلمت اور اسلام کو نور سے تشبیہ دی تھی، آپ ان آیات میں حق و باطل کی دو مثالیں بیان کرتے ہیں،

ایک پانی کی اور ایک آگ کی، چنانچہ فرماتے ہیں کہ حق و باطل کی پہلی مثال یہ ہے کہ اس واحد وقہار نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس پانی سے ندی نالے اپنے اپنے اندازے کے مطابق بہ پڑے، یعنی پانی تو آسمان سے یکساں برسا مگر پرنالے میں اس کی وسعت اور عمق کے بقدر سمایا، اسی طرح آسمان سے قرآن حکیم نازل ہوا اور قلوب کی زمینوں نے اپنے اپنے ظرف اور وسعت کے مطابق اس آسمانی باران رحمت کا اثر قبول کیا اور ہر ایک اپنی استعداد اور لیاقت کے مطابق مستفید اور مستفیض ہوتا ہے جیسے ہر وادی اپنی وسعت اور گنجائش کے مطابق پانی لیتی ہے آگے فرمایا کہ پھر اس سیلاب کے پانی نے اپنے اوپر ایک پھولا ہوا جھاگ اٹھایا۔

سیلاب میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک خالص پانی اور دوسر میل کچیل اور جھاگ یہ اوپر ہوتا ہے اور خالص پانی نیچے دبا ہوا ہوتا ہے، اس طرح سمجھو کہ حق خالص پانی کی طرح ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے اور باطل جھاگ کے مثل ہے، بعض اوقات باطل، حق کو دبا بھی لیتا ہے لیکن باطل کا یہ ابال عارضی اور بے بنیاد ہوتا ہے، تھوڑے سے جوش و خروش کے بعد اس کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے اور اصل کارآمد چیز یعنی حق وصداقت کا آب حیات باقی رہ جاتا ہے۔

حق باطل کی دوسری مثال یہ ہے کہ جس دھات کو زیور بنانے کے لیے یا کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں اور پگھلاتے ہیں تو اصلی دھات اور سونا چاندی تو نیچے رہ جاتا ہے اور ویسا ہی جھاگ اور میل کچیل اوپر آ جاتا ہے جو محض بے کار ہوتا ہے اور اصلی سونا اور چاندی اس جھاگ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح حق و باطل کی مثال بیان کرتے ہیں۔ بہرحال جو جھاگ ہے وہ تو خشک ہو کر چلا جاتا ہے۔ اسی طرح باطل اگر کسی وقت حق پر غالب بھی آ جائے تو اس کو دوام اور قرار نہیں ہوتا اور وہ چیز جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہے، جیسے صاف پانی اور خالص جوہر، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ یعنی اس کو قرار اور ثبات حاصل ہے، اسی طرح دین حق کو قرار اور ثبات حاصل ہے، وہ باقی رہ جاتا ہے اور باطل جو جھاگ کے مثل ہے۔ وہ مٹ جاتا ہے، آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسی

طرح مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ لوگ باطل کے چند روزہ اور ظاہری اور عارضی غلبہ سے شبہ میں نہ پڑیں، حق صاف شفاف پانی یا خالص جوہر کے مثل ہے اور باطل میل کچیل کے مثل ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ اصلی اور خالص جوہر سے اونچا نظر آتا ہے مگر بہت جلد فنا ہو جاتا ہے یا پھینک دیا جاتا ہے۔[معارف القرآن از مولانا کاندھلویؒ ج ۴، ص ۹۵،۹۶]

بعض اسلاف کا حال یہ تھا کہ جو مثال ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی تو رونے لگتے تھے، کیونکہ ان کا سمجھ نہ آنا ان لوگوں کا وصف ہے جو علم سے خالی ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ پہلی مثال میں ان لوگوں کا بیان ہے جن کے قلوب یقین کے ساتھ علم الٰہی کے حامل ہوتے ہیں اور بعض قلوب ایسے ہیں جن میں شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے۔ پس شک کے ساتھ کا علم بے کار اور بے فائدہ ہوتا ہے، یقین پورا فائدہ دیتا ہے، زبد سے مراد شک ہے جو حقیر اور کمتر چیز ہے اور یقین کارآمد اور نفع بخش چیز ہے جو باقی رہنے والی ہے، جیسے زیور، جو آگ میں تپایا جاتا ہے تو کھوٹ نکل جاتا ہے اور کھری چیز باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں یقین مقبول ہے اور شک، مردود ہے پس جس طرح پانی رہ گیا اور پینے وغیرہ کے کام آیا اور خالص سونا چاندی باقی رہا اور اس کے ساز وسامان بنے۔ اسی طرح نیک اور خالص اعمال، انسان کو نفع دیتے ہیں اور باقی رہتے ہیں، جو حق وہدایت پر قائم رہتا ہے وہی نفع پاتا ہے جیسے لوہے کی چھری، تلوار بغیر تپائے بن نہیں سکتی اسی طرح بالکل، ریاکاری اور شک والے اعمال، اللہ تعالیٰ کے ہاں کام نہیں آتے۔ قیامت کے روز باطل ضائع ہو جائے گا اور اہل حق کو حق نفع دے گا۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی منافقوں کی دو مثالیں بیان فرمائی گئیں، ایک پانی کی اور ایک آگ کی۔ سورۃ نور میں بھی کافروں کی دو مثالیں بیان فرمائیں، ایک سراب یعنی ریت کی اور دوسری سمندر کی تہہ کے اندھیروں کی، ریت کا میدان موسم گرما میں دور سے بالکل لہریں لیتا ہوا دریا کا پانی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن یہودیوں سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا مانگتے ہو؟ وہ کہیں

گے کہ ہم پیاسے ہیں، ہمیں پانی چاہیے، ان سے کہا جائے گا کہ پھر جاتے کیوں نہیں؟ چنانچہ جہنم انہیں ایسی نظر آئے گی جیسے دنیا میں ریتلے میدان ہوتے ہیں۔

نیز صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس علم و ہدایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال اس بارش کی طرح ہے جو زمین پر برسی، زمین کے ایک حصہ نے تو پانی قبول کیا، گھاس چارہ بکثرت اُگ آیا، زمین کا بعض حصہ جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اس نے پانی کو روک لیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی لوگوں کو نفع دیا، پانی ان لوگوں کے پینے، پلانے اور آبپاشی کے کام آیا اور زمین کا جو ٹکڑا سنگلاخ اور سخت تھا اس میں نہ پانی ٹھہرا اور نہ وہاں کچھ پیداوار ہوئی، پس یہ مثال ہے اس کی جس نے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کی اور میری بعثت سے اللہ تعالیٰ نے اس کو فائدہ پہنچایا، اس نے خود بھی علم سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور یہ مثال ہے اس کی جس نے اس کے لیے سر بھی نہ اٹھایا اور نہ اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت قبول کی جسے دے کر میں بھیجا گیا ہوں، پس وہ سنگلاخ زمین کے مثل ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ میری اور تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، جب آگ نے اپنے آس پاس کی چیزوں کو روشن کر دیا تو پروانے وغیرہ اس میں آ کر گرنے لگے، وہ شخص ان کو ہر چند روکتا ہے لیکن پھر بھی وہ (پروانے وغیرہ) برابر گرتے رہتے ہیں، یہی مثال میری اور تمہاری ہے کہ میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں روکتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے پرے رہو لیکن تم میری نہیں سنتے اور مجھ سے چھوٹ چھوٹ کر اس آگ میں گرے چلے جاتے ہو۔''

پس ان احادیث میں بھی پانی اور آگ کی دونوں مثالیں آ گئیں۔

[تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۴۳]

☆☆☆

(۲۴)

﴿کفار کے اعمال کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ اَعْمَالُھُمْ کَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ط ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ﴾ [ابراھیم: ۱۸]

ترجمہ

''جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اُڑا دیا ہو وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پاسکیں گے، یہی دور کی گمراہی ہے۔''

تشریح

بعض کفار کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ آخر ہم نے دنیا میں بہت سے اچھے کام صدقہ وخیرات کی مد میں کیے، ہماری خوش اخلاقی لوگوں میں مشہور ہے، بہت سے لوگوں کی مصیبت میں کام آئے، اور کسی نہ کسی عنوان سے خدا کی پوجا بھی کی، کیا یہ سب کیا کرایا اور دیالیا اس وقت کام نہ آئے گا؟ اس کا جواب اس تمثیل میں دیا کہ جسے خدا کی صحیح معرفت نہیں، محض فرضی اور وہمی خدا کو پوجتا ہے اس کے تمام اعمال محض بے روح اور بے وزن ہیں، وہ محشر میں اس طرح اڑ جائیں گے جس طرح آندھی کے وقت جب زور کی ہوا چلے تو راکھ کے ذرات اڑ جاتے ہیں۔اس وقت کفار نیک عمل سے بالکل خالی ہاتھ ہوں گے، حالانکہ وہی موقع ہوگا جہاں نیک عمل کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی، اللہ اکبر! یہ کیسی

حسرت کا وقت ہوگا کہ جن اعمال کو ذریعہ قرب ونجات سمجھتے تھے وہ راکھ کے ڈھیر کی طرح عین اس موقع پر بے حقیقت ثابت ہوئے جب دوسرے لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر شیریں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں۔

؎ کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر تہی دست را دل پراگندہ تر

[فوائد تفسیر عثمانی ص ۳۳۳]

☆☆☆

(۲۵)

﴿کلمہ ایمان اور کلمہ کفر کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ٥ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ م بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ٥ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ٥ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ج وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ قف لا وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾[ابراهيم: ۲۴،۲۷]

ترجمہ

’’کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بات کی مثال کس طرح بیان فرمائی کہ وہ پاکیزہ درخت کے مثل ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں، جو اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنے پھل لاتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت جیسی ہے جو زمین کے کچھ ہی اوپر سے اکھاڑ لیا گیا اس کے لیے کوئی ثبات اور مضبوطی نہیں ہے۔‘‘

تشریح

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ کلمہ ایمان اور کلمہ کفر کی مثال بیان فرماتے ہیں اور

عالم برزخ میں اس کا ثمرہ بیان کرتے ہیں، تا کہ کلمہ توحید کی فضیلت و عظمت اور کلمہ کفر کی قباحت و شناعت واضح ہو۔ اس آیت مبارکہ میں کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ لآ الٰہ الا اللّٰہ ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے اور محمد رسول اللّٰہ (ﷺ) بھی تابع ہونے کی وجہ سے مراد ہے کیونکہ ملزوم کے لیے لازم کا ہونا ضروری ہے، لیکن چونکہ اس امت سے پہلے بھی اہل ایمان گزرے ہیں جو ایمان اور فضائل ایمان میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ سب لآ الٰہ الا اللّٰہ کہتے تھے۔ مگر اس کا قرین ہر امت میں بدلتا رہا ہے۔ کوئی لآ الٰہ الا اللّٰہ کے ساتھ نوح نبی اللہ کہتا تھا۔ کوئی ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا اور کوئی موسیٰ کلیم اللہ کہتا تھا اور کوئی عیسیٰ روح اللہ کہتا تھا اور ہم محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ غرض یہ کلمہ رسالت ہر امت میں بدلتا رہا ہے اور کلمہ لآ الٰہ الا اللّٰہ میں تمام اہلِ ایمان اور اہلِ ادیان مشترک ہیں۔ اسی لئے اکثر احادیث میں لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہ پر اکتفاء کیا گیا۔ باقی مراد پورا کلمہ ہے۔ لآ الٰہ الا اللّٰہ تو سب میں مشترک ہے مگر صوفیاء کرام جب ذکر کی تلقین کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ مثلاً لآ الٰہ الا اللّٰہ کا ذکر اتنی مقدار میں کرو اور کبھی کبھی محمد رسول اللّٰہ بھی کہہ لیا کرو تا کہ لازم اور ملزوم اور تابع اور متبوع کا حق ادا ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر تو اللہ کا حق ہے اور نبی کا حق درود ہے جس کا قرآن میں حکم آیا ہے، لہٰذا لآ الٰہ الا اللّٰہ تو ذکر ہے اور محمد رسول اللہ کلمہ تجدید ایمان کے لیے ہے۔

اب آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے دیکھنے والے کیا تو نے نہیں دیکھا؟ یعنی اے جاننے والے کیا تو نے نہیں جانا؟ کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ توحید اور کلمہ شرک کی کیسی عجیب اور عمدہ مثال بیان کی ہے، کلمہ طیبہ یعنی کلمہ توحید و اسلام ایک نہایت ہی پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کا پھل انتہائی لذیذ اور مفید ہے۔ شجرہ طیبہ سے کھجور کا درخت مراد ہے جو اپنے بے شمار منافع کی بناء پر سب سے عمدہ درخت شمار ہوتا ہے اور وہ پاکیزہ درخت ایسا ہے کہ اس کی جڑ مضبوط ہے، یعنی اس کی جڑ زمین میں راسخ اور جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں ایسی بلند ہیں کہ آسمان میں پہنچ رہی ہیں۔ اسی طرح کلمہ طیبہ کی جڑ مومن کے دل میں راسخ اور ثابت ہوتی ہے۔ پس مومن کا دل زمین کے مثل ہے اور ایمان

واعتقادتوحید جواس میں راسخ ہے وہ کلمہ ایمان کی جڑ ہے اور نیک اعمال اس شجرۂ طیبہ کی شاخیں ہیں جو آسمانِ قبولیت تک پہنچ رہی ہیں اور اس مومن کے لیے رفعت اور بلندی کا ذریعہ بن رہی ہیں اور حدیث میں ان ہی اعمال صالحہ کو ایمان کے شعبوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ یہ پاکیزہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے پھل دیتا رہتا ہے، یعنی شب وروز ہر قسم کے پھل دیتا رہتا ہے اس کا پھل کبھی ختم نہیں ہوتا، یہی حال مومن کے عمل کا ہے کہ آسمان پر چڑھتا ہے یعنی قبول ہوتا ہے اور اس کی برکتیں ہر وقت حاصل ہوتی رہتی ہیں اور اس کا ثواب کبھی ختم نہیں ہوتا، مومن کو اس کا ثواب ہر وقت پہنچتا ہے۔(مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ) اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ سے ایمان کی طرف اشارہ ہے اور ''فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ'' سے اسلام کی طرف اور تُؤْتِیْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ" سے مقام احسان واخلاص کی طرف اشارہ ہے، یعنی ان انوار وبرکات کی طرف اشارہ ہے جوصدق وایمان اور اعمال صالحہ سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ انوار وبرکات شجرۂ ایمان کے ثمرات طیبہ ہیں جو عالم غیب سے ہروقت اس کو حاصل ہوتے رہتے ہیں اور عجب نہیں کہ تُؤْتِیْ اُكُلَهَا سے وہ فواکہ اور ثمرات مراد ہوں جو جنت میں اعمال صالحہ پر مرتب ہوں گے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ غراسها الجنة یا تُؤْتِیْ اُكُلَهَا سے قرب الٰہی اور رضائے خداوندی کے ثمرات مراد ہوں جو دائمی ہیں اور ان کے انقطاع کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے مثالیں بیان کی ہیں تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، کیونکہ مثال سے امر مقصود محسوس کے قریب تر ہو جاتا ہے اور صورت کے آئینہ میں مقصود کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو کلمہ طیبہ کی مثال ہوئی۔ اب آگے کلمہ خبیثہ کی مثال بیان فرماتے ہیں جونفسانی خواہشات ولذّات کا گندا او ربدبودار درخت ہے، چنانچہ فرمایا کہ کلمہ خبیثہ یعنی کلمہ کفر کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نہایت خراب اور گندہ درخت ہو اور ایسا کمزور ہو کہ ذراسی حرکت سے زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اور اس کے لیے زمین میں کچھ قرار اور ثبات نہیں ہے اس لیے اس کی شاخوں اور

پھلوں کا ذکر بے کار ہے۔ کلمہ کفر کو شجرہ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس طرف اشارہ کیا کہ کفر کا وجود تو ہے مگر اس کا وجود پائیدار نہیں ہے، اس لیے کفر کا دعویٰ بے دلیل اور بے بنیاد ہے، اسی لیے اس کی شاخوں اور پھلوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ کفار کا کوئی عقیدہ دنیا میں کسی مضبوط دلیل سے ثابت اور قائم نہیں ہے، ادنیٰ غور کرنے سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے، نیز ممکن ہے کہ اس طرف بھی اشارہ ہو کہ کافر کا کوئی عمل معتبر نہیں ہے اس لیے کہ اس عمل کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی ثمرہ مرتب ہوگا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ پہلی آیت میں کلمہ طیبہ کو شجرہ طیبہ سے تشبیہ دی گئی جس میں چار اوصاف پائے جاتے ہوں۔

(۱) پاکیزہ ہو، یعنی خوش شکل، خوش ذائقہ اور خوش بودار ہو اور اس کا پھل شیریں اور میٹھا ہو۔

(۲) اس کی جڑ مضبوط ہو، گرنے یا اکھڑے سے بالکل محفوظ ہو۔

(۳) اس کی شاخیں بلندی میں آسمان میں پہنچ رہی ہوں، یعنی اس کی شاخیں بہت بلند ہوں، ظاہر ہے کہ دخت جس قدر لمبا ہوگا اسی قدر اس کا پھل بھی پاکیزہ اور لذیذ ہوگا اور زمین کی نجاستوں سے بھی زیادہ محفوظ ہوگا۔

(۴) وہ ہر وقت پھل دیتا ہو، اس کے پھل کا کوئی زمانہ مخصوص نہ ہو۔ جو درخت ان اوصاف کے ساتھ موصوف ہوگا وہ بہت پاکیزہ اور عمدہ درخت ہوگا اور ہر عقلمند انسان اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ پس شجرہ ایمان واسلام کا بھی یہی حال ہے کہ خوش منظر بھی ہے اور سونگھنے میں بھی بہت پاکیزہ ہے، اس شجرہ کے اصول وفروغ کو دیکھ کر اور سن کر ہر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ عمدہ اخلاق و اعمال کا بڑا عجیب پاکیزہ درخت ہے اور اس درخت کی جڑ بہت مضبوط ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت ومحبت اور عقلی وفطری دلائل پر قائم ہے۔ اسی لیے دین اسلام مومن کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور پھر اس اعتقاد جازم سے جو اعمال صالحہ کی شاخیں برآمد ہوتی ہیں وہ آسمان قبولیت تک پہنچی ہوئی ہیں اور

مومن ہر وقت اس پاکیزہ درخت کے ثمرات طیبہ اور انوار و برکات سے بہرہ ور اور لذت یاب ہوتا رہتا ہے اور اس شجرہ ایمان و اسلام کے یہ ثمرات کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

لہٰذا عقلمند انسان کو چاہیے کہ ایسے عمدہ درخت کے حصول میں غفلت سے کام نہ لے جو ہر وقت پھل دیتا رہتا ہے اور پھر حاصل ہونے کے بعد اس کی آبیاری سے بھی غافل نہ ہو، ایسے درخت کا حاصل ہو جانا نعمت عظمیٰ ہے اور ''بِاِذْنِ رَبِّهَا'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس درخت کے ثمرات اور برکات کا حاصل ہونا حکم الٰہی پر موقوف ہے۔ یہ کلمہ طیبہ کی مثال کا بیان ہوا۔

اور اس کے بالمقابل کلمہ خبیثہ یعنی کلمہ کفر ہے جسے خبیث اور گندے درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس میں تین چیزیں پائی جائیں۔

(۱) گندہ اور برا ہو یعنی بدصورت، بدذائقہ اور بدبودار ہو، اس میں دینی دنیوی اور جسمانی و روحانی ہر قسم کی مضرات موجود ہوں اور ہر طرح کی خباثتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہو جس کی بناء پر وہ انتہائی قابل کراہت ہو۔

(۲) اس کی جڑ مضبوط نہ ہو کر ذراسی تیز ہوا چلے یا کوئی حرکت دے تو گر پڑے۔

(۳) اس میں مضبوطی نہ ہو یعنی وہ بہت کمزور درخت ہو جس کو قرار اور ثبات نہ ہو، یہی حال ملت کفر کا ہے کہ ایک خبیث درخت کی طرح ملت کفر بدصورت، بدذائقہ اور بدبودار ہے اس لیے کہ شجرہ کفر طرح طرح کی بداخلاقیوں اور بداعمالیوں کا ایک گندہ درخت ہے جس کا پھل شقاوت اور خسران کے سوا اور کچھ نہیں اور اس شجرہ کفر کی کوئی جڑ اور بنیاد نہیں، ہوا کے ایک جھٹکے میں اکھڑ کر گر پڑتا ہے یہ درخت صرف نفسانی خواہشات اور لذات پر کھڑا ہے، عقل، فطرت اور غیرت کے سراسر خلاف ہے، کفر و شرک کے جتنے اصول و فروع ہیں وہ سب باطل اور بے بنیاد ہیں۔

اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ شجرۂ خبیثہ سے مراد اندرائن کا درخت ہے جس کا پھل

نہایت کڑوا اور زہریلا ہوتا ہے اور بہت بدبودار بھی ہوتا ہے اور اس کی جڑ پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس کو قرار اور ثبات (استحکام) نہیں ہوتا۔ آسانی سے اکھاڑا جاسکتا ہے، کفروشرک کا یہ خبیث درخت، عقل اور فطرت کے جھونکے سے اکھڑ کر گر پڑتا ہے، اسی لیے مثل مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، یعنی جھوٹ، سچ کی طرح اپنے پاؤں سے نہیں چلتا بلکہ زن اور زر کے زور سے چلتا ہے، مگر دل میں نہیں اترتا، اس کی جڑ نہیں ہوتی، یعنی دل اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔

غرض یہ کہ کفروشرک کی نہ تو کوئی بنیاد ہے اور نہ کافرومشرک کے پاس اپنے کفرو شرک کی کوئی دلیل ہے اور نہ ہی اس شجرہ کفروشرک کی کوئی شاخ ہے اور نہ کافر کا عمل اوپر چڑھتا ہے، ایسے خبیث، گندے اور بدبودار درخت کے پھل کیسے ہوں گے؟ اور وہ اتنا کمزور ہے کہ دلائل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ لہٰذا عقلمند انسان کو چاہیے کہ ایسے بدبودار، بدذائقہ، زہریلے اور قابل کراہت درخت سے اجتناب کرے اور ایسے پاکیزہ درخت کے حاصل کرنے کی کوشش کرے جو خوشبودار بھی ہو اور اس کی جڑ مضبوط اور مستحکم ہو، وہ شجرہ توحید و ایمان ہے۔

حدیث میں جو شجرہ طیبہ کی تفسیر کھجور کے درخت سے اور شجرۂ خبیثہ کی تفسیر حنظل اور کثوث کے درخت سے آئی ہے۔ وہ تخصیص کے طور پر نہیں بلکہ تمثیل کے طور پر ہے اور مقصود یہ ہے کہ کلمہ طیبہ ایک شجرۂ طیبہ کے مثل ہے کہ جو مذکورہ اوصاف سے موصوف ہو، خواہ وہ کھجور کا درخت ہو یا کوئی اور پاکیزہ درخت ہو، اور شجرہ خبیثہ سے بھی کوئی خاص درخت مراد نہیں ہے بلکہ جو درخت بھی خراب، گندہ، بدبودار اور بدذائقہ ہو وہ سب شجرہ خبیثہ میں داخل ہے۔

اسی بناء پر امام زجاج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کفر اور ضلالت کا کوئی فرقہ تو لہسن کے درخت کے مشابہ ہے اور کوئی کانٹوں کی جھاڑ کے مشابہ ہے اور کوئی کسی کے اور کوئی کسی کے، یہ تو اہلسنت والجماعت کی تفسیر کے مطابق ہے جبکہ شیعہ کہتے ہیں کہ شجرہ طیبہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مراد ہیں اور

شجرہ خبیثہ سے بنوامیہ مراد ہیں۔[روح المعانی ج۱۳،ص ۱۹۲]

یہاں تک تو کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال بیان ہوئی۔ اگلی آیت میں ہر ایک ثمرے کو بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس مضبوط اور پختہ بات (کلمہ طیبہ) کی برکت سے جس کی جڑ مضبوط ہے، دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے، دنیا میں تو اس طرح کہ مومن اس کلمہ طیبہ کی برکت سے شیاطین انس و جن کے بہکاوے سے محفوظ اور مامون رہتا ہے اور جب کوئی ابتلاء اور آزمائش آتی ہے تو اللہ کی توفیق سے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور راہ توحید سے اس کا قدم نہیں ڈگمگاتا اور اس کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آتا، حتیٰ کہ وہ مرنے تک ایمان پر قائم رہتا ہے اور اسی کلمہ پر اس کا حسن خاتمہ ہوتا ہے اور آخرت میں اس طرح کہ قبر میں، جو آخرت کی پہلی منزل ہے، منکر نکیر کے سوالات کا صحیح صحیح جواب دیتا ہے اور محشر کے دن حساب و کتاب کے وقت اس کو کوئی خطرہ اور اندیشہ لاحق نہیں ہوگا۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ، مومنوں کو دنیا و آخرت میں دین حق پر قائم اور ثابت قدم رکھتا ہے۔ آیت کریمہ میں مذکورہ لفظ "يُثَبِّتُ اللّٰهُ"، میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اسے یہ استقامت اللہ تعالیٰ کی توفیق و تثبیت اور اس کے فضل و کرم سے حاصل ہوتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی تثبیت اور تائید حاصل نہ ہو تو مومن کو استقامت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور "قول ثابت" سے مراد کلمہ ایمان اور اس کے لوازم ہیں، یہ تو کلمہ طیبہ کے ثمر کا بیان تھا۔ اس کے بعد کلمہ خبیثہ کے اثر کو بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کلمہ خبیثہ کی نحوست سے ظالموں یعنی کافروں کو جنھوں نے کفر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، دنیا و آخرت دونوں جگہوں میں بچلا دیتے ہیں، دنیا میں ان کا بچلنا ظاہر ہے کہ حق و صداقت سے منحرف رہے اور آخرت میں بچلنا یہ ہے کہ قبر میں منکر نکیر کے سوالات کے جواب نہ دے سکیں گے، بلکہ حیرت زدہ ہو کر ہائے وائے کہیں گے، افسوس میں کچھ نہیں جانتا، لوگ جو کہتے تھے میں بھی وہی کہتا تھا، اس پر فرشتے اس کو گرز ماریں گے اور کہیں گے لادریت و لاتلیت کہ نہ تو نے خود سمجھا اور نہ کسی کی تو نے اتباع اور پیروی کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں،

ایک ایمان تحقیقی اور دوسرا ایمان تقلیدی، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان تحقیقی کی طرح ایمان تقلیدی بھی معتبر ہے جیسے بعض لوگوں کو ایمان کی پوری حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے اور ہم مسلمان کلمہ گو ہیں، یہ ایمان تقلیدی ہے اور اللہ کے ہاں یہ بھی معتبر ہے۔

یہاں بظاہر ایک اشکال ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی ثابت قدم رکھتے ہیں اور وہی بچلاتے ہیں تو پھر بچلنے والا بے قصور ہوا اس کو مورد الزام کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس کا ایک جواب تو لفظ ''یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ'' سے ہوگیا کہ وہ اپنے ظلم کی وجہ سے بچل گئے، یہ حکیمانہ جواب ہے، اس کا حاکمانہ جواب ''وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَایَشَآءُ'' میں دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے اور ثابت قدم رکھے اور جسے چاہے گمراہ کرے، اس کی بارگاہ میں یہ سوال نہیں ہوسکتا کہ مومنوں کو کیوں ثابت قدم رکھا اور ظالموں کو کیوں گمراہ کیا، وہ علیم وحکیم ذات ہے، وہ اپنی حکمت اور مشیت سے جو مناسب ہوتا ہے وہی معاملہ کرتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ایک خاص اسلوب سے ایمان اور کفر کے فرق کو بتایا ہے، وہ یہ کہ دین اسلام کی مثال ایک نہایت معدہ وشیریں نفع بخش پھل دار درخت جیسی ہے جو عالم ملکوت سے اتار کر مکہ میں نصب کیا گیا جو علو اور رفعت کی وجہ سے یہ کہلانے کا مستحق ہے کہ اس کی جڑ زمین میں قائم ہوئی اور پھر اس کی جڑیں اور شاخیں پھوٹنی شروع ہوئیں اور اطرافِ عالم میں پھیلتی گئیں اور کلمہ ناپاک کی مثال ایک ناپاک اور خراب درخت جیسی ہے جیسے لوگ گندگی کی وجہ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور وہ سرسبز نہیں ہونے پاتا، اس طرح جو کفر وشرک عالم میں پھیلا ہوا تھا اسلام نے اسے مٹایا اور مٹاتا رہا، اس تمثیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں کا حال بیان فرمایا، ایک گروہ وہ تھا کہ جو اعلاء کلمہ حق میں ساعی وکوشاں تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جو کفر کا پیشوا اور کفر وشرک کی ترویج میں ساعی وکوشاں تھا، پہلے گروہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں دینِ اسلام پر ثابت قدم رکھے گا اور آخرت میں ان کے

درجات بلند کرے گا اور دوسرے گروہ کی اللہ تعالیٰ نے خدمت کی جس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی دینِ حق کو کفر اور ضلالت سے تبدیل کر رکھا تھا اور آخرت میں ان کا برا ٹھکانہ قرار دیا، پہلے گروہ کے مصداقِ اولین، مہاجرینِ اولین ہیں جن کے سردفتر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کی وجہ سے دینِ اسلام نے رواج پایا اور دوسرا گروہ جہلائے قریش تھا، اس گروہ کا سردفتر ابوجہل تھا، گروہِ اول کے مقابلہ میں گروہِ ثانی والے ذلیل وخوار اور بلا و مصیبت میں گرفتار ہوئے اور آیت میں جس تثبیت کا ذکر ہے اس سے توفیق الٰہی مراد ہے جو بندہ کو قبر میں عطا کی جاتی ہے اور جس وقت منکر نکیر اُس سے آ کر سوال کرتے ہیں تو وہ بتوفیق الٰہی راست جواب دیتا ہے۔''

[ازالۃ الخفاء، معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ملخصاً ج ۴، ص ۱۳۳ تا ص ۱۳۹]

☆☆☆

(۲۶)

﴿خوابِ غفلت میں پڑے لوگوں کا حال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الاعراف: ۱۷۹]

ترجمہ:

''اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دِل ہیں ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں ان سے سنتے نہیں وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ یہی لوگ غافل ہیں۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ آیاتِ خداوندی کا نزول ہدایت ہی کے لیے ہوا ہے اور بظاہر ہدایت کا سبب یہی آیات ہیں لیکن ہدایت اور گمراہی کا اصل سبب قضاء وقدر ہے، اس لیے کہ ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن و انسان پیدا کیے ہیں، تاکہ وہ خدا کے تنور (دوزخ) کا ایندھن بنیں، جس طرح ہم جنت کے رزاق ہیں اسی طرح جہنم کے بھی رزاق ہیں، ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے رزق کے لیے پیدا کیا ہے، ہم مالکِ مطلق اور خالقِ مطلق ہیں، جو چاہیں کریں، بندہ کا فرض ہے کہ بلاچوں و چرا اللہ کی اطاعت اور بندگی بجالائے اور قضاوقدر کے اسرار ورموز کو اللہ کے سپرد کردے۔

آگے فرماتے ہیں کہ ان منکرین اور معاندین کے دِل ہیں مگر ان دلوں سے حق

کونہیں سمجھتے اوران کی آنکھیں ہیں مگران آنکھوں سے آیاتِ قدرت اور دلائل نبوت کونہیں دیکھتے اوران کے کان ہیں مگران کانوں سے حق بات کونہیں سنتے ،یعنی دل بھی ہے، آنکھ بھی ہے اور کان بھی ہے مگر توفیق خداوندی نہ ہونے کی وجہ سے راہِ ہدایت گم ہے۔ایسے لوگ، جواپنے حواس اور قوائے ادراکیہ کو دنیائے فانی کی لذات وشہوات کی طرف متوجہ رکھتے ہیں، چوپاؤں کی مانند ہیں، جن کی زندگی کا مقصود ہی کھانا، پینا اور سونا ہے۔ بلکہ یہ لوگ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں، یعنی چوپائے تو اپنے مالک اوراپنے نفع ونقصان کو پہچانتے ہیں لیکن یہ لوگ انسان ہونے کے باوجود آخرت کے نفع ونقصان کونہیں پہنچاتے۔ یہ لوگ وہ ہیں کہ جوتوجہ دلانے کے باوجودآخرت سے بالکل غافل ہیں۔اس لیے کہ ان کی شہوتِ نفسانی ان کی عقل پر غالب ہے، ایسے ہی لوگوں کواللہ تعالیٰ نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، ان کے جہنمی ہونے کا سبب مذکورہ صفات ہیں۔ اور قضاء وقدر اللہ کا فعل ہے، وہ مالک ومختار ہے جو چاہے کرے۔اس کی تقدیر کو کوئی نہیں جانتا کہ اس نے تقدیر میں کیا لکھا ہے۔اس نے انسان کو پیدا کیا اوراپنے خاص فضل وکرم سے اس کو عقل، قدرت اور ارادہ عطا فرمایا، انسان دنیا کے مشکل سے مشکل کام اسی عقل اور قدرت کے ذریعہ انجام دیتا ہے اور دنیا کے کاموں میں تگ ودو کرتا رہتا ہے، لیکن جب آخرت کے کسی کام کا ذکر آتا ہے تو مجبور بن جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تقدیر میں ایسا ہی لکھا ہے۔ یہ تمام بہانے ہیں جو شنوائی کے قابل نہیں ہے۔[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ، ج ۳ ص ۱۶۷، ۱۶۸]

یہاں مقصد یہ ہے کہ ایسے محروم القسمت لوگ کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھاتے، تمام اعضاء ہوتے ہیں مگر قوتیں سب سے سلب ہو جاتی ہیں، اندھے بہرے اور گونگے بن کر ساری زندگی گڑھے میں ہی گزار دیتے ہیں، اگر ان میں خیر باقی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنی باتیں انہیں سناتا، یہ لوگ تو خیر سے بالکل تہی دست ہو گئے، سنتے ہیں اوران سنی کر جاتے ہیں، ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں، انہیں ذکرِ رحمان سے اعراض کرنے کی سزا یہ ملی کہ شیطان کے بھائی بن گئے، راہِ حق سے دور جا پڑے، مگر سمجھ یہی رہے ہیں کہ ہم راست گواور راہِ راست پر چل رہے ہیں۔ ان میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ یہ لوگ نہ حق کو دیکھتے ہیں اور نہ ہدایت کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی اللہ کے احکام میں غور کرتے

ہیں، جس طرح چوپائے اپنے حواس اور اعضاء کو دنیا کے کام میں استعمال کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی فکرِ آخرت، ذکرِ الٰہی اور راہِ حق سے غافل، اندھے اور گونگے، بہرے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ترقی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ تو چوپاؤں سے بھی بدترین ہیں۔ چوپائے گو نہ سمجھیں لیکن آواز پر کان تو کھڑے کر دیتے ہیں مالک کے اشاروں پر حرکت تو کرتے ہیں لیکن یہ لوگ تو اپنے مالک کو اتنا بھی نہیں سمجھتے، اپنی پیدائش کے مقصد کو آج تک انہوں نے نہیں سمجھا، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ سے کفر کرتے ہیں اور غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اس کے برعکس جو اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرماں بردار انسان، اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار فرشتہ سے بہتر ہے اور ان کافروں سے چوپائے اور جانور بہتر ہیں، ایسے لوگ پورے غافل ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۳۹]

تعارض:

سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت ”وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ“ سے معلوم ہوتا ہے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور دخولِ جہنم کا سبب ترکِ عبادت ہے، اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ ہم نے بہت سوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ عبادت نہ کریں، جب کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت: ”وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے؟

جواب:

پہلی آیت میں تخلیق کے مقصد تکوینی کا بیان ہے اور دوسری آیت میں مقصد تشریعی کا ذکر ہے۔ یعنی تمام جن وانس کی تخلیق کا تشریعی مقصد تو یہی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں لیکن ان حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے جن کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، بہت سے جن وانس کی پیدائش کی تکوینی غایت یہ ہے کہ وہ عبادت نہ کریں اور جہنم میں داخل ہوں، پس جب دونوں مقصدوں کی نوعیت جدا جدا ہے تو ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ [بیان القرآن ج ۴، ص ۵۴، معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ، ج ۳، ص ۱۶۹]

(۲۷)

﴿مبعودانِ باطل کے نقائص﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡہُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ اَلَہُمۡ اَرۡجُلٌ یَّمۡشُوۡنَ بِہَاۤ ۫ اَمۡ لَہُمۡ اَیۡدٍ یَّبۡطِشُوۡنَ بِہَاۤ ۫ اَمۡ لَہُمۡ اَعۡیُنٌ یُّبۡصِرُوۡنَ بِہَاۤ ۫ اَمۡ لَہُمۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ؕ﴾

[الاعراف: ۱۹۴]

ترجمہ

''تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو ان کو پکار کر دیکھو یہ تمہاری پکار کا جواب دیں، اگر تم سچے ہو، کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟۔''

تشریح

ان آیات میں معبودانِ باطلہ کے نقائص کا ذکر ہے جو ان کے معبود نہ ہونے کی دلیل ہیں بلکہ وہ تو اپنے پرستاروں سے بھی بدتر ہیں، نہ ان کے ہاتھ ہیں، نہ ان کے پیر، نہ ان کی آنکھ ہے، نہ ان کے کان، وہ تو اپنے پرستاروں کی آواز بھی نہیں سن سکتے، پھر ان کی پرستش کیوں کرتے ہیں؟ اب ارشاد ہوتا ہے کہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے ہی طرح کے عاجز بندے ہیں، بندے سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری طرح خدا کے مملوک اور

مخلوق ہیں اور ایک مماثل دوسرے مماثل کے حق میں معبود نہیں ہوسکتا اور اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ تم سے افضل اور اکمل ہیں تو ان معبودوں کو پکاروں تو سہی پس ان کو چاہیے کہ تمہاری پکار کا جواب دیں اور تمہاری درخواست اور معروضات کو قبول کریں۔ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ وہ تمہارے معبود برحق ہیں۔ اس لیے کہ معبودِ برحق پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندے کی عرض و معروض کو قبول کرے اور اس کی دعا اور پکار کا جواب دے۔ وہ تمہاری باتوں کا کیا جواب دے سکتے ہی، ان میں تو وہ کمالات بھی موجود نہیں ہیں جو ایک معمولی انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔

کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چل سکیں اور کسی قسم کی حرکت کرسکیں؟ یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ کوئی چیز پکڑ سکیں؟ یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ کچھ دیکھ سکیں؟ یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سن سکیں؟ پس ایسے لولوں، لنگڑوں اور اندھوں بہروں کو خدا بنانا اعلیٰ درجہ کی حماقت اور بے وقوفی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خود اس بات کے قائل ہو کہ ان کے نہ پاؤں ہیں، نہ ہاتھ ہیں اور نہ ان کی آنکھیں ہیں اور تمہیں یہ سب چیزیں حاصل ہیں تو تم ان سے افضل اور اعلیٰ ہو، لہٰذا تمہارا بتوں کے آگے جھکنا جو تم سے بہت عاجز اور کمتر ہیں، کمال درجہ کی حماقت اور بے وقوفی ہے۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ، ج ۳، ص ۱۷۸، ۱۷۹]

جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو پوجتے ہیں، حالانکہ وہ بالکل بے اختیار ہیں، کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں، وہ اپنے پجاریوں کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے بلکہ وہ تو حرکت بھی نہیں کر سکتے، دیکھ اور سن بھی نہیں سکتے، ان بتوں سے تو ان کے پجاری ہی توانا، تندرست اور اچھے ہیں کہ ان کی آنکھیں بھی ہیں، کان بھی ہیں، یہ بے وقوف انہیں پوجتے ہیں، حالانکہ انہوں نے ساری مخلوق میں سے ایک چیز کو بھی پیدا نہیں کیا بلکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہیں۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ ”لوگو! آؤ، ایک لطیف مثال سنو، تم لوگ جنہیں پکارتے ہو وہ سارے جمع ہو کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو ان کی طاقت اور قدرت سے باہر ہے، بلکہ ان کی کمزوری کی انتہاء تو یہ ہے کہ اگر کوئی مکھی ان کی کوئی چیز

چھین لے جائے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے، طالب اور مطلوب دونوں ہی بودے ہیں۔"

تعجب ہے کہ اتنے کمزوروں کی عبادت کی جاتی ہے جو اپنا حق ایک مکھی سے بھی نہیں لے سکتے، وہ بھلا تمہارے رزق اور مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ کیا تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جنہیں خود گھڑتے اور بناتے ہو! وہ نہ اپنے پجاریوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے ان بتوں کو پاش پاش کر دیا، لیکن ان سے یہ نہ ہو سکا کہ اپنے آپ کو ان کے ہاتھ سے بچا لیتے، ہاتھ میں کلہاڑی لے کر سب کا صفایا کر دیا اور ان معبودانِ باطل سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی حضرت معاذ بن عمرو بن جموح اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یہی کام کرتے تھے کہ رات کے وقت چپکے سے جا کر مشرکین کے بت توڑ آتے اور جو لکڑی کے ہوتے انہیں توڑ کر بیوہ عورتوں کو دے دیتے کہ وہ ان کو ایندھن کے طور پر استعمال کر لیں اور بت پرست لوگ اس سے عبرت حاصل کریں، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے باپ عمرو بن جموح بھی بت پرست تھے، یہ دونوں نوجوان دوست وہاں بھی پہنچتے اور اس بت کو نجاست سے آلودہ کرتے، جب یہ آتا تو اپنے خدا کو اس حالت میں دیکھ کر بڑا سیخ پا ہوتا، پھر اس کو دھوتا، صاف کرتا، پھر اس پر خوشبو لگاتا۔ ایک مرتبہ اس نے اس کے پاس تلوار رکھ دی اور کہا کہ دیکھ! اگر آج تیرا دشمن آئے تو اس تلوار سے اس کا کام تمام کر دینا، یہ دونوں دوست اس رات بھی پہنچے اور اس کی درگت کر کے پاخانے سے لیپ کر کے چلے آئے مگر اس کو ابھی اس کا اثر نہیں ہوا۔ صبح کو اسی طرح اس نے اسے دھویا اور ٹھیک ٹھاک کر کے خوشبو لگا کر اس کی پوجا پات کی۔ جب ان دونوں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتا تو ایک رات اس بت کو اٹھا لائے اور ایک کتے کا پلا جو مرا پڑا تھا۔ اس کے گلے میں باندھ دیا اور محلہ کے ایک کنوئیں میں ڈال دیا، صبح کو جب اس نے اپنے بت کو نہ پا کر

ڈھونڈا تو کنوئیں میں نظر آیا کہ کتے کے مردہ بچے کے ساتھ پڑا ہوا ہے۔ اب اسے بت اور بت پرستی سے نفرت ہوگئی اور اس نے یہ شعر کہا:

تاللّٰہ لو کنت الٰھا مستدن   لم تک و الکلب جمیعا فی قرن

یعنی اگر تم واقعی خدا ہوتے تو کنوئیں میں پلّے کے ساتھ پڑے ہوئے نہ ہوتے۔''

پھر سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہو گئے، پھر اسلام میں سچے اور مخلص بنے، اور اُحد کی لڑائی میں جامِ شہادت نوش کیا۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا کہ اے ابا جان! آپ ان کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں، نہ آپ کو نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ آپ کے کسی کام آسکتے ہیں؟ انہیں پکارنا نہ پکارنا برابر ہے، یہ تو تمہاری طرح عاجز، بے بس اور اللہ کی مخلوق ہیں، بتاؤ تو سہی، انہوں نے تمہاری کبھی فریاد رسی کی ہے؟ یا کبھی تمہاری پکار کا جواب دیا ہے؟ حقیقت میں تم ان سے افضل اور اعلیٰ ہو، کیونکہ تم دیکھتے، سنتے، چلتے پھرتے اور بولتے چالتے ہو، یہ تو اتنا بھی نہیں کر سکتے، اچھا، تم ان سے میرا کچھ بگاڑنے کی درخواست کرو، میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر ان میں طاقت اور قدرت ہو تو بلا تامل اپنی پوری طاقت سے جو میرا کچھ بگاڑ سکتے ہوں تو بگاڑ لیں، سنو! میں تو اللہ تعالیٰ کو اپنا مددگار سمجھتا ہوں، وہی مجھے بچانے والا ہے اور مجھے کافی ہے، اس پر میرا بھروسہ ہے، میں ہی نہیں بلکہ ہر نیک بندہ یہی کرتا ہے اور وہ اپنے تمام سچے غلاموں کی حفاظت کیا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ میرے بعد بھی ان سب کا نگران اور محافظ وہی ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام سے آپ کی قوم نے کہا کہ ہمارا تو خیال ہے کہ تم جو ہمارے معبودوں پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے انہوں نے تجھے ان مشکلات میں ڈال دیا ہے، اس کے جواب میں اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ سنو! میں تم کو اور اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں اللہ کے سوا تمہارے تمام معبودوں سے بری، بیزار اور ان کا دشمن ہوں، تم میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو، میرا بھروسہ اللہ کی ذات پر ہے، تمام جانداروں کی

پیشانیاں اسی کے قبضہ میں ہیں، میرا رب ہی درست راہ پر ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بھی یہی فرماتا تھا کہ تم اور تمہارے بزرگ جن کی تم پرستش کرتے ہو، میں ان سب کا دشمن ہوں اور مجھ سے دور ہیں سوائے اللہ رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا بھی کیا اور میری رہنمائی بھی فرمائی۔ آپ نے اپنے والد اور اپنی قوم سے بھی یہی فرمایا کہ میں تمہارے معبودانِ باطل سے بری اور بیزار ہوں سوائے اس بچے معبود کے جس نے مجھے پیدا کیا، وہ میری رہنمائی بھی کرے گا، ہم نے اسی کلمہ کو ان کی نسل میں ہمیشہ کے لیے باقی رکھا تاکہ لوگ اپنے باطل اور بے بنیاد خیالات کو ترک کر دیں، پھر بطورِ تاکید کے خطاب کر کے فرمایا کہ اللہ کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ ہی خود اپنے آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں، یہ معبودانِ باطل تو سن ہی نہیں سکتے، تجھے تو یہ بظاہر آنکھوں والے دکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی اصلی آنکھیں ہی نہیں ہیں کہ جن سے یہ کسی کو دیکھ سکیں، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا کہ اگر تم انہیں پکارو تو وہ نہیں سن سکتے، چونکہ وہ محض تصاویر اور بت ہیں، ان کی آنکھیں بھی مصنوعی ہیں، بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ دیکھ نہیں رہے، چونکہ وہ پتھر بصورتِ انسان ہیں اس لیے ضمیر بھی ذوی العقول کی لے کر آئے، بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد کفار ہیں لیکن قولِ اول ہی بہتر ہے۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مختار قول ہے۔[تفسیر ابن کثیر ج۲، ص ۲۴۹ تا ۲۵۰ ملخصاً]

☆☆☆

(۲۸)

﴿اطاعتِ خداوندی کا حکم اور تشبّہ بالکفّار کی ممانعت﴾

آیتِ کریمہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ﴾ [الانفال: ۲۰-۲۲]

ترجمہ

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور اس سے مت پھرو سن کر، اور ویسے مت ہو جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور وہ سنتے ہیں، بدتر سب جانوروں میں ہیں اللہ کے ہاں وہی بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے۔''

تشریح

گزشتہ آیات میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ہے، اب ان آیات میں اہل ایمان کو ہدایت دیتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی معیت اور نصرت وامداد کا دار ومدار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی معیت و نصرت کے طلبگار اور خواہش مند ہو تو اس کے لیے دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دل وجان سے ایسی اطاعت اور فرماں برداری کرو کہ جس میں خیانت کا شائبہ تک نہ ہو، اس لیے کہ خیانت، کامل اطاعت میں مخل اور مانع ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ خدا کے باغیوں اور اس کے دشمنوں یعنی کفار اور منافقین کی

مشابہت اور مماثلت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: "من تشبہ بقوم فھو منھم" یعنی جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں سے شمار ہوگا۔ کوئی حاکم اور بادشاہ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی وفاداری کا دعویدار، اس کے دشمنوں کا ہم لباس، ہم شکل اور ہم رنگ بنے، اسی طرح دعویٰ تو ایمان کا ہو، خدا اور رسول ﷺ کی محبت کا ہو لیکن صورت وشکل اور طرزِ معاشرت سارا کا سارا خدا اور رسول کے دشمنوں کا سا ہو۔ یہ در پردہ اجتماعِ ضدین ہے جو عقلاء اور حکماء کے نزدیک بالکل احمقانہ دعویٰ ہے۔
اس لیے ان آیات میں اولاً اللہ تعالیٰ نے کامل اطاعت وفرماں برداری کا حکم دیا اور ثانیاً اسلام کے دشمن یعنی کفار ومنافقین سے مشابہت کی ممانعت فرمائی اور پھر اس کے ساتھ مشبہ بہ کی مذمت میں ان کو شرّ الدواب (بدترین جانور) فرمایا تاکہ کفار ومنافقین سے مشابہت ومماثلت کی قباحت وشناعت خوب واضح اور ذہن نشین ہو جائے۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ کی معیت نور نصرت وامداد کے خواستگار ہو تو تم اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور رسول کے حکم سے روگردانی نہ کرو حالانکہ تم سن رہے ہو کہ وہ ہمارے رسول ﷺ ہیں اور ان کی اطاعت ہماری اطاعت ہے اور ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اطاعت کرو، اور ان لوگوں کے مشابہ نہ بنو جو زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کا حکم سن لیا اور دل سے نہیں سنتے، یعنی منافقوں کی طرح نہ بنو جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہے، صرف سر کے کانوں سے سن لینا کافی نہیں اور یہ صرف ایمانی تقاضے کے خلاف نہیں بلکہ انسانی تقاضے کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ بلاشبہ یقیناً بدترین حیوانات، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ لوگ ہیں جو حق بات سننے سے بہرے اور حق کے بولنے سے گونگے اور حق بات کے سمجھنے سے عقل سے عاری ہیں، نہ حق کو سنتے ہیں، نہ حق بات منہ سے نکالتے ہیں اور نہ حق بات کے سمجھنے کی طرف اپنی عقل کو متوجہ کرتے ہیں، ایسے لوگ حیوانات سے بھی بدتر ہیں، اس لیے کہ حیوانات تو چلو عقل وادراک سے عاری ہیں، ان کو کیا ہوا کہ عقل وادراک اور شعور واحساس کے ہوتے ہوئے بھی نفس اور طبیعت کی طرف دوڑ پڑے۔

[تفسیر معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ، ج ۳، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱ ملخصاً]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تفسیر وتشریح میں فرماتے ہیں کہ ''منافقوں کی طرح نہ بنو کہ بظاہر ماننے والا ظاہر کیا لیکن حقیقت میں یہ بات نہیں ہے اور ایسے لوگ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں جو حق باتوں سے اپنے کان بہرے کر لیں اور حق باتوں کے سمجھنے سے گونگے بن جائیں اور بے عقلی اور حماقت سے کام لیں، اس لیے کہ تمام جانور بھی اللہ تعالیٰ کے زیرِ فرمان ہیں جو جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اسی میں مشغول ہے مگر یہ لوگ ایسے ہیں کہ پیدا تو کیے گئے ہیں عبادت و بندگی کے لیے لیکن کفر کا ارتکاب کرتے ہیں، چنانچہ دیگر آیات میں ان کو جانوروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ان کافروں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ان کو آواز دے تو سوائے ندا اور پکار کے کچھ نہ سنیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد بنو عبدالدار کے قریشی لوگ ہیں۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد منافق ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس سے مشرک اور منافق دونوں مراد ہیں، کیونکہ دونوں میں فہمِ صحیح اور عقلِ سلیم نام کی چیز نہیں ہوتی اور نہ ہی عمل صالح کی انہیں توفیق ہوتی ہے۔'' [تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۲۷۷]

سوال:

اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ'' امرِ اطاعت میں تو تثنیہ کا ذکر فرمایا اور نہی کے سلسلہ میں مفرد ضمیر (عَنْهُ) لے کر آئے؟

جوابِ اول:

جس طرح لغتِ عرب میں اسمِ مفرد بول کر تثنیہ اور جمع مراد لیا جاتا ہے اسی طرح مفرد ضمیر ذکر کر کے اس سے تثنیہ کی ضمیر مراد لی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ'' اور مراد یُرْضُوْهُمَا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی اسی طرح ہوا ہے، چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ ''وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُمَا'' کہ ان دونوں سے روگردانی نہ کرو۔

جوابِ ثانی:

صرف اللہ تعالیٰ کی طرف "عَنْهُ" کی ضمیر راجع کرنے کے اعتبار سے ضمیر کو مفرد لائے، کیونکہ اصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، نیز اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت آپس میں لازم وملزوم ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" نیز ایک اور مقام پر فرمایا: "اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ" چنانچہ رسول سے اعراض اور روگردانی دراصل اللہ تعالیٰ سے اعراض اور روگردانی ہے، اس بناء پر صرف اس (اللہ تعالیٰ) کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

جوابِ ثالث:

آیتِ ہذا میں "عَنْهُ" کی ضمیر حکم کی طرف راجع ہے نہ کہ صرف رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف، معنی یہ ہوگا کہ اس حکم سے اور اس جیسے دیگر احکام سے اعراض اور روگردانی نہ کرو۔

جوابِ رابع:

"وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُمَا" (تثنیہ کے ساتھ) اس لیے نہیں فرمایا، تا کہ لفظِ اللہ کو مقدم کیے بغیر اللہ و رسول ﷺ دونوں کو ایک ہی لفظ میں ذکر کرنے سے حضور نبی کریم ﷺ کے ادب میں کوئی تقصیر اور کوتاہی لازم نہ آئے، کیونکہ ایک حدیثِ مبارک میں اللہ و رسول ﷺ دونوں کو (ایک ساتھ) تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ لانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ ایک خطیب نے جب لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ اسلوب اختیار کیا: "مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَ مَنْ عَصَاهُمَا فَقَدْ غَوٰى" تو رسولِ کریم ﷺ نے اسے فرمایا کہ تم اپنی قوم کے برے خطیب ہو، تم نے یوں کیوں نہیں کہا: وَ مَنْ عَصَى اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ غَوٰى؟" [نکات القرآن]

☆☆☆

(۲۹)

﴿جہاد کے ظاہری و باطنی آداب﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ [الانفال: ۴۶]

ترجمہ

''اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے نکلے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا احاطہ کرنے والے ہیں۔''

تشریح

ابوجہل لشکر لے کر بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلا تھا تا کہ مسلمان مرعوب ہو جائیں اور دوسرے قبائل عرب پر مشرکین کی دھاک بیٹھ جائے، راستہ میں ابوسفیان کا پیغام پہنچا کہ قافلہ سخت خطرہ سے بچ نکلا ہے اب تم مکہ کو لوٹ جاؤ، ابوجہل نے نہایت غرور سے کہا کہ ہم اس وقت واپس جا سکتے ہیں جب کہ بدر کے چشمہ پر پہنچ کر مجلسِ طرب و نشاط منعقد کر لیں، گانے والی عورتیں خوشی اور کامیابی کے گیت گائیں، شرابیں پئیں، مزے اڑائیں اور تین روز تک اونٹ ذبح کر کے قبائلِ عرب کی ضیافت کا انتظام کریں، تا کہ یہ دن عرب میں ہمیشہ کے لیے ہماری یادگار رہے اور آئندہ کے لیے ان مٹھی بھر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں کہ پھر کبھی ہمارے مقابلہ کی جرأت نہ کریں، اسے کیا خبر تھی کہ جو منصوبے باندھ رہے ہیں اور تجویزیں سوچ رہے ہیں وہ سب

خدا کے قابو میں ہیں، چلنے دے یا نہ چلنے دے، بلکہ چاہے تو ان ہی پر الٹ دے، چنانچہ یہی ہوا، بدر کے پانی اور جامِ شراب کی جگہ انہیں موت کا پیالہ پینا پڑا، محفل سرود و نشاط تو منعقد نہ کر سکے ہاں نوحہ و ماتم کی صفیں "بدر" سے "مکہ" تک بچھ گئیں، جو مال تفاخر و نمائش میں خرچ کرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے لیے لقمۂ غنیمت بنا، ایمان و توحید کے دائمی غلبہ کا بنیادی پتھر بدر کے میدان میں نصب ہو گیا، گویا ایک طرح اس چھوٹے سے قطعۂ زمین میں خدا تعالیٰ نے روئے زمین کی مِلل و اقوام کی قسمتوں کا فیصلہ فرما دیا۔ بہر حال اس آیت میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ جہاد محض ہنگامۂ کشت و خون کا نام نہیں، بلکہ عظیم الشان عبادت ہے، عبادت پر اترانے یا دکھانے کے لیے کرے تو قبول نہیں، لہٰذا تم فخر و غرور اور نمود و نمائش میں کفار کی چال مت چلو۔ [فوائد عثمانی ص ۲۳۶]

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے اور اپنی شجاعت و بہادری پر فخر کرتے ہوئے نکلے یعنی جس طرح کافر جنگِ بدر میں غرور و تکبر کے انداز میں آئے تھے اس طرح تم لڑائی کے وقت فخر و غرور نہ کیا کرو، اسی طرح تم ان لوگوں کے مشابہ نہ بنو جو اپنے گھروں سے لوگوں کو دکھلانے کے لیے نکلے، تاکہ لوگ ان کی شجاعت و بہادری کی تعریف کریں، لہٰذا جب تم خدا کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے نکلو تو ان کی مشابہت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ آگے فرمایا کہ یہ مغرور اور ریاکار لوگ اللہ کی راہ سے دوسروں کو روکتے ہیں، یعنی لوگوں کو دینِ الٰہی سے باز رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یعنی کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، قیامت کے روز ان کو ان کے اعمال کی ضرور سزا دے گا۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۳، ص ۲۴۵]

☆☆☆

(۳۰)

﴿مشرکین کے فخر و ناز کا جواب﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَةَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ﴾

[التوبة: ۱۹]

ترجمہ

’’کیا تم نے حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجدِ حرام کا بسانا برابر ٹھہرایا اس کے جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک وہ برابر نہیں ہیں، اور اللہ راہ نہیں دکھاتا بے انصاف لوگوں کو۔‘‘

شانِ نزول:

حضرت معمر بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے کہا کہ اگر میں حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا اور کوئی عمل نہ کروں تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، دوسرے نے کہا کہ اگر میں مسجدِ حرام کی تعمیر کے سوا اور کوئی عمل نہ بھی کروں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں، تیسرے نے کہا کہ تم نے جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ افضل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ ’’منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنی آوازیں بلند نہ کرو‘‘ یہ واقعہ جمعہ کے دن کا ہے، جب میں نماز پڑھ لوں گا تو اندر جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمہارے مختلف فیہ مسئلہ کے بارے فتویٰ

طلب کروں گا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ [رواہ مسلم عن الحسن بن علی الحلوانی]

والبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب بدر کے دن عباس بن عبدالمطلب گرفتار ہوئے تو کہنے لگے کہ اگر تم اسلام لانے اور ہجرت و جہاد کی وجہ سے ہم پر سبقت لے گئے تو ہم بھی مسجدِ حرام کی تعمیر کیا کرتے تھے، حاجیوں کو پانی پلاتے تھے اور قیدیوں کو رہائی دلاتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت حسنؒ، حضرت شعبیؒ اور امام قرظیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عباس اور طلحہ بن شیبہ کے بارے میں نازل ہوئی، اس لیے کہ ان سب نے فخر کا اظہار کیا تھا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں بیت اللہ کا متولی ہوں، اس کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں، اور اس کے غلاف کی ذمہ داری بھی میرے سپرد ہے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں اور پانی پلانے کی ذمہ داری میرے پاس ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہتے ہو؟ میں نے تمام لوگوں سے پہلے چار ماہ تک نمازیں پڑھی ہیں اور میں نے جہاد جیسا عمل سرانجام دیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور مرۃ الھمدانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا تم ہجرت نہیں کرتے؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا کر نہیں ملتے؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا میرا عمل ہجرت سے افضل نہیں ہے؟ کیا میں بیت اللہ کے حاجیوں کو پانی نہیں پلاتا ہوں؟ مسجدِ حرام کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتا ہوں؟ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ [آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۲۵۹، ۲۶۰]

تشریح

سورۂ توبہ کا آغاز اعلانِ برأت سے ہوا تھا جو مشرکینِ عرب کی اہانت اور تحقیر پر مبنی تھا، اس لیے مشرکینِ مکہ نے اپنی فضیلت ثابت کرنے کے لیے بڑے فخر و ناز سے یہ کہا

کہ ہم بہت سے نیک اعمال بجالاتے ہیں، ہم سب برأت اور بیزاری کیوں برتی گئی ہے، ہم حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اور انہیں پانی پلاتے ہیں اور مسجدِ حرام کی خدمت کرتے ہیں اور قریش اس قسم کے محاسن ذکر کرتے تھے اور ان پر اظہارِ فخر کرتے تھے، ان آیات میں ان کے فخر و ناز کا جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمہارے یہ سب اعمال بے روح اور بے جان ہیں، سب سے افضل عمل ایمان باللہ، ہجرت فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ ہے، ایمان باللہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق قائم اور استوار ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اپنے وطن اور عزیز و اقارب سے ہجرت کرنا اللہ تعالیٰ سے محبت کی دلیل اور علامت ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے اس کی وفاداری اور جانثاری کا تمغہ حاصل ہوتا ہے، حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی تعمیر کا عمل اگرچہ نیک اعمال میں سے ہے مگر اس کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا جائے، نیز نماز پڑھنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور دِل میں خوفِ خدا پیدا کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہے چونکہ قریشِ مکہ میں یہ اوصاف موجود نہیں اس لیے ان کے یہ اعمال ضائع اور رائیگاں گئے، اگر بالفرض ان کے اعمال کالعدم اور اکارت نہ بھی ہوں تو ایمان باللہ، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ اور نماز و زکوٰۃ کے برابر نہیں ہو سکتے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی تعمیر کی خدمت بجالانے کو اس شخص کے برابر کر دیا تو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا، جو تمام عبادات کی جڑ ہے اور جس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور اللہ کے کلمہ کو بلند کیا یہ دونوں فریق اللہ کے ہاں برابر نہیں اور اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، منزلِ مقصود کی راہ نہیں دکھاتے، یہ لوگ کفر اور شرک کر کے خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں نے خانہء کعبہ کی تعمیر اور حاجیوں کے پانی پلانے کو ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کے برابر سمجھ لیا، یہ غلط ہے، ہرگز برابر نہیں۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۳، ص ۲۹۸، ۲۹۹ ملخصاً]

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''مشرکینِ مکہ کو اس پر بڑا فخر و ناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے، اُنہیں پانی پلاتے، کھانا کپڑا دیتے اور مسجدِ حرام کی مرمت یا کسوۂ کعبہ یا تیل بتی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں، اگر مسلمان اپنے جہاد و ہجرت وغیرہ پر نازاں ہیں تو ہمارے پاس عبادات کا یہ ذخیرہ موجود ہے، (بلکہ) ایک زمانہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں اسی طرح کی بحث کی تھی (جیسا کہ شانِ نزول کی ذیل میں گزرا) یہاں جہاد کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر یا تو اس لیے کیا کہ مشرکین کے فخر و غرور کا جواب بھی ہو جائے کہ تمام عبادات کی روح ایمان باللہ ہے اس روح کے بدون پانی پلانا یا مسجدِ حرام کی خدمت کرنا محض مردہ عمل ہے، تو یہ بے جان اور 'مردہ عمل' ایک زندۂ جاوید عمل کی برابری کیسے کر سکتا ہے؟''وَ مَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ'' [فاطر، رکوع ۳] اور اگر صرف مومنین کے اعمال کا باہمی موازنہ کرنا ہے تو ایمان باللہ کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کی تمہید کے طور پر ہوگا، اصل مقصود جہاد وغیرہ عزائم اعمال کی افضلیت کو بیان فرمانا ہے، ایمان کے ذکر سے تنبیہ فرما دی کہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا کوئی عمل، ایمان کے بغیر ہیچ اور لاشے محض ہے، ان عزائم اعمال (جہاد و ہجرت وغیرہ) کا تقوم بھی ایمان باللہ سے ہوتا ہے اور اس نکتہ کو وہ ہی لوگ سمجھتے ہیں جو فہم سلیم رکھتے ہوں، ظالمین (بے موقع کام کرنے والوں) کی ان حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔ [فوائدِ عثمانی ص ۲۴۵ تا ۲۴۶ ملخصاً]

☆☆☆

(۳۱)

﴿تمام اشیاء کا خالق اللہ ہی ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ لَا يَمۡلِكُوۡنَ لِاَنۡفُسِهِمۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۚ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ﴾ [الرعد: ۱۶]

ترجمہ

''آپ پوچھیں کہ آسمان وزمین کا رب کون ہے؟ کہہ دو کہ اللہ، کہہ دو، کیا پھر تم نے اللہ کے سوا حمایتی پکڑے ہیں جو نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں، کہہ دو کہ کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا کیا اندھیرا اور اجالا برابر ہو سکتا ہے؟ یا انہوں نے اللہ کے لیے شریک ٹھہرائے کہ انہوں نے کچھ بنایا ہے جیسے اللہ نے بنایا ہے، پھر ان کی نظر میں پیدائش مشتبہ ہو گئی، کہہ دو کہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی اکیلا زبردست ہے۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے، مشرکین بھی اس کے قائل ہیں کہ زمین وآسمان کا رب اور مدبر اللہ ہی ہے، اس کے باوجود دوسرے اولیاء کی عبادت کرتے

ہیں، حالانکہ وہ سب عاجز اور بے بس بندے ہیں، وہ دوسروں کے کیا اپنے نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے، لہٰذا یہ اور اللہ کے عابد کیسے برابر ہو سکتے ہیں یہ تو اندھیروں میں گم ہیں اور رب کا بندہ نور اور اجالے میں ہے، جتنا فرق اندھے اور بینے میں اور اندھیروں اور اجالوں میں ہے اتنا ہی فرق ان دونوں میں ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ کیا ان مشرکین کے مقرر کردہ شریک، اللہ کے نزدیک کسی چیز کے خالق ہیں؟ یا پھر ان پر امتیاز کرنا مشکل اور مشتبہ ہو گیا کہ کس چیز کا خالق اللہ ہے؟ اور کس چیز کے خالق ان کے معبود ہیں؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور اس جیسا اور اس کے برابر کا کوئی نہیں ہے، اس کی مثل کوئی نہیں، وہ وزیر، شریک اور بیوی اور اولاد سب سے پاک ہے اور اس کی ذات عالی شان ہے، یہ تو مشرکین کی کامل حماقت اور بے وقوفی ہے کہ اپنے معبودوں کو خدا کی مخلوق اور مملوک جانتے ہوئے بھی ان کی پوجا پاٹ میں لگے ہوئے ہیں، لبیک پکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہم حاضر ہوئے، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک جو خود تیری ملکیت میں ہے اور جس چیز کا وہ مالک ہے وہ بھی درحقیقت تیری ہی ملکیت ہے، قرآنِ کریم نے ایک اور مقام پر ان کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: ''مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى'' یعنی ''ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

سورۂ مریم میں فرمایا کہ ''زمین وآسمان کی ساری مخلوق اللہ کے سامنے غلام بن کر آنے والی ہے، سب اس کی نگاہ میں اور اس کی گنتی میں ہیں اور ہر ایک تنہا تنہا اس کے سامنے قیامت کے روز حاضری دے گا۔''

پس جب سب بندے اور غلام ہونے کی حیثیت میں یکساں ہیں تو ایک کا دوسرے کی عبادت کرنا بڑی حماقت اور کھلی بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر اس نے رسولوں کا سلسلہ روزِ اول سے جاری رکھا، ہر ایک نے یہی سبق دیا کہ ایک اللہ ہی لائق عبادت ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، لیکن انہوں نے نہ اقرار کا پاس کیا، نہ رسولوں کی تعلیم کا لحاظ کیا، بلکہ ان کی مخالفت کی اور ان کو جھٹلایا تو ان پر کلمۂ عذاب

صادق آ گیا، پروردگار نے ان پر ظلم نہیں کیا۔[تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۴۱، ۴۲]

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ ''جب ربوبیت کا اقرار صرف خدا کے لیے کرتے ہو تو پھر مدد کے لیے دوسرے حمایتی کہاں سے تجویز کر لیے، حالانکہ وہ ذرا برابر نفع ونقصان کا مستقل اختیار نہیں رکھتے اور موحد ومشرک میں فرق ایسا ہے جیسے بینا اور نابینا میں اور توحید وشرک کا مقابلہ ایسا سمجھ جیسے نور کا ظلمت سے، تو کیا ایک اندھا مشرک جو شرک کی اندھیریوں میں پڑا ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو اس مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں ایک موحد کو پہنچنا ہے جو فہم وبصیرت اور ایمان وعرفان کی روشنی میں فطرتِ انسانی کے صاف راستہ پر چل رہا ہے؟ ہرگز دونوں ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے، اور جیسی مخلوقات خدا تعالیٰ نے پیدا کیا، کیا تمہارے دیوتاؤں نے ایسی کوئی چیز پیدا کی ہے جسے دیکھ کر ان پر خدائی کا شبہ ہونے لگے وہ تو ایک مکھی کا پَر اور ایک مچھر کی ٹانگ بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ تمام چیزوں کی طرح خود بھی اس اکیلے زبردست خدا کی مخلوق ہیں، پھر ایسی عاجز اور مجبور چیزوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا دینا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔[فوائدِ عثمانی ص ۳۲۵]

آیتِ مبارکہ میں ''اَعْمٰی'' سے مراد مشرک ہے جو دلائل واضح ہونے کے باوجود توحید کو نہیں مانتا اور ''بَصِیْرٌ'' سے مراد موحد ہے، اسی طرح ''ظُلُمٰتٌ'' سے کفر و شرک کے اندھیرے اور ''نُوْرٌ'' سے توحید کی روشنی مراد ہے۔

☆☆☆

(۳۲)

﴿اللہ کے مثل کوئی نہیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ ط اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۷۴]

ترجمہ

’’پس تم اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

تشریح

مشرک کہتے تھے کہ مالک اللہ ہی ہے، یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں، ہمارے کام ان ہی سے پڑتے ہیں، بڑی سرکار تک براہِ راست رسائی نہیں ہوسکتی، سو یہ مثال غلط ہے، جو بارگاہِ احدیت پر چسپاں نہیں، اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے، خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، کوئی کام کسی کو اس طرح سپرد نہیں کر رکھا جیسے سلاطینِ دنیا اپنے ماتحت حکام کو اختیارات تفویض کر دیتے ہیں کہ تفویض تو ارادہ و اختیار سے کیا لیکن بعد تفویض ان اختیارات کے استعمال میں ماتحت آزاد ہیں، کسی مجسٹریٹ کے فیصلہ کے وقت بادشاہ یا پارلیمنٹ کو اس واقعہ اور فیصلہ کی مطلق خبر نہیں ہوتی، نہ اس وقت جزئی طور پر بادشاہ کی مشیت وارادہ کو فیصلہ صادر کرنے میں قطعاً دخل ہے، یہ صورت حق تعالیٰ کے ہاں نہیں، بلکہ ہر ایک چھوٹا بڑا کام اور ادنیٰ سے ادنیٰ جزئی خواہ بواسطہ، اسباب یا بلاواسطہ اس کے علمِ محیط اور مشیت وارادہ سے وقوع پذیر ہوتی ہے، اسی سے لازم ہے کہ آدمی ہر کلی جزئی کا فاعل اور موثر حقیقی اعتقاد کر کے تنہا اسی کو معبود ومستعان سمجھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سلف سے "فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ" کا یہ مطلب منقول ہے کہ خدا کا مماثل کسی کو مت ٹھہراؤ۔ آگے فرمایا کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نہیں جانتے کہ خدا کے لیے کس طرح مثال پیش کرنی چاہیے جو اصل مطلب اور صحیح حقیقت کی تفہیم میں معین ہو اور اس کی عظمت ونزاہت کے خلاف شبہ پیدا نہ کرے۔ [فوائدِ عثمانی ص ۳۵۵، ۳۵۶]

حضرت شاہ عبدالقادر محدثِ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشرک کہتے تھے کہ مالک تو اللہ ہی ہے، یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں اس واسطے ان کو پوجتے ہیں کہ (بڑی سرکار تک ان کے ذریعہ ہماری رسائی ہو جائے) سو یہ مثال غلط ہے (اللہ پاک پر چسپاں نہیں) اللہ تعالیٰ ہر چیز آپ کرتا ہے کسی کے سپرد نہیں کر رکھا۔ [موضح القرآن]

مشرکین یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور ہم بلا واسطہ بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتے لہٰذا یہ ہمارے لیے وسائل و ذرائع ہیں، ہمیں خدا تعالیٰ کا مقرب بنا دیں گے جس طرح بادشاہ وزیروں کو مختار کار بنا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مثال غلط ہے، اللہ تعالیٰ پر چسپاں نہیں ہوتی۔

کارخانہء عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اس کے علم، مشیت اور ارادہ سے ہو رہا ہے اور وہ بلا واسطہ سب تمہاری سنتا ہے اور کسی کے خبر دیئے بغیر تمہارا سب حال جانتا ہے، بادشاہوں کو وزراء کی اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں پیٹھ پیچھے کی خبر نہیں اور وہ سارے کام خود سر انجام نہیں دے سکتے، اس لیے وہ معین و مددگار کے محتاج ہوتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر اور مالک وقدیر ہے، وہ غنی اور بے نیاز ہے، اسے کسی وزیر اور مشیر کی ہرگز ضرورت نہیں اور نہ اس کے کارخانہء ربوبیت میں کوئی دخیل اور شریک وسہیم ہے اور نہ وہاں کسی کا کوئی زور ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ معلوم ہوا کہ جو مثال تم نے بیان کی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۴، ص ۲۳۴، ۲۳۵، ملخصاً]

نیز اللہ تعالیٰ کی مثال بیان کرنے کی ممانعت اس وجہ سے فرمائی کہ ضرب المثل

نام ہے ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینے کا اور اللہ کی ذات وصفات کا کسی کو کامل علم نہیں، نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ کون کون سی صفات کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر درست ہے اور کن کن صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا متصف ہونا محال ہے، ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کو کسی چیز پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے، غائب کو حاضر کے سانچہ میں ڈال کس طرح زیبا اور مناسب ہے، حالانکہ دونوں میں کوئی علتِ جامعہ اور وصفِ مشترک موجود نہیں ہے اور "اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حقائق اشیاء سے خوب واقف ہے اور تم ناواقف ہو یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جو اللہ کی مثالیں بیان کرتے ہو اور قیاس آرائیاں کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کی غلطی کا علم رکھتے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ تمہاری بیان کردہ تمثیلات فاسد ہیں اور تم اس کا علم نہیں رکھتے، اگر تم کو اپنے قول کی غلطی کا علم ہوتا تو تم تمثیلات بیان کرنے کی جسارت اور جرأت ہی نہ کرتے۔

[تفسیر مظهری ج ٦، ص ٣١٦]

☆☆☆

(۴۴)

﴿ابطالِ شرک کی دومثالیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِیْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

[النحل: ۷۵۔۷۶]

ترجمہ

''اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان کرتا ہے (فرض کرو) ایک شخص تو غلام ہے جو کسی کا مملوک ہے خود کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا اور ایک وہ شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے سو وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں ساری تعریفیں اللہ کے لائق ہیں اور اللہ ایک (اور) مثال بیان کرتا ہے، دو آدمی ہیں، ایک تو ان میں گونگا، جو کوئی کام نہیں کر سکتا، اپنے سرپرست کے لیے وبالِ جان ہے، اس کو جہاں بھی بھیجتا ہے کوئی کام ٹھیک کر کے نہیں لاتا، کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں، جو اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستہ پر چلتا ہو۔''

شانِ نزول

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت، ہشام بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی جو پوشیدہ اور علانیہ طور پر اپنا مال خرچ کرتا تھا اور ان کے مولیٰ ابو الجوزاء نے ان کو منع کیا تو یہ آیت نازل ہوئی: ''وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَا اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ'' اس میں ''اَبْكَم'' اور ''كَلٌّ'' سے مراد سید اسد بن ابی العیص ہے اور ''وَالَّذِیْ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'' سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ [آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۲۹۸]

تشریح

اللہ تعالیٰ نے شرک کے بطلان کو ظاہر کرنے کے لیے ایک مثال بیان فرمائی کہ فرض کرو کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کا مملوک ہے اور ایسا غلام ہے کہ وہ کسی تصرف پر قادر نہیں، کیونکہ بعض غلام ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو آقا تصرفات کی اجازت دے دیتا ہے جیسے عبدِ ماذون اور مکاتب کہ آقا اسے نوشتہ دے دیتا ہے کہ اتنا روپیہ کما کر دے دو تم آزاد ہو، پس ان کو کچھ تصرف کی اجازت ہوتی ہے اور ایک تو ایسا ہے کہ عبدِ مملوک ہے، کسی تصرف پر قدرت نہیں رکھتا اور ایک شخص وہ ہے کہ جس کو ہم نے اپنے پاس سے اور اپنے فضل وعنایت سے عمدہ روزی دی، یعنی اس کو وسعت اور کثرت سے رزق دیا جو لوگوں کی نظروں میں اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس کو اس کا مالک اور مختار بنایا، پس وہ شخص ہمارے دیئے ہوئے عمدہ رزق میں سے خیرات کی راہوں اور طرح طرح کی نیکیوں میں پوشیدہ اور علانیہ طور پر خرچ کرتا ہے یعنی جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اور کسی سے ڈرتا نہیں، کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی بے اختیار شخص، صاحبِ اختیار آقا کے برابر نہیں ہو سکتا، پس بت تو مخلوق میں سب سے زیادہ عاجز اور بے بس ہیں، وہ قادرِ مطلق ذات کے کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟!

اس مثال سے اصل مقصود یہ ہے کہ جب مالک مجازی اور مملوک برابر نہیں ہو سکتے تو مالکِ حقیقی اور مملوکِ حقیقی کیسے برابر ہو سکتے ہیں، حالانکہ آقا اور غلام تو نفسِ خلقت

اور صورتِ بشری میں دونوں برابر ہیں مگر اس کے باوجود دونوں برابر نہیں تو اللہ تعالیٰ جو کہ قادرِ مطلق اور مالکِ مطلق ہے اس میں اور بتوں کے درمیان برابری کیسے ہو سکتی ہے جو نہ کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ کسی چیز پر قادر ہیں اور دنیا کا کوئی شخص جس میں ادنیٰ درجہ کی عقل ہو قادر اور عاجز کے درمیان مساوات کا قائل نہیں ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر کی مثال ہے، کافر عبد مملوک ہے جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی توفیق سے محروم ہے اور اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو گویا وہ ایک حقیر و ذلیل غلام ہے اور عاجز ہے کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ نے اسے تصرف سے روک رکھا ہے، اور مومن وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے رزقِ حسن اور حلال رزق عطا کیا اور وہ دن و رات اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی میں مصروف ہے اور اپنے مال کو اللہ کی راہ میں پوشیدہ اور علانیہ طور پر جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے پس یہ دونوں شخص برابر نہیں ہیں، نہ آزاد اور غلام برابر ہیں اور نہ بخیل اور سخی برابر ہے اور نہ نافرمان اور فرماں بردار برابر ہے۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو سب کا خالق اور ساری کائنات کا مالکِ مطلق اور مختارِ مطلق ہے اور ساری کائنات اس کی مملوک اور غلام ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اللہ کے شکر گزار نہیں ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نادان اور بے عقل ہیں کہ واضح بات کو بھی نہیں سمجھتے اور ان تمام تر باتوں کے باوجود بتوں کو لائق عبادت خیال کرتے ہیں۔ اور اگر اس مثال سے ان پر حق بات واضح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے ایک دوسری مثال بیان کرتے ہیں کہ فرض کرو دو شخص ہیں، ان میں سے ایک تو گونگا غلام ہے اور بہرا بھی ہے، کیونکہ پیدائشی گونگا، بہرہ بھی ہوتا ہے، وہ کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے آقا پر بوجھ ہے، یعنی وہ نکما ہے، کسی کام کا نہیں اور نہ اس سے کسی بھلائی کی توقع ہے، وہ آقا اس کو جہاں بھیجے وہاں سے کوئی خیر اور بھلائی لے کر واپس نہ آئے، کیا ایسا منحوس غلام اس مبارک شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم کرتا ہے اور خود بھی سیدھے راستہ پر ہے۔ یعنی وہ درست ہوش و حواس کا حامل ہے۔ عقلمند، دیانت

دار اور نیک کردار ہے کیونکہ جو شخص خود صاحبِ فہم و فراست نہ ہو وہ دوسروں کو انصاف اور نیکی کی راہ کیسے دکھا سکتا ہے، پس جب یہ دونوں شخص برابر نہیں ہو سکتے تو یہ گونگے اور بہرے بت، پروردگارِ عالم کے کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر کی مثال ہے، کافر اندھے، بہرے اور گونگے غلام کی طرح ہے جو نہ حق کو دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے اور بالکل نکما اور ناکارہ ہے کہ اپنے آقا کا کوئی کام نہیں کرتا۔ اور مومن سیدھے راستہ پر گامزن ہے اور دوسروں کو بھی اس راستہ پر لے جانا چاہتا ہے۔ یہ دونوں شخص کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدّثِ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یعنی خدا کے دو بندے ایک بہت نکما نہ ہل سکے اور نہ چل سکے جیسے گونگا غلام، دوسرا رسول ہے جو اللہ کی راہ بتادے ہزاروں کو اور بندگی پر قائم ہے اس کے تابع ہونا بہتر ہے یا اس کے'' (انتہیٰ)

[موضح القرآن]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حاصل ایں دو مثل آنست کہ آں چہ در عالم تصرف ندارد با خدا برابر نیست چنانکہ مملوک ناتواں با مالک توانا برابر نیست و چناں کہ گنگ بے تمیز با صاحبِ ہدایت برابر نیست'' (انتہیٰ) [فتح الرحمن]

[ماخوذ از معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۴، ص ۲۳۵ تا ص ۲۳۶]

سوال:

آیتِ مذکورہ میں ''عَبْدًا'' کے بعد ''مَمْلُوْكًا'' لانے اور ''مَمْلُوْكًا'' کے بعد ''لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ'' لانے کا کیا فائدہ ہے، کیونکہ عبد (غلام) تو ہوتا ہی مملوک ہے اور مملوک کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا؟

جواب:

لفظِ عبد، غلام اور آزاد دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، اس لیے کہ آزاد اور غلام دونوں اللہ تعالیٰ کے عبید (بندے) ہیں، لہٰذا ''عَبْدًا'' کے بعد ''مَمْلُوْكًا'' لانا آزاد سے ممتاز کرنے کے لیے ہے اور ''مَمْلُوْكًا'' کے بعد ''لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ'' لانا عبدِ

ماذون اور مکاتب سے احتراز کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ عبدِ ماذون اور مکاتب مستقل تصرف پر قادر ہوتے ہیں۔

سوال:

مذکورہ آیت میں جس کو بطورِ مثال بیان کیا گیا ہے وہ دو ہیں، ایک مملوک، دوسرا وہ شخص جس کو رزقِ حسن عطا کیا گیا، لہٰذا قاعدہ کی رو سے تثنیہ کا صیغہ "هَلْ يَسْتَوِيَانِ" ہونا چاہیے، جب کہ آیت میں جمع کا صیغہ "هَلْ يَسْتَوُونَ" ہے؟

جوابِ اول:

آیت میں معیّن مالک اور معیّن مملوک مراد نہیں ہے بلکہ جنسِ مالکین اور جنسِ مملوکین مراد ہے۔

جوابِ ثانی:

دو اشخاص کو جماعت کے حکم میں قرار دیا گیا ہے۔ کلامِ عرب میں ایسا ہوا کرتا ہے۔

جوابِ ثالث:

"مَنْ رَزَقْنَا" میں لفظ "مَنْ" جمع کے معنی میں ہے، اس لیے "يَسْتَوُونَ" بصیغۂ جمع لایا گیا۔ [نکات القرآن ص ۲۱۵]

☆☆☆

(۳۴)

عہد شکنی کی ممانعت

آیتِ کریمہ:

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًاؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖؕ وَ لَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ [النحل: ۹۲]

ترجمہ

''اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد ریزہ ریزہ کر کے نوچ ڈالا، تم بھی اپنی قسموں کو آپس میں فریب ڈالنے کے ذریعہ بنانے لگو محض اس وجہ سے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے، پس اس سے اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرتا ہے اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے قیامت کے دن ان سب کو تمہارے سامنے ظاہر کر دے گا۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عہد شکنی کر کے تم اس عورت کی مانند نہ بنو جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد توڑ ڈالا اور بوٹی بوٹی کر کے اس کو نوچ ڈالا۔ قریش میں ایک عورت تھی جس کا نام ریطہ تھا، وہ بڑی احمق اور بے وقوف تھی، صبح سے لے کر دوپہر تک خود بھی سوت کاتتی اور اپنی لڑکیوں سے بھی کتواتی، جب دوپہر کا وقت ہو جاتا تو وہ عورت اپنی لڑکیوں کو کہتی کہ تم نے جتنا سوت کاتا ہے سب توڑ ڈالو، وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتی تھی۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ محض تمثیل ہے، کسی (خاص) عورت کی طرف اشارہ نہیں ہے، بلکہ اس سے صرف مثال لینا مقصود ہے کہ عہد شکنی ایسی ہی ہے جیسے سوت کات کر اس کو توڑ ڈالنا۔ اللہ تعالیٰ نے سوت کے توڑنے کو دھاگہ توڑنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ نصیحت فرمائی ہے کہ جس طرح وہ بے وقوف عورت اپنے دھاگے کو توڑ دیتی تھی تم بھی اس کی طرح اپنے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد اسے نہ توڑو۔ اس کے بعد فرمایا کہ کیا تم اپنی قسموں کو آپس میں دھوکہ فریب اور دغل کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو؟ کہ تمہاری قسم سے مطمئن ہو کر دوسرا دھوکہ کھا جائے اور تمہارا یہ قَسم کھانا صرف اس بناء پر ہے کہ ایک گروہ مال دولت اور عددی کثرت میں دوسرے گروہ سے بڑھا ہوا ہے۔ عرب کے لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم کے ساتھ عہد و پیمان کر لیتے اور وہ قوم ان کی طرف سے مطمئن ہو جاتی، پھر جب دوسری قوم کو مال و دولت اور قوت و کثرت میں ان سے زیادہ دیکھتے تو ان سے عہد کر لیتے اور کمزور قوم سے عہد توڑ دیتے اور حیلے بہانے بنا کر ان سے عذر کر لیتے، جیسا کہ آج کل بھی مغربی اقوام کا شیوہ بنا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عہد شکنی سے منع کیا ہے اور ایفائے عہد کا حکم دیا ہے۔ آگے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس حکم سے تمہیں آزماتا ہے کہ دیکھیں کہ عہد پورا کرتے ہیں یا جو قوت و کثرت میں زیادہ ہے اس کی طرف جھکتے ہیں، اور بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس چیز کی حقیقت کو ظاہر کر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ تم نے عہد شکنی کرتے وقت یہ خیال کیا کہ جو جماعت زبردست اور کثیر التعداد ہے اس کے ساتھ شامل ہونے میں عزت ہے، خوب سمجھ لو کہ یہ عزت نہیں بلکہ ذلت ہے اور دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کا ذریعہ ہے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمہاری اس عہد شکنی کی حقیقت کو آشکار کر دے گا اور سب کے سامنے تمہیں رسوا کرے گا۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ، ج ۴، ص ۲۴۸، ۲۴۹]

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بکر بن ابی حفص رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ (مکہ کی ایک عورت) سعیدہ اسدیہ پاگل تھی، بال اور کھجور کی چھال کے ریشے جمع کرتی تھی، اس

کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ریطہ بنت عمر بن سعد بن کعب بن زید بن مناۃ بن تمیم ایک بے وقوف عورت تھی، اس کا لقب جعر تھا، اس کے دماغ میں کچھ خلل تھا۔ اس نے ایک چرخہ ہاتھ بھر کا اور اس میں ایک میخ انگل بھر کی اور مرکز بہت بڑا بنا رکھا تھا، وہ اُون، روئیں اور بالوں کی کتائی کرتی تھی اور اپنی باندیوں سے بھی کتواتی تھی، سب مل کر دوپہر تک کاتتی تھیں، دوپہر کو سب کا کاتا ہوا دھاگہ کھول ڈالتی تھی اور ریزہ ریزہ کر دیتی تھی، اس کا روزانہ کا یہی معمول تھا۔ اس پسِ منظر میں اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ عورت جو کاتنے کا کام مسلسل اور برابر کرتی تھی، کاتنا ترک نہیں کرتی تھی اور کاتنے کے بعد گتے ہوئے سوت کو توڑنے سے بھی باز نہیں آتی تھی تم اس کی طرح نہ ہو جاؤ یا تو کسی سے عہد و پیمان ہی نہ کرو اور اگر کرو تو اس عہد کو پورا کرو، ہر بار معاہدہ کر کے اس کو نہ توڑو۔ اور "تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ الخ" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کمزور لوگوں سے عہد شکنی کر کے طاقتور لوگوں سے تم معاہدہ کر لیتے ہو، محض اس بناء پر کہ تم کو قوت اور غلبہ حاصل ہو جائے، ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قَسموں کو فساد کا ذریعہ صرف اس وجہ سے بنا لیتے ہو کہ تمہارا ایک گروہ دوسرے ہم معاہدہ گروہ سے تعداد اور مال میں زیادہ ہوتا ہے، اس لیے طاقتور گروہ کو معاہدہ شکنی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، جس طرح قریش نے حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں سے دس سال تک جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا تھا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی جماعت سے قریش کی تعداد زیادہ ہے اور مالی طاقت بھی ان سے بڑھ کر ہے، اس لیے دو ہی سال میں معاہدہ توڑ دیا۔

اور "اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے برتر کر کے اللہ تعالیٰ آزمائش کرتا ہے کہ یہ گروہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد و پیمان اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں یا پھر مسلمانوں کی

قلت اور قریش کی کثرت اور شان وشوکت دیکھ کر اس عہد کو توڑ دیتے ہیں، اور دنیا میں ہونے والے اختلافی امور کا فیصلہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کریں گے اور ہر ایک کو اعمال کا بدلہ ملے گا تو جن لوگوں نے عہد و پیمان کو پورا کیا ہوگا ان کو اجر وثواب اور جن لوگوں نے عہد شکنی کی ہوئی ان کو عذاب وسزا دے کر ساری حقیقت واضح کر دی جائے گی۔

[تفسیر مظہری ج ۶، ص ۴۲۸، ۴۲۹]

☆☆☆

(۳۵)

﴿کفرانِ نعمت، نزولِ آفات کا سبب ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾

[النحل: ۱۱۲]

ترجمہ

''اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی عجیب حالت بیان فرماتا ہے کہ وہ بڑے امن اور اطمینان سے رہتے تھے، ان کے کھانے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں، پس انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی، اس پر اللہ نے ان کو ان کے حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔''

تشریح

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات دنیا میں بھی کفر و نافرمانی اور کفرانِ نعمت پر طرح طرح کی آفات اور مصائب نازل ہوئی ہیں، جیسے قحط سالی، عام وبا، اور بسا اوقات کفر اور کفرانِ نعمت دنیا ہی میں زوال کا ذریعہ بن جاتا ہے، جیسا کہ اہلِ مکہ سات سال تک شدید قسم کے قحط میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ وہ مردہ جانوروں کی ہڈیاں کھانے لگے اور ناتوانی اور کمزوری سے چلنا پھرنا مشکل ہوگیا، بالآخر مجبور ہو کر سردارانِ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

کی برکت سے مصیبت دور ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفرانِ نعمت کے وبال پر تنبیہ کرنے کے لیے ایک بستی کی مثال بیان کی کہ وہ بستی امن وامان والی تھی، یعنی اس بستی کے لوگ آسودہ حال تھے اور انہیں کسی کی لوٹ مار اور غارت گری کا اندیشہ نہ تھا۔ اس بستی میں رہنے والے لوگوں کا رزق فراغت اور کثرت کے ساتھ تمام جوانب و اطراف سے آتا تھا، پس اس بستی والوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کو بھوک اور خوف کا لباس چکھایا۔ یعنی امن وامان کی جگہ خوف وہراس نے انہیں گھیر لیا اور رزق کی وسعت اور کثرت کی بجائے قحط اور بھوک نے آ پکڑا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خوف اور بھوک کا مزہ بھی خوب چکھایا اور اس بھوک اور خوف نے ان کو ہر جانب سے پکڑ لیا جیسے کپڑا اپنے پہننے والے کے بدن کو گھیر لیتا ہے، اس کی سزا میں جو وہ کرتے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ان کو بھوک اور خوف کا لباس چکھایا یہ اصل میں ان کے اعمال کی سزا ہے کہ انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کی۔ مذکورہ آیت میں "قَرْيَةً" کی تفسیر میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ اس سے کوئی معیّن قریہ مراد ہے یعنی مکہ مکرمہ مراد ہے، جہاں کے باشندے مسلسل سات سال تک قحط میں مبتلا رہے اور اطراف و جوانب سے جو غلہ آتا تھا اس کا آنا بند ہو گیا، یہاں تک کہ انہوں نے جلی ہوئی ہڈیوں اور مردار کتوں کو کھایا۔ اور سابقہ امن و اطمینان ختم ہو گیا، ہر وقت خوف کی حالت میں رہنے لگے، اللہ تعالیٰ نے تمثیل کے طور پر اہلِ مکہ کی حالت بیان فرمائی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "قَرْيَةً" سے کوئی معین بستی مراد نہیں ہے، جیسا کہ "قَرْيَةً" کے نکرہ لانے سے اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۴ ص ۲۵۸، ۲۵۹]

ابو الفداء حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ آیتِ مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس سے مراد اہلِ مکہ ہیں جو امن و اطمینان کی حالت میں تھے، گرد و پیش میں لڑائیاں ہوتیں، کوئی کسی کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھتا تھا، لیکن مکہ معظّمہ میں آ کر خود کو امن و امان میں سمجھتا تھا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے کہ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم ہدایت کی پیروی کریں گے تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے، کیا ہم نے انہیں امن و امان

کا حرم نہیں دے رکھا؟ جہاں ہمارے دیئے ہوئے رزق، قسم قسم کے پھلوں کی شکل میں ان کے پاس چاروں طرف سے کھنچے چلے آتے ہیں۔'' یہاں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ عمدہ رزق ان کے پاس ہر طرف سے آرہا تھا لیکن پھر انہوں نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا، جن میں سب سے اعلیٰ نعمت، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارک تھی، جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا الخ'' یعنی کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت تک پہنچا دیا جو جہنم ہے جس میں یہ لوگ داخل ہوں گے جو برا ٹھکانہ ہے۔'' یہ ان کی اس سرکشی کی سزا میں دونوں نعمتیں دو زحمتوں سے بدل گئیں۔ امن، خوف سے، اطمینان، بھوک اور گھبراہٹ سے بدل گیا۔ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لیے سات قحط سالیوں کی بددعا کی، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں قحط سال پیش آئی، اس قحط سالی میں انہوں نے اونٹ کے خون میں لتھڑے ہوئے بال تک کھائے، چنانچہ امن کے بعد خوف پیدا ہوا، ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے لشکر سے خوف زدہ ہونے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روز بروز ترقی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر کی کثرت کا سن کر سہمے جاتے تھے، یہاں تک کہ بالآخر اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہرِ مکہ پر چڑھائی کی اور اسے فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔

اس نکتہ کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ جس طرح کفر کی وجہ سے امن کے بعد خوف اور فراخی کے بعد بھوک آئی، اسی طرح ایمان کی بدولت خوف کے بعد امن اور بھوک کے بعد حکومت، امارت، امامت اور سروری نصیب ہوئی۔

سلیم بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حج سے واپس آرہے تھے، اس وقت مدینہ منورہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (گھر میں) محصور تھے، ام المؤمنینؓ اکثر راہ گزروں سے ان کے متعلق دریافت کیا کرتی تھیں، دو سواروں کو جاتے ہوئے دیکھا تو آدمی بھیجا کہ ان سے خلیفہء رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال دریافت کرو، انہوں نے خبر دی کہ افسوس! آپ شہید کر دیئے گئے۔ اس وقت فرمایا

کہ اللہ کی قسم! یہی وہ شہید ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً قَرْیَۃً الخ" [تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۱۵۸]

علمی نکتہ:

اس آیت مبارکہ: "فَاَذَا قَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ" میں یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کو بھوک اور خوف کا لباس چکھایا، یوں نہیں فرمایا کہ ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنایا، حالانکہ لباس تو پہنایا جاتا ہے، چکھایا نہیں جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت درحقیقت دو استعاروں کو شامل ہے۔ ایک لحاظ سے جوع اور خوف کی حالت ذوقی اشیاء کے مشابہ ہے کہ جب انسان کسی چیز کو دیکھ چکھ لیتا ہے تو اس کا ادراک اور احساس مکمل ہو جاتا ہے دیکھنے اور چھونے پورا احساس نہیں ہوتا، لہٰذا آیت میں چکھانے کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ ان کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھا کر بتا دیا کہ بھوک اور خوف ایسی چیز ہے، یہ تو دنیا میں مصیبت کے مزہ چکھانے کا ذکر ہوا، بھوک اور خوف کا اصل کھانا تو جہنم میں ملے گا، کھانے کو زقوم اور پینے کو غسلین اور حمیم (کھولتا ہوا پانی) ملے گا۔ کھانا اور پینا چونکہ انسان کے اندر پہنچتا ہے اور اندر ہی اندر اس کا اثر ظاہر ہوتا رہتا ہے، اور لباس ایک ظاہری چیز ہے، اس لیے بھوک اور خوف کا اندرونی اثر بیان کرنے کے لیے چکھانے کا لفظ استعارہ کے طور پر استعمال کیا اور ظاہری اثر بیان کرنے کے لیے لباس کا لفظ استعارہ کے طور پر استعمال کیا۔ بھوک اور خوف کے لیے لباس کا استعارہ اس لیے کیا کہ جس طرح لباس آدمی کو ہر طرف سے گھیر لیتا ہے اسی طرح بھوک اور خوف نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا اور پوری طرح اپنے اندر چھپا لیا اور چونکہ لباس ایک ظاہری چیز ہے جو ظاہر میں نظر آتا ہے اسی طرح بھوک اور خوف کا اثر ان کے ظاہر سے نظر آتا ہے کہ چہرے زرد پڑ گئے تھے اور بدن دبلے اور لاغر ہو گئے تھے، اور اس ظاہری نعمت کے علاوہ ایک عظیم الشان نعمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارک ہے، ان لوگوں نے اس نعمتِ عظمیٰ کی بھی ناقدری اور ناشکری کی۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۴، ص ۲۵۹]

☆☆☆

(۳۶)

بنی اسرائیل کے دو بھائیوں کی مثال

آیتِ کریمہ:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلاً رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا o كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا لا وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا o وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ج فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالاً وَّ اَعَزُّ نَفَرًاo وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًاo وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً لا وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًاo قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلاًo لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًاo وَ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ لا لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ج اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالاً وَّ وَلَدًاo فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًاo اَوْ يُصْبِحَ مَآ ؤُهَآ غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًاo وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًاo وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًاo هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ط هُوَ

خَيْرٌ ثَوَابًا وَ خَيْرٌ عُقُبًا﴾ [الکھف: ۳۲۔ ۴۴]

ترجمہ

''اور آپ ان لوگوں سے دو شخصوں کا حال بیان کیجئے، ان دو شخصوں میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگور کے دے رکھے تھے اور ان دونوں (باغوں) کا کھجور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ان دونوں کے درمیان کھیتی بھی لگا رکھی تھی، دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی اور ان دونوں کے درمیان میں نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس اور بھی تموّل کا سامان تھا سو (ایک بار) اپنے اس (دوسرے) ملاقاتی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور مجمع بھی میرا زبردست ہے، اور وہ اپنے اوپر جُرم (کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں پہنچا، (اور) کہنے لگا کہ میرا خیال نہیں ہے کہ یہ باغ (میری مدتِ حیات میں) کبھی بھی برباد ہو اور میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آئے گی اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچایا گیا تو ضرور اس باغ سے بہت زیادہ اچھی جگہ مجھے ملے گی، اس کے ملاقاتی نے اس سے کہا کہ (جو کہ دیندار اور غریب تھا) جواب کے طور پر کہا کیا تو اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو (اول) مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر تجھ کو صحیح و سالم آدمی بنایا، لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ یعنی اللہ تعالیٰ میرا رب (حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا اور تو جس وقت اپنے باغ میں پہنچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اور خدا کی مدد کے بغیر (کسی میں) کوئی قوت نہیں، اگر تو مجھ کو مال اور اولاد میں کمتر دیکھتا

ہے تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دے دے اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تقدیری آفت آسمان سے بھیج دے جس سے وہ باغ یکا یک ایک صاف میدان ہو کر رہ جائے، اس سے اس کا پانی بالکل اندر (زمین میں) اتر کر خشک ہو جائے پھر تو اس کی کوشش بھی نہ کر پائے، اور اس شخص کے سامانِ تموّل کو آفت نے آگھیرا پھر اس نے جو کچھ اس باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی چھتریوں پر گرا ہوا پڑا تھا اور کہنے لگا کہ کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا اور اس کے پاس کوئی ایسا مجمع نہ ہوا کہ خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود (ہم سے) بدلہ لے سکا، ایسے موقع پر مدد کرنا اللہ برحق ہی کا کام ہے، اسی کا ثواب سب سے اچھا اور اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے۔"

تشریح

گزشتہ آیات میں کفار و مشرکین کی اس درخواست کو مسترد فرمایا جو اپنے مال و دولت کے نشہ میں چور تھے اور غریب و فقیر مسلمانوں کو حقیر اور کمتر خیال کرتے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے میں عار محسوس کرتے تھے اور اپنے مال و دولت پر فخر کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے تھے کہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا کریں تو آپ ان ناداروں اور فقیروں کو اپنے پاس سے ہٹا دیا کریں۔ اب ان آیاتِ کریمہ میں ان متکبرین کے سنانے کے لیے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری بتانے کے لیے بنی اسرائیل کے دو بھائیوں کی ایک مثال ذکر کرتے ہیں، جن میں سے ایک مال دار اور کافر تھا اور آخرت کا منکر تھا اور اپنے مال و دولت پر بڑا نازاں اور مغرور تھا اور دوسرا ایک مومن اور نادار درویش تھا، مالدار کافر مال و دولت کے نشہ میں سلسلہء عالم کو قدیم سمجھتا تھا اور آخرت کا منکر تھا اور درویش مسلمان بھائی اسے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی تلقین کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ

عالَم قدیم نہیں ہے اور کارخانہء عالَم کی باگ ڈور اس پروردگار کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، اصل عزت اور دولت اس پروردگارِ عالم کی عبادت و اطاعت میں ہے جو فقراءِ مسلمین کو حاصل ہے اور تو اس عزت وشرف سے محروم ہے۔ یہ درویش بھائی اپنے دولت مند بھائی کو ڈراتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلا و آفت نازل ہو جائے، چنانچہ اس پر اچانک ایک آسمانی آفت نازل ہوئی جس سے آن کی آن میں وہ سارا باغ اُجڑ گیا اور باغ کا مالک کفِ افسوس ملتا رہ گیا، تب اس کی آنکھ کھلی کہ اللہ ہی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ ایک طالبِ دُنیا اور ایک طالبِ آخرت کا قصہ بیان فرماتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ مال و دولت کی کثرت اور انصار و مددگاروں کی قوت قابلِ فخر چیز نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ دم کے دم میں مال دار فقیر ہو جائے اور فقیر، مال دار ہو جائے، قابلِ فخر چیز تو ایمان اور نیک اعمال اور تقویٰ و پرہیز گاری ہے، یہ دنیا تو چند روزہ ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے نبی ﷺ! دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری ظاہر کرنے کے لیے دو شخصوں کا قصہ بیان کرو، وہ دو آدمی تھے، آپس میں بھائی بھائی تھے، ان میں سے ایک کو جو کافر تھا، ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے اور ان دونوں باغوں کو ہم نے کھجوروں کے درختوں سے گھیر دیا تھا، یعنی ان کے چاروں طرف کھجوروں کے درخت تھے، اور ان دونوں باغوں کے درمیان ہم نے کھیتی بھی بنا دی تھی۔ جس سے قوتِ روزینہ ان کو حاصل ہوتی تھی یعنی اس میں کوئی جگہ خالی نہ تھی، تمام زمین سے قِسم قِسم کی پیداوار تھی، دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور باغ کی پیداوار میں ذرا برابر کمی نہ تھی اور ہم نے ان دونوں باغوں کے درمیان نہر جاری کر دی تھی، جس کا پانی کبھی منقطع نہیں ہوتا تھا اور وہ نہر دونوں باغوں کو ہمیشہ سیراب کرتی اور اس پیداوار کے علاوہ اس شخص کے لیے اور بھی قِسم قِسم کے پھل تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ثمر سے مراد مال و دولت ہے، یعنی ان دو باغوں کے علاوہ بھی اس کے پاس طرح طرح کی دولت تھی

یعنی سونا اور چاندی وغیرہ تھا، پس یہ مال دار کافر اپنے ساتھی یعنی مومن بھائی سے جو فقیر و نادار تھا، بولا دراں حالیکہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا، یعنی یہ کہتا جاتا تھا اور وہ اسے جواب دیتا جاتا تھا، دونوں میں باہم گفتگو ہو رہی تھی، اثنائے گفتگو میں اس کافر بھائی نے ازراہِ فخر کہا کہ میں تجھ سے مال میں بڑھا ہوا ہوں اور حشم و خدم کے لحاظ سے زیادہ عزت و شرف والا ہوں، پھر یہ مالدار کافر اپنے غریب مومن ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے باغات اور ان کی پیداوار اور اپنا مال و دولت اسے دکھاتا تھا اور فخر کرتا جاتا تھا اور اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے باغ میں داخل ہوا، دراں حالیکہ وہ اپنے کفر اور فخر کے سبب اپنی جان پر ظلم کر رہا تھا، فخر، خود پسندی اور دنیا کی محبت کے سبب مومن بھائی نے اس کو فخر اور کفرانِ نعمت کے انجام سے ڈرایا مگر اس نے ایک نہ سنی اور بولا کہ میں گمان نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی اجڑے گا، کفار کا ہمیشہ یہی خیال و گمان ہوا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ عیش و آرام میں رہیں گے اور بولا کہ میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر بالفرض والمحال تیری اعتقاد کے مطابق میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی گیا تو اس سے بہتر جگہ میں وہاں پاؤں گا، کیونکہ میری یہ مالداری اس بات کی دلیل ہے کہ میری شان اسی لائق ہے کہ مجھے یہ مال و دولت ملے اور میرا رب مجھ سے راضی ہے، جب اس نے مجھے یہاں دیا ہے تو وہاں بھی ضرور دے گا بلکہ اس سے بہتر دے گا، اکثر کفار اور مالداروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت، عیش و عشرت اور دنیاوی عزت و شرف کو عند اللہ اپنے مقبول و مکرم ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں، یہ کافروں کا حال ہے، بہت سے مال دار مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے، بزبانِ حال وہ بھی یہی کہتے ہیں، اور عملی طور پر فقراء اور غرباء کے ساتھ بیٹھنے کو اپنے لیے باعث عار سمجھتے ہیں۔ (اس کے بعد فرمایا کہ) اس کی یہ باتیں سن کر اس سے اس کے دیندار ساتھی نے دورانِ گفتگو کہا کہ کیا تو اس خدا کی قدرت کا منکر ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے نکالا، جب کہ تو مُردہ بدستِ زندہ تھا اور کسی چیز کا مالک نہیں تھا، اور دایہ کی گود میں پرورش پا رہا تھا، پھر اس خدا نے اپنی قدرت سے تجھے کامل مرد بنا دیا اب تجھے اس خدا کی قدرت میں شکی ہو گیا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا اور مر کر مٹی ہو جاؤں گا تو وہ

مجھے دوبارہ کیسے پیدا کرے گا؟! جس خدا نے تجھے پہلی بار مٹی سے پیدا کیا وہی خدا تجھے دوبارہ مٹی سے پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، بھلا ایسے قادرِ مطلق کے لیے قیامت برپا کرنا کیا مشکل ہے؟ خیر تو مان یا نہ مان، لیکن میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ وہ ہی اللہ میرا پروردگار ہے، یہی میرے دل میں ہے اور یہی میری زبان پر ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا، نہ اعتقاد میں، نہ قول میں اور نہ فعل میں۔ اس کے اس جواب سے اللہ تعالیٰ کی الوھیت اور وحدانیت ثابت ہوتی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو یہ کہا ہوتا کہ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے بغیر کسی میں کوئی قوت اور زور نہیں۔ یعنی اپنے باغ کو دیکھ کر تجھے چاہیے تھا کہ تو اپنی عاجزی کا اقرار کرتا اور دل و جان سے یہ کہا ہوتا کہ یہ سب باغ و بہار، اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے فضل وکرم کی وجہ سے ہے، وہ چاہے تو اس کو آباد رکھے اور چاہے تو اس کو برباد کر دے، وہ ہر طرح سے قادر ہے، بندے میں قدرت اور طاقت نہیں کہ باغ اور اس کی بہار کو قائم اور برقرار رکھ سکے، اسی طرح زندگی کی باغ و بہار اور امیری اور فقیری سب کچھ اس کی مشیت سے ہے، آن کی آن میں امیر کو فقیر اور فقیر کو امیر بنا سکتا ہے۔

امام زجاج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کسی میں طاقت نہیں کہ جو نعمت اور مال و دولت اس کے پاس ہے وہ اس کو تھام سکے۔ اس نصیحت کے بعد اس غریب مسلمان بھائی نے اس کے فخر اور غرور کا جواب دیا اور کہا کہ اگر آج تو مجھے مال و اولاد میں سے اپنے سے کمتر خیال کرتا ہے تو تجھے مناسب نہ تھا کہ تو مجھ پر اپنے فخر اور تکبر کا اظہار کرتا، کیا عجب ہے کہ میرا پروردگار دنیا یا آخرت میں یا دونوں جگہ مجھے تجھ سے بہتر باغ دے دے اور تیرے اس باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس کا تجھ کو وہم وگمان بھی نہو، پھر وہ تباہ و برباد ہو کر یکایک سارا چٹیل میدان ہو جائے جس پر گھاس کا بھی نام و نشان نہ ہو یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے پھر تو اس کو ڈھونڈ کر بھی واپس نہ لا سکے، یہ بات تیری قدرت سے باہر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو بات اس مردِ مومن کی زبان سے نکلی تھی وہ سچ نکلی اور کسی ظاہری سبب کے بغیر اچانک آسمان سے ایک آفت آئی جس سے

وہ باغ تباہ و برباد ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ایک آگ بھیجی جس نے اس باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا اور اس کا پانی زمین کے اندر اتر گیا اور اس باغ کا سارا پھل آسمانی عذاب کے گھیرے میں آ گیا اور غیب سے ایسی تباہی آئی کہ وہ باغ، درخت اور عمارت سب کچھ تباہ اور مسمار ہو گیا۔ پس اس کافر نے صبح اس حالت میں کی کہ کفِ افسوس ملتا رہ گیا اس مال و دولت پر جو اس نے اس باغ میں صرف کیا تھا کہ اب حسرت و افسوس کے کچھ بھی ہاتھ میں نہیں رہا۔ اور اس باغ کی عمارتیں اپنی چھتوں پر گر پڑی تھیں اور وہ اس حالت کو دیکھ کر کفِ افسوس ملتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ کاش! میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہوتا۔ یعنی جب اس کا باغ جل کر خاک سیاہ ہو گیا تو تب اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کے کفر و شرک کی سزا تھی، اپنے کیے ہوئے کفر پر نادم اور پشیمان ہوا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مومن ہو گیا، اس لیے کہ اس کی یہ ندامت، خوفِ خدا اور کفر کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ایک دنیاوی آفت و مصیبت کی وجہ سے تھی، لہٰذا ایسی تمنا بے کار اور بے سود ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے سوا اعوان و انصار اور حشم و خدم کی کوئی جماعت اس کی مدد نہ کر سکی اور وہ خود بھی اپنا بدلہ لینے پر قادر نہ تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمام اختیارات اور کارسازیاں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، کیونکہ مصیبت کے وقت صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جزع و فزع کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی تمام اختیارات کی مالک ہے، اور عارضی اور ناپائیدار چیز پر فخر کرنا حماقت اور نادانی ہے۔ (آگے فرمایا کہ) وہ اہلِ طاعت کو انعام و جزا دینے میں سب سے بہتر ہے اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کا انجام سب سے بہتر ہے۔ یعنی انجام کے اعتبار سے اہلِ اطاعت اور اہلِ ایمان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو شخصوں کی مثال بیان فرمائی، ان کی تعیین میں مفسرینِ کرام کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھائی بنی اسرائیل میں سے تھے اور ان ہی دو بھائیوں کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے سورہ والصافات میں بھی ذکر کیا ہے،

جیسا کہ فرمایا: ''قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ الخ'' بعض کہتے ہیں کہ اہلِ مکہ کے دو بھائیوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے جن کا تعلق قبیلہ مخزوم

سے تھا، ان میں سے ایک بھائی مسلمان اور دوسرا کافر تھا۔ اور اس مثال سے اصل مقصود یہ ہے کہ مال و دولت پر فخر کرنا اور فقراء و غرباء مسلمین کو حقیر سمجھنا بہت ہی برا ہے۔ اصل عزت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کے تعلق میں ہے۔[دیکھئے: تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۰۰، تفسیر قرطبی ج ۱۰، ص ۳۹۹، ماخوذ از معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۴، ص ۴۱۶ تا ۴۱۹]

جو لوگ دنیوی شان وشوکت اور مال و دولت کی کثرت پر مغرور و نازاں ہو کر کلمہء حق اور توحید کو ٹھکرا دیتے ہیں اور زر و جواہر کے خزانوں پر فخر ومباہات کا اظہار کرتے ہیں اُنہیں اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ اور کمالِ رحمت کے تحت تین طریقوں سے نصیحت فرماتے ہیں تا کہ وہ راہِ راست پر آجائیں، اول دولت کے دنیا ہی میں موجبِ عذاب ہونے کا اظہار فرما کر، دوئم دولتِ دنیا کے آخرت میں بھی موجبِ عذاب ہونے کا ذکر فرما کر اور سوئم دنیوی مال و دولت کی قلت اور حقارت بیان فرما کر۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو اسرائیلی بھائیوں، قطروس مشرک اور یہودا مومن کا قصہ بیان کر کے پہلے طریقہ کے مطابق پند ونصیحت فرمائی ہے، یہ واقعہ دنیا کے مال ومتاع کی بے ثباتی اور دولتِ دنیا پر مغرور ہو کر اللہ تعالیٰ کی توحید کو چھوڑنے کے انجامِ بد کا واضح ثبوت اور دلیل ہے کہ قطروس مشرک اپنے باغات، مال واولاد اور اپنے کنبے پر اس قدر مغرور تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو پسِ پشت ڈال دیا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیج کر اس کے باغات کو تباہ و برباد کر دیا اور جن لوگوں کی نصرت و امداد اور قوت و طاقت پر اس کو بھروسہ تھا، ان میں سے کچھ بھی اس کے کام نہ آیا۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”والمقصود من هذا ان الكفار افتخروا باموالهم و انصارهم علٰى فقراء المسلمين فبيّن اللّٰه تعالٰى ان ذلک مما لا يوجب الافتخار لاحتمال ان يصير الفقير غنيا و الغنى فقيرا اما الذى يجب حصول المفاخرة به فطاعة اللّٰه و عبادته“

یعنی اس مثال سے مقصود یہ ہے کہ کفار نے فقراءِ مسلمین پر اپنے مال و دولت

اور اپنے اعوان و انصار کے ساتھ فخر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں واضح کر دیا کہ یہ چیز قابلِ افتخار نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ فقیر مالدار ہو جائے اور مال دار فقیر ہو جائے، جو چیز فخر و مباہات کے قابل ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت ہے۔“

[تفسیر کبیر ج ۵، ص ۴۷۱]

ان دو بھائیوں میں سے ایک (قطروس مشرک) کے انگور کے دو باغ تھے جن کے گرد کھجور کے درخت تھے، اور جو زمین دونوں باغوں کے درمیان واقع تھی اس میں غلے اور سبزی کے کھیت لہلہا رہے تھے، حاصل یہ کہ اس کی زمین ہر قسم کے میووں، پھلوں اور غلوں کے لیے نہایت موزوں اور اعلیٰ درجہ کی زرخیز تھی، پھر باغوں اور کھیتوں کی ترتیب بھی نہایت عمدہ اور خوشنما تھی، جیسا کہ صاحبِ مدارک لکھتے ہیں: ”جعلناها ارضا جامعة للاقوات و الفواكه ووصف العمارة بانّها متواصلة متشابكة لم يتوسطها ما يقطعها مع الشكل الحسن و الترتيب الانيق“ [مدارک التنزیل ج ۳، ص ۱۰] (مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا)۔

اس آیتِ مبارکہ ”وَ لَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا“ میں ظلم کے معنی کم کرنے کے ہیں، جیسا کہ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کی مفردات میں ہے کہ وَ لَمْ تَظْلِمْ ای لم تنقص۔ [مفردات ص ۳۱۸] ان باغوں کا معاملہ دوسرے باغوں سے بالکل جداگانہ تھا، کیونکہ عام طور پر پھل دار درخت ایک سال زیادہ پھل دیتے ہیں اور ایک سال کم، مگر قطروس کے باغوں کے درخت اور پودے ہر سال بکثرت پھل اور میوے پیدا کرتے تھے۔[روح المعانی ج ۵، ص ۲۷۴]

باغوں اور کھیتوں کا محلِ وقوع، حسنِ ترتیب اور زمینوں کی زرخیزی بیان کرنے کے بعد ان کے مالک کا غرور اور استکبار بیان فرمایا کہ کس طرح وہ اپنے باغوں اور کھیتوں کی شادابی اور اپنی نفری پر غرور کرتا اور اپنے غریب مومن بھائی کو کس قدر حقیر و کمتر سمجھتا تھا، چنانچہ قطروس مشرک نے فخر و غرور سے کہا کہ میرے پاس تم سے دولت بھی زیادہ ہے اور میرے اعوان و انصار بھی طاقتور ہیں۔

جب وہ اپنے باغ میں داخل ہوا، اور اس کی سرسبزی وشادابی، اس کی خوبصورتی اور پھلوں کی کثرت کو دیکھا تو وہ حبِ دنیا اور حرص وآز کے خیالات میں کھو گیا اور بول اٹھا کہ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک یہ باغ تباہ نہیں ہوگا اور ہمیشہ اس تازگی، شادابی اور رونق کے ساتھ برقرار رہے گا اور میرا بھائی جس قیامت سے مجھے ڈراتا ہے اور جس آخرت کی راحت وآسائش کے لیے مجھے توحید اور اعمالِ حسنہ کی تلقین کرتا ہے، اول تو وہ قیامت آنے کی نہیں، اور اگر بالفرض آ بھی گئی تو آخرت میں بھی میرا انجام اچھا ہوگا اور وہاں بھی مجھے مال ودولت اور عیش وآرام کی زندگی نصیب ہوگی، وہ دراصل اس شبہ میں مبتلا تھا کہ اللہ کے ہاں اس کی بڑی قدر ومنزلت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں مال ودولت، جاہ وحشم اور شان وشوکت کی زندگی عطا فرمائی ہے اور وہ ان تمام نعمتوں کا مستحق ہے، اس لیے آخرت میں بھی اللہ کے نزدیک اس کی یہ قدر ومنزلت اور اس کا استحقاق باقی رہے گا اور اسے وہاں بھی ساری نعمتیں میسر ہوں گی۔ [تفسیر کبیر ج ۵، ص ۷۱۸]

قطروس مشرک کے جواب میں اس کا مومن بھائی یہودا اسے وعظ ونصیحت کرنے لگا۔ آیتِ کریمہ: ”اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ الخ“ میں کفر سے مراد ذاتِ خداوندی کا انکار نہیں ہے، کیونکہ قطروس، خدا کا منکر نہیں تھا وہ وجودِ باری تعالیٰ کا قائل اور معترف تھا، جیسا کہ وَ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ“ سے واضح ہوتا ہے بلکہ یہاں کفر سے شرک اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار مراد ہے، اس کے مشرک ہونے کا اعتراف ”يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ“ سے معلوم ہو رہا ہے جیسا کہ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”الظاهر انه كان مشر كا كما يدل عليه قول صاحبه تعريضاً به ”وَ لَآ اُشْرِكُ بِهٖ اَحَدًا“ وقوله ”يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْ اَحَدًا“......... فَالمراد بقوله ”اكفرت“ ءَاَشْرَكْتَ“ [روح المعانی، ج ۵ ص ۲۷۷] یعنی ظاہر یہ ہے کہ وہ مشرک تھا، جیسا کہ اس کے ساتھی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کو تعریضاً کہا کہ میں تو اس ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا، نیز خود اس کا یہ کہنا بھی اس کی دلیل ہے کہ وہ مشرک تھا کہ اس نے کہا کہ کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا۔“

بہر حال! جب قطروس باغ میں داخل ہوا، وہ دولت کے نشہ میں ایسا مدہوش تھا کہ خدا کو بھی بھول گیا اور قیامت کا بھی انکار کر بیٹھا اور اپنی دولت پر لگا اِترانے، اس پر اس کے بھائی (یہودا) نے اسے نصیحت کی کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تھا تو تجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا، جس نے یہ سب نعمتیں تجھے عطا فرمائی ہیں، اور جو کچھ اس باغ میں ہے سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی مشیت سے ہے اور یہ سب کچھ اس کے قبضہ و تصرف میں ہے، چاہے آباد رکھے، چاہے برباد کردے۔[مدارک التنزیل ج ۳، ص ۱۱]

شاید قطروس نے مشیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے کسی معبود کو شریک کیا ہو، جیسا کہ آج کل بھی جاہل لوگ کہتے ہیں: ''جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے چاہا'' حالانکہ یہ کلمہ شرک ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے ایک شخص کی زبان سے نکل گیا: ''کما شاء اللّٰہ و رسولہ'' اس پر آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے تنبیہ فرمائی اور فرمایا: ''قولوا ماشاء اللّٰہ وحدہ'' یعنی یوں کہا کرو کہ جس طرح صرف اللہ نے چاہا۔''

یہودا نے اس سے کہا کہ ''لاقوۃ الا باللّٰہ''، یعنی نعمتیں عطا کرنے کے بعد چھین لینے کی طاقت وقوت صرف اللہ کے پاس ہے، جن بزرگوں کو تم نے اللہ کا شریک بنایا ہوا ہے، ان کے پاس کچھ نہیں، جس اللہ نے تجھے یہ باغات اور یہ سامانِ تعیش عطا فرمایا ہے وہ اس کے چھین لینے اور اسے آنِ واحد میں تباہ و برباد کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے، اور اگر تو کثرتِ مال واولاد پر فخر کر رہا ہے اور مجھے ان چیزوں کی کمی کی وجہ سے حقیر سمجھتا ہے تو سن لے کہ مال واولاد چند روزہ دنیوی زندگی کی آنی فانی اور ناپائیدار زینت ہے، یہ فخر و مباہات کے چیز نہیں، اگر آج تو زر و جواہر میں کھیل رہا ہے اور اپنے باغوں پر اِتراتا پھر رہا ہے اور میں مال واولاد میں تم سے کم ہوں تو جس خدائے بلندی وپستی نے تجھے دولت دی اور مجھے نہیں دی، وہ ایسا بھی کرسکتا ہے کہ جو کچھ اس نے تجھے دیا ہے مجھے اس سے بھی زیادہ عطا فرمادے، اور تیرے باغ کو طوفانِ برق و باد سے نیست و نابود کردے یا زمین کا پانی خشک کردے اور تیرے باغات اور سرسبز وشاداب کھیت برباد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا

ہی ہوا کہ رات کے وقت ایسا عذاب آیا جس سے اس کے باغات اور دیگر اموال تباہ و برباد ہو گئے۔ [تفسیر ابی السعود ج ۵ ص ۲۱۰]

جب صبح کو باغوں کی تباہی کا منظر دیکھا تو جو کچھ باغوں کی دیکھ بھال پر خرچ کیا تھا، اس پر کفِ افسوس ملنے گا، اب اسے بھائی کی نصیحت یاد آئی اور سخت نادم ہو کر بول اٹھا، کاش! میں نے اپنے مالک اور پروردگار کے ساتھ شریک نہ کیا ہوتا، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ مشرک تھا، اور غیر اللہ کو کارساز اور حافظ و ناصر سمجھتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو جس خاندانی جمعیت پر اسے ناز تھا اور جن معبودوں کو وہ اللہ کے سوا کارساز اور متصرف سمجھتا تھا، ان میں سے کوئی بھی اس آڑے وقت میں اس کے کام نہ آیا اور نہ اپنے ہی قوتِ بازو سے اللہ کے عذاب سے اپنے باغات کو بچا سکا۔

[دیکھئے: جواھر القرآن ج ۲، ص ۶۵۹ تا ص ۶۶۱ ملخصاً]

علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفات تفسیر ''تفسیر مظہری'' میں رقمطراز ہیں: ''امام بغوی لکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ قبیلہ بنی مخزوم کے دو بھائی رہتے تھے، ایک مومن تھا اور دوسرا کافر، مومن کا نام ابوسلمہ عبداللہ (ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے سابق شوہر) بن عبدالاسود بن عبد یالیل تھا اور کافر کا نام اسود بن عبدالاسود بن عبد یالیل تھا۔ ان ہی کے حق میں اس آیتِ کریمہ کا نزول ہوا۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ عیینہ بن حصین اور اس کے ساتھیوں کے احوال اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے حال کو بطورِ تمثیل بنی اسرائیل کے دو بھائیوں کے احوال سے تشبیہ دی ہے۔ جن میں سے ایک کا نام، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق، یہودا اور امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق تملیخا تھا اور دوسرے کا نام قطروس اور بقولِ وھب رحمۃ اللہ علیہ قطفر تھا، اول مسلمان تھا اور دوسرا کافر، سورۂ والصافات میں بھی ان ہی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت معمر عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ان دونوں کے متعلق حسب ذیل نقل کیا ہے:

ایک شخص کے دو بیٹے تھے، دونوں کو باپ کی وراثت سے آٹھ ہزار دینار ملے،

دونوں نے تقسیم کر کے اپنا اپنا حصہ لے لیا، ایک بھائی نے ایک ہزار دینار کی زمین خریدی، دوسرے نے ہزار دینار خیرات کر دیئے اور کہا کہ اے اللہ! میرے بھائی نے ہزار دینار کی زمین خریدی ہے، میں تجھ سے جنت میں ایک ہزار کی زمین خریدتا ہوں، اول شخص نے ہزار دینار صرف کر کے مکان بنایا، دوسرے نے ہزار دینار غریبوں میں تقسیم کر کے دعا کی کہ اے اللہ! اس نے ہزار دینار خرچ کر کے مکان بنایا ہے، میں تجھ سے جنت کے اندر ہزار دینار کا مکان خریدتا ہوں، پھر پہلے شخص نے ہزار دینار صرف کر کے ایک عورت سے شادی کر لی اور دوسرے نے ہزار دینار راہِ خدا میں دے کر کہا کہ اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ جنت کے اندر کسی جنتی عورت سے میرا نکاح کر دے، پھر پہلے شخص نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے باندی، غلام اور گھر کا سامان خریدا اور دوسرے نے ہزار دینار خیرات کر کے اللہ تعالیٰ سے جنت کے اندر خدام اور سامان ملنے کی درخواست کی، جب یہ دوسرا شخص سارا مال خیرات کر چکا تو کچھ عرصہ کے بعد مال کی کوئی سخت ضرورت پیش آئی اور دل میں خیال آیا کہ مجھے بھائی کے پاس جانا چاہیے، شاید اس کی طرف سے مجھے کچھ مل جائے، یہ سوچ کر بھائی کے راستہ پر ایک طرف کو جا بیٹھا اس طرف سے مال دار بھائی اپنے خادموں کے جھرمٹ میں گزرا اور بھائی کو دیکھ کر پہچان لیا اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اس شخص نے کہا کہ مجھے ایک حاجت درپیش ہے اور میں مفلس ہو گیا ہوں، آپ کے پاس کچھ بھلائی کی امید لے کر آیا ہوں، مال دار بھائی نے کہا کہ تمہارے مال کا کیا ہوا؟ تقسیم کے وقت تو تم نے اپنا حصہ لے لیا تھا! غریب بھائی نے اپنی ساری سرگذشت بیان کر دی، دولت مند بھائی بولا، اچھا! تم خیرات کرنے والوں میں شامل ہو گئے، چلے جاؤ، میں کچھ نہیں دوں گا، غرض اس نے غریب کو دھتکار دیا، آخر دونوں مر گئے اور ان ہی کے متعلق آیتِ کریمہ: "فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ" نازل ہوئی۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ مال دار بھائی، غریب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مال کی سیر کرانے لے گیا اور گھما پھرا کر ہر طرح کا مال دکھایا۔" [تفسیر مظہری ج ۷، ص ۱۳۲]

تعارض:

اللہ تعالیٰ نے قوم بنی اسرائیل میں سے دو بھائیوں کا ایک قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: "وَ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ" کہ ہم نے ان میں سے ایک کو انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے تھے، اس کے بعد ان باغوں کے اوصاف ذکر کیے، پھر جب قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے باغوں کی رونق وزینت دکھانے کے لیے لے گیا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے "دَخَلَ جَنَّتَهٗ" صیغہ مفرد ذکر کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک باغ تھا اور پہلی آیت میں صیغہ تثنیہ کے ساتھ "جَنَّتَيْنِ" فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو باغ تھے، پس ان آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

جوابِ اوّل:

جس طرح الف لام استغراقی ہوتا ہے اسی طرح اضافت بھی استغراقی ہوتی ہے، یہاں جنت کی اضافت ہٗ ضمیر کی طرف استغراقی ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام باغوں (دونوں باغوں) میں داخل ہوا، اس کے تمام باغ دو ہی باغ تھے۔ [روح المعانی، تفسیر جمل]

جوابِ ثانی:

دونوں باغ متصل تھے، اتصال کی وجہ سے ان دونوں کو ایک شمار کر کے "جَنَّتَهٗ" کہلایا گیا۔ [تفسیر ابی السعود]

جوابِ ثالث:

دونوں باغوں میں دخول چونکہ ایک وقت میں نہیں ہوسکتا بلکہ یکے بعد دیگرے ہی ہوسکتا ہے۔ اس لیے صیغہ مفرد استعمال کیا۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک باغ دکھلایا، پھر دوسرا، یعنی دَخَلَ جَنَّتَهٗ بَعْدَ جَنَّةٍ" ایک کے ذکر پر اکتفاء کرلیا گیا، مراد دونوں ہیں۔

[تفسیر ابی السعود]

جوابِ رابع:

باغوں کی تعداد بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے، اس لیے صیغہ تثنیہ کا استعمال ضروری نہیں سمجھا گیا، صیغہ مفرد کے ساتھ "جَنَّتَهٗ" کہہ دیا۔[تفسیر ابی السعود]

جوابِ خامس:

جنت سے مراد باغ نہیں ہے بلکہ جنتِ دنیویہ مراد ہے، کافر کو جو مال و متاع دنیا میں ملتا ہے بس وہی اس کی جنت ہوتی ہے؟ آخرت کی جنت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے تو جَنَّتَهٗ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس کے پاس جو دو باغ اور دیگر اموال و اسباب تھے بس یہی اس کی جنت تھی وہ اپنے مومن بھائی کو اپنی جنت دکھلانے لے گیا۔[تفسیر کبیر]

جوابِ سادس:

اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی باغ عطا فرمایا تھا، پس آیت نمبر۲ میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ آیت نمبر۱ میں "جَنَّتَيْنِ" اس لیے فرمایا کہ اس باغ کے درمیان ایک نہر جاری تھی، نہر کے دونوں طرف باغ تھا، اس لیے اس کو دو باغوں سے تعبیر کر دیا گیا، جیسا کہ ابن ابی حاتم نے امام سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ مگر یہ توجیہ ضعیف ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے "وَ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا" "جَنَّتَيْن کے ذکر کے بعد فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو مستقل باغ تھے ان دونوں کے درمیان نہر جاری تھی، اگر باغ ایک ہوتا اور درمیان میں نہر جاری ہو جانے کی وجہ سے دو باغ ہو گئے تھے تو اس صورت میں یوں کہا جاتا: "جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّةً وَ فَجَّرْنَا خِلٰلَهَا نَهَرًا فَصَارَ تَا جَنَّتَيْنِ".

(روح المعانی) [مشکلات القرآن ص ۲۰۰، تا ۲۰۲]

فوائد:

(۱) اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اکثر اپنے مقبول بندوں کو دنیا سے دور رکھتا ہے اور کافروں کو دنیا کی عیش و آرام سے خوب نوازتا ہے اور اہلِ ایمان پر بلائیں نازل کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام لوگ کفر

کے فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے تو ہم کافروں کو اتنا مال و دولت دیتے کہ ان کے گھروں کی چھتیں بھی چاندی کی کر دیتے، عمومی قاعدہ تو یہی ہے، مگر بعض اوقات کافر کا غرور اور تکبر توڑنے کے لیے کوئی آسمانی آفت اس کے مال و دولت پر نازل کر دیتے ہیں، تاکہ وہ متنبہ ہو جائے کہ یہ دنیا ہیچ ہے اور امیری اور فقیری سب اس کے ہاتھ میں ہے۔

(۲) جو شخص اپنے مکان یا باغ وغیرہ میں داخل ہوتے وقت "مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہے تو وہ مکان اور باغ بلا و آفت اور نظرِ بد سے محفوظ رہے گا۔

(۳) بعض اسلاف سے منقول ہے کہ جسے اپنی اولاد یا مال یا حال پسند آئے اسے "مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کلمہ پڑھ لینا چاہیے۔

ابویعلیٰ موصلی میں ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندے پر اللہ تعالیٰ کوئی نعمت و انعام فرمائے، خواہ اہل و عیال ہوں، دولتمندی ہو، اولاد ہو، پھر وہ اس کلمہ (مذکورہ) کو کہہ لے تو سوائے موت کے اس میں کوئی آنچ نہ آئے گی۔

(۴) مسند احمد میں ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں جنت کا ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ وہ خزانہ لاحول ولاقوة الا باللّٰه کہنا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے نے مان لیا اور اپنا معاملہ میرے سپرد کر دیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا صرف لاحول نہیں بلکہ وہ جو سورۂ کہف میں ہے یعنی ماشاء الله لاقوة الا باللّٰه.

حکایت:

امام دار الہجرت مالک بن انسؒ نے اپنے مکان کے دروازہ پر لکھ رکھا تھا۔ مَاشَآءَ اللّٰهُ لاقوة الا باللّٰهِ. کسی نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں لکھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَ لَوْ لَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ"

سوال:

دو بھائیوں کے تذکرے میں مومن بھائی نے اپنے کافر بھائی سے کہا: "لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّىْۤ اَحَدًا" یعنی البتہ میں کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا، اس کلام میں اس بات کی تعریض ہے کہ اس کا بھائی شرک میں مبتلا ہوا، حالانکہ اس کے کلام سے شرک مترشح نہیں ہوتا، البتہ صرف کفر ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس نے کہا: "وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً" کہ میرا نہیں خیال کہ قیامت برپا ہوگی؟

جواب:

اس کے الفاظ میں تو شرک نہیں، البتہ اعتقاد کے اعتبار سے اس نے شرک کیا تھا، وہ اس طرح کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے باغ کا پھلنا پھولنا اور بڑھنا محض اس کی محنت اور قوت کا ثمرہ ہے، کسی اور طاقت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے بھائی نے اس سے کہا: "وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہ تم نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کیوں نہیں کہا؟ خود اس نے اپنے باغ کو دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا: يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّىْۤ اَحَدًا" کہ کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا!" گویا اس نے شرک کا خود اعتراف کیا۔

سوال:

آیتِ کریمہ ہے: " هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ" یعنی قیامت کے دن ولایت اللہ ہی کے لیے ہوگی، "ولایۃ" واؤ کے کسرہ کے ساتھ، بادشاہت کے معنی میں ہے اور "وَلایۃ" واؤ کے فتحہ کے ساتھ نصرت و مدد کے معنی میں ہے تو ولایت و نصرت دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلیل کرے، جس کی چاہے مدد کرے جس کی چاہے مدد نہ کرے، پھر اللہ تعالیٰ کے لیے

صرف قیامت کے دن کی ولایت ونصرت کو خاص کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب:

دنیا میں اس کے دعویدار بہت سارے ہیں، قیامت کے دن یہ سب دعویدار ختم ہو جائیں گے، اس وقت بادشاہت صرف اللہ ہی کے لیے ہوگی، کوئی مجازی بادشاہ نہیں ہوگا، اس کی نظیر سورۃ الانعام میں بھی قَوْلُهُ الْحَقُّ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ" کے تحت موجود ہے۔

سوال:

"هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا" کہ اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ثواب دینے والا موجود ہی نہیں، پھر اللہ تعالیٰ کا ثواب سب سے اچھا ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب:

یہ علی سبیل الفرض والتقدیر ہے، مطلب یہ ہے کہ بالفرض والمحال اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا ثواب دے سکتا تب بھی اللہ تعالیٰ کا جزا وثواب دینا اس سے بہت اچھا ہوتا، اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز ہوتی تب بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت، نتیجہ اور انجام کے اعتبار سے اس سے کئی گنا بہتر ہوتی۔

[نکات القرآن ص ۲۴۰ تا ۲۴۲ ملخصاً]

☆☆☆

(۴۷)

﴿دنیا کے فنا وزوال کی ایک مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ○ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا﴾ [الکھف: ۴۵، ۴۶]

ترجمہ

''دنیا کی زندگی کی مثال ان کے سامنے بیان کیجیے کہ جیسے کہ پانی جسے ہم نے آسمان سے اتارا پھر اس سے زمین کی روئیدگی ملتی ہے، پھر آخر کار وہ چورہ ہو جاتی ہے جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مال و اولاد تو دنیا کی زندگی کی ہی زینت ہے، ہاں البتہ باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک ثواب اور اچھی توقع کے اعتبار سے بہت ہی عمدہ ہیں۔''

تشریح

گزشتہ آیات میں دو شخصوں کی مثال بیان کی تھی جس سے دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو بتانا مقصود تھا اب پھر دنیا کے فنا و زوال کی ایک دوسری مثال بیان فرماتے ہیں، تاکہ دنیا کی اصل حقیقت ظاہر ہو جائے اور لوگ اس کی ظاہری زیب و زینت کو دیکھ کر فریفتہ نہ ہوں اور اس کی ظاہری آرائش سے دھوکہ نہ کھا بیٹھیں، نیز سمجھ جائیں کہ دنیا ہیچ

ہے، قابل فخر چیز نہیں ہے۔ قابل فخر اور قابلِ شکر تو اعمالِ صالحہ ہیں جن کے مقابلہ میں ساری دنیا کی آرائش وزیبائش کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

دنیا تو خسیس اور حقیر چیز ہے، اگر نفیس اور اعلیٰ چیز کی خواہش رکھتے ہو تو آخرت کی تیاری کریں اور آخرت کے لیے کوئی ذخیرہ اور خزانہ تیار کریں اور وہ خزانہ اعمال صالحہ کا ہے۔ دیکھ لو، ابلیس غرور وتکبر اور اپنی اصل پر مغرور ہونے کی وجہ سے کیسا ذلیل وخوار ہوا۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ متکبرین ایک حقیر اور فانی چیز پر اظہارِ فخر کر رہے ہیں، حالانکہ ایک خسیس اور بہت جلد زوال پذیر ہونے والی چیز پر فخر کرنا نادانی ہے، اس کے بعد قیامت کی ہولناکیوں کو بیان کیا کہ اس دنیا کے فنا و زوال کے بعد جب قیامت قائم ہوگی تو اس وقت ایمان اور عملِ صالح کام آئے گا، دنیا کا مال ومتاع کچھ کام نہ آئے گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے نبی ﷺ! آپ ان کافروں کے لیے، جو اموال و اولاد پر فخر کرتے ہیں، دنیاوی زندگی کی مثال بیان کر دیجیے کہ وہ کیسی ہری بھری معلوم ہوتی ہے اور پھر کیسے جلدی زائل اور فنا ہو جاتی ہے، وہ (مثال) ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی کے ذریعہ گنجان روئیدگی حاصل ہوئی، جس سے وہ زمین تر و تازہ اور سرسبز وشاداب ہوگئی اور خوشنما معلوم ہونے لگی، پھر آخر کار وہ خشک ہوکر ریزہ ریزہ ہوگئی جس کو ہوائیں اڑانے لگیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اللہ ہی اپنی قدرتِ کاملہ سے سبزہ کو اگاتا ہے اور پھر اس کو خشک کر کے ہوا میں اڑاتا ہے، دنیا کا حال بھی ایسا ہی ہے کہ شروع شروع سبزہ اور کھیتی کی طرح تر وتازہ اور خوشنما معلوم ہوتی ہے اور خوب باغ و بہار دکھاتی ہے، پھر جس طرح چندروز کے بعد سبزہ سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور دائیں بائیں ہوائیں اس کو اڑا لے جاتی ہیں، اسی طرح چندروز کے بعد یہ دنیا بھی فنا ہو جائے گی، لہٰذا چندروزہ رونق اور بہار پر پھولنا اور اِترانا عقلمندی کا کام نہیں ہے۔ خوب سمجھ لو کہ جس خدا نے تمہیں مال واولاد کی زینت بخشی ہے وہ اس کے فنا کرنے پر بھی قادر ہے، مال اور بیٹے جن پر یہ کافر اِتراتے پھرتے ہیں اور فخر کرتے ہیں، یہ محض دنیاوی زندگی کی زینت ہیں، زادِ آخرت نہیں ہیں، اور ایسی چیزوں پر دل لگانا اور ان پر فخر کرنا کہ جو چندروز

کے بعد فنا اور زائل ہو جائے اور آخرت میں کچھ کام نہ آئے، کسی دانشمند اور ہوش مند آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے کہ مال اور اولاد دنیا کی کھیتی ہے اور اعمالِ صالحہ آخرت کی کھیتی ہے۔[تفسیر بغوی] (آگے فرمایا) اور باقی رہنے والی نیکیاں یعنی وہ اعمالِ صالحہ جو خاص اللہ تعالیٰ کے لیے کیے گئے ہوں اور اس میں طمع اور غرض کا شائبہ تک نہ ہو، وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی خوب تر ہیں، اور امید وتوقع کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں۔ یعنی اعمالِ صالحہ پر اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھی جا سکتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ جو نیک عمل کرے گا وہ جنت میں من پسند مراد پائے گا۔ اس کے سوا تمام امیدیں موہوم ہیں، اعمالِ صالحہ کا ثمرہ دائمی اور باقی ہے اور غیر اعمالِ صالحہ کا نتیجہ عارضی اور وقتی ہے۔[معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج ۴ ص ۴۲۰، ۴۲۱]

آیتِ مذکورہ میں لفظ "باقیات صالحات" کی تفسیر و مراد میں اسلاف و اخلاف کے مختلف اقوال منقول ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہؒ اور مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ باقیات صالحات، "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: باقیات صالحات کو زیادہ پڑھا کرو، عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! باقیات صالحات سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ پڑھنا: "سُبْحَانَ اللّٰہِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" [رواہ احمد و ابن حبان و الحاکم]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کا ذکر کثرت سے کیا کرو، اس سے نقصان کے ننانوے دروازے بند ہو جاتے ہیں، جن میں سے ادنیٰ دروازہ غم ہے۔[رواہ العقیلی]

عقیلی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ

"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" ہی باقیات صالحات ہیں۔

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی نقل کی ہے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ، مسروقؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک باقیات صالحات سے مراد نمازِ پنجگانہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول بھی ایک روایت کے مطابق یہی ہے، لیکن دوسری روایت میں آیا ہے کہ باقیات صالحات سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔

تاریخ وتفسیر کے امام حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"دنیا اپنے فنا وزوال، خاتمہ اور بربادی کے اعتبار سے آسمانی بارش کے مثل ہے جو (پانی) زمین کے دانوں وغیرہ سے ملتا ہے اوران گنت پودے لہلہانے لگتے ہیں، زندگی کے آثار اور تر وتازگی، ہر چیز پر ظاہر ہونے لگتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے گزرنے کے بعد وہ سوکھ ساکھ کر چورا چورا ہو جاتے ہیں۔ عموماً دنیا کی مثال بارش سے بیان کی جاتی ہے: جیسا کہ سورۂ یونس کی آیتِ کریمہ: "اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ میں اور جیسا کہ سورہ زمر کی آیتِ مبارکہ: "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً الخ میں، نیز جیسا کہ سورۂ حدید کی آیتِ شریفہ: "اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا الخ میں بھی۔

حدیثِ صحیح بھی ہے کہ دنیا سرسبز اور شیریں ہے۔ پھر فرمایا کہ مال واولاد دنیا کی زندگی کی زینت ہیں۔ جیسا کہ ایک اور جگہ پر فرمایا: "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ الخ یعنی انسان کے لیے خواہشات کی محبت جیسے عورتیں، اولاد، خزانے وغیرہ مزین اور آراستہ کر دی گئی ہیں۔ ایک آیت میں ہے: اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ الخ، یعنی تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجرِ عظیم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونا، اس کی طرف جھکنا اور اس کی عبادت میں مشغول ہونا دنیا طلبی سے بہتر

ہے،اس لیے یہاں بھی ارشاد ہو رہا ہے کہ باقیات صالحات ہر اعتبار سے بہتر اور عمدہ ہیں، مثلاً پانچوں وقت کی نمازیں اور **سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولآ الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر**، اور **لآ الہ الا اللّٰہ** اور **سبحان اللّٰہ** اور **الحمد للّٰہ** اور **اللّٰہ اکبر** اور **لاحول و لاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم**۔

مسندِ احمد میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مؤذن آیا، آپ نے پانی منگوایا، ایک برتن میں تین پاؤ کے قریب پانی آیا، آپ نے وضو کر کے فرمایا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح وضو کر کے فرمایا کہ جو میرے اس وضو جیسا وضو کر کے ظہر کی نماز ادا کرے تو صبح سے لے کر ظہر تک کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، پھر عصر میں بھی اسی طرح نماز ادا کی تو ظہر سے عصر تک کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، پھر مغرب کی نماز پڑھی تو عصر سے مغرب تک کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، پھر عشاء کی نماز پڑھی تو مغرب سے عشاء تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، پھر رات کو وہ سویا رہا اور صبح اٹھ کر فجر کی نماز ادا کی تو عشاء سے لے کر صبح تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، یہی وہ نیکیاں ہیں جو برائیوں کو دور کر دیتی ہیں‘‘ لوگوں نے پوچھا کہ یہ تو نیکیاں ہیں، اب آپ بتائیے کہ باقیات صالحات کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ **سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ واللّٰہ اکبر ولا حول ولاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم**۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ باقیات صالحات یہ ہیں: **سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ وَلآ اِلہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ولاحول و لاقوۃ الا باللّٰہ**‘‘ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد عمارہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ بتاؤ باقیات صالحات سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نماز اور روزہ، آپ نے فرمایا کہ تم نے درست جواب نہیں دیا، شاگرد نے کہا کہ زکوٰۃ اور حج، آپ نے فرمایا کہ یہ بھی درست نہیں ہے۔ سنو! اس سے مراد پانچ کلمات ہیں، **لآ الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر و**

سبحان اللّٰه و الحمد للّٰه و لاحول و لاقوۃ الا باللّٰہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا تو آپ نے الحمد للّٰہ کے سوا دیگر کلمات بتائے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ لَا حَوْلَ کے سوا اور چاروں کلمات بتاتے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی چاروں کلمات کو باقیات صالحات قرار دیتے ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سبحان اللّٰه والحمد للّٰه و لآ اله الا اللّٰه و اللّٰه اکبر یہ ہیں باقیات صالحات۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ باقیات صالحات کثرت سے پڑھا کرو، عرض کیا گیا کہ وہ کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ملت، عرض کیا گیا کہ وہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تکبیر، تہلیل، تسبیح اور الحمد للّٰہ اور لا حول و لاقوۃ الا باللّٰہ۔" [رواہ احمد]

سالم بن عبداللہ کے مولی عبداللہ بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب القرظی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کسی کام کے لیے بھیجا تو انہوں نے کہا کہ سالم سے کہہ دینا کہ فلاں قبر کے پاس کے کونے میں مجھ سے ملاقات کریں، مجھے ان سے کچھ کام ہے، چنانچہ دونوں کی وہاں ملاقات ہوئی، تو سالم نے پوچھا کہ باقیات صالحات سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: لَآ اله الا اللّٰه و اللّٰه اکبر اور سبحان اللّٰه اور لا حول و لاقوۃ الا باللّٰه، سالم نے کہا کہ یہ آخری کلمہ آپ نے اس میں کب سے بڑھایا ہے؟، امام قرظی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ اس کلمہ کو شمار کرتا ہوں، دو تین مرتبہ یہی سوال جواب ہوئے، پھر امام محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کیا تمہیں اس کلمہ سے انکار ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں مجھے انکار ہے، فرمایا کہ سنو! میں نے حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، انہوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جب مجھے معراج کرائی گئی تو میں نے آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ جبریل

علیہ السلام نے کہا یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ انہوں نے مجھے مرحبا اور خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ آپ اپنی امت سے فرما دیجئے کہ وہ جنت میں اپنے لیے بہت زیادہ باغات لگالیں، اس کی مٹی پاک ہے، اس کی زمین کشادہ ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں باغات لگانے کی کیا صورت ہے؟ انہوں نے فرمایا: **لا حول و لاقوۃ الا باللّٰہ** کثرت سے پڑھیں۔

مسندِ احمد میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات عشاء کی نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے، آسمان کی طرف دیکھ کر نگاہیں نیچی کرلیں، ہمیں خیال ہوا کہ شاید آسمان میں کوئی نئی بات ہوئی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد جھوٹ بولنے اور ظلم کرنے والے بادشاہ ہوں گے، جوان کے جھوٹ کو تسلیم کرے گا اوران کے ظلم میں ان کی طرفداری کرے گا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جوان کے جھوٹ کو تسلیم نہ کرے گا اوران کے ظلم میں ان کی طرفداری نہیں کرے گا، وہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں، لوگو! سنو! **سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہِ و لآ الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر**، یہ باقیات صالحات ہیں، یعنی باقی رہنے والی نیکیاں ہیں۔''

مسند احمد میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: واہ واہ! پانچ کلمات ہیں جو نیکی کے ترازو میں بہت وزنی ہیں، وہ ہیں: **لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ** اور وہ بچہ جس کے انتقال پر اس کا باپ اجر وثواب کے حصول کی خاطر صبر سے کام لے، واہ واہ! پانچ چیزیں جوان پر یقین رکھتا ہوا اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے وہ یقیناً جنتی ہے (وہ پانچ چیزیں یہ ہیں) اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، جنت وجہنم پر، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر اور حساب وکتاب پر ایمان رکھے۔

مسندِ احمد میں ہے کہ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ ایک سفر میں تھے، کسی جگہ پڑاؤ ڈالا، اور اپنے غلام سے فرمایا کہ چھری لاؤ، کھیلیں، حسان بن عطیہ کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی، سنو! اسلام لانے کے بعد سے لے کر آج تک میں نے کوئی کلمہ اپنی زبان سے ایسا نہیں نکالا جو

میرے لیے لگام بن جائے۔ سوائے ایک کلمہ کے پس تم لوگ اسے بھلا دو اور اب جو میں کہہ رہا ہوں اسے یاد رکھو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جب لوگ سونا چاندی کے جمع کرنے میں لگ جائیں، تم اس وقت ان کلمات کو کثرت سے پڑھا کرو: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَالْعَزِیْمَۃَ عَلَی الرُّشْدِ وَ اَسْئَلُکَ شُکْرَ نِعْمَتِکَ وَ اَسْئَلُکَ حُسْنَ عِبَادَتِکَ وَ اَسْئَلُکَ قَلْبًا سَلِیْمًا وَ اَسْئَلُکَ لِسَانًا صَادِقًا وَ اَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا تَعْلَمُ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَ اَسْتَغْفِرُکَ لِمَا تَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ" یعنی اے اللہ! میں تجھ سے اپنے کام کی ثابت قدمی اور نیکی کے کام کا کامل عزم اور تیری نعمتوں کی شکر گزاری کی توفیق مانگتا ہوں اور میں تجھ سے سلامتی والا دل اور سچی زبان مانگتا ہوں، تیرے علم میں جو بھلائی ہے میں اس کا خواستگار ہوں، اور تیرے علم میں جو برائی ہے میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں، پروردگار! ہر اس برائی سے میری توبہ ہے جو تیرے علم میں ہو، بے شک غیب دان صرف تو ہی ہے۔"

حضرت سعید بن جنادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ طائف میں سے سب سے پہلے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، میں اپنے گھر سے علی الصبح ہی چل پڑا اور عصر کے وقت منٰی (مقام) میں پہنچ گیا، پہاڑ پر چڑھا، پھر اترا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا، اسلام کی دولت سے مشرف ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سورۃ اخلاص اور سورۃ زلزال کی تعلیم دی اور یہ کلمات سکھائے: سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ و لآ الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ باقی رہنے والی نیکیاں ہیں۔"

اس سند سے مروی ہے کہ جو شخص رات کو اٹھے اور وضو کرے، کلی کرے، پھر سو مرتبہ سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، اللّٰہ اکبر، لآ الٰہ الا اللّٰہ، پڑھے، اس کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، قتل کے سوا، وہ معاف نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ باقیات صالحات سے مراد اللہ کا

ذکر اور لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَبَارَكَ اللّٰهُ وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ہے۔ نیز روزہ، نماز، حج، صدقہ خیرات، غلاموں کی آزادی، جہاد، صلہ رحمی اور تمام نیکیاں باقیات صالحات میں داخل ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام اعمالِ صالحہ باقیات صالحات میں داخل ہیں، امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہی مختار قول ہے۔''

[تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۲۷۰ تا ص ۲۷۲]

☆☆☆

(۳۸)

﴿اللہ تعالیٰ کے علوم اور عظمتوں کا شمار ممکن نہیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾

[الکھف: ۱۰۹]

ترجمہ

''آپ فرما دیجئے کہ میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، گو ہم اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں۔''

شانِ نزول:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے یہود سے فرمایا کہ ''تمہیں تو صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے'' تو وہ کہنے لگے کہ یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے! ہمیں تو تورات دی گئی ہے، جس کو تورات جیسی کتاب دی گئی ہو اسے تو خیرِ کثیر عطا کی گئی ہے، اس پر مذکورہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

[آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۳۱۷]

تشریح

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے علوم کا غیر محدود اور غیر متناہی ہونا بیان فرماتے ہیں کہ آپ فرما دیجئے کہ اگر سمندر میرے پروردگار کے علم وحکمت کی باتوں کو لکھنے

کے لیے روشنائی بن جائے جس سے خدا کی باتیں لکھنی شروع کی جائیں تو میرے پروردگار کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر کے سمندر ختم ہو جائیں مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات (علم وحکمت) لکھنے کے لیے سمندر بھی ناکافی ہے، اگرچہ ہم ویسا ہی سمندر اور اس کی مدد کے لیے لے آئیں۔ یعنی سمندر کے سمندر ختم ہو جائیں گے مگر اللہ تعالیٰ کے کلماتِ حکمت ختم نہ ہوں گے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے کلماتِ حکمت غیر متناہی ہیں اور سمندر متناہی ہے، متناہی، غیر متناہی کو نہیں لکھ سکتا۔

یہود نے ایک مرتبہ مسلمانوں سے کہا کہ تم قرآن میں پڑھتے ہو: ''وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا'' جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو حکمت دی گئی تو اس کو خیرِ کثیر دی گئی، نیز تم یہ بھی پڑھتے ہو، ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' یعنی تم کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا ہے''۔ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ کیونکہ آپ خود اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ہم کو تورات دی گئی ہے جو کتابِ حکمت ہے اور حکمت خیرِ کثیر ہے تو پھر یہ کیسے کہا گیا کہ تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ تورات اگرچہ خیرِ کثیر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلماتِ حکمت کے مقابلہ میں قلیل ہے، تمام مخلوقات کا علم، اللہ تعالیٰ کے دریائے علم کے سامنے ایک قطرہ ہے، بلکہ ایک قطرہ بھی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور غیر محدود ہے اور مخلوق کا علم حادث اور محدود ہے۔

علم ہا از بحر علمش قطرۂ　　　　ایں چوں خورشید است و انہا ذرہ
گر کسے علم در صد لقمان بود　　　　پیش علم کا ملش نادان بود

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۴، ص ۴۶۶]

☆☆☆

(۳۹)

﴿شرک کی قباحت اور مشرکین کی حماقت کی ایک مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾[الحج: ۷۳، ۷۴]

ترجمہ

''اے لوگو! ایک عجیب مثال بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو، جن کی خدا کے سوا تم پوجا کرتے ہو وہ ایک (حقیر چیز) مکھی کو بھی پیدا نہیں کر سکتے، گو اس (کام) کے لیے سب جمع ہو جائیں، اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ مکھی سے چھڑا نہیں سکتے، طالب اور مطلوب (دونوں) کمزور ہیں، انہوں نے اللہ کے مرتبہ کا اندازہ ویسا نہیں کیا جیسا کرنا چاہیے تھا، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا غالب ہے۔''

تشریح

اس سے پہلے مشرکین کی جہالت کو بیان کیا کہ جن چیزوں کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں، اب ان آیات میں شرک کی شناعت اور قباحت اور مشرکین کی حماقت اور بے وقوفی کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتے

ہیں کہ جن چیزوں کو یہ لوگ معبود بنائے ہوئے ہیں وہ چیزیں عبادت اور پرستش کے قابل نہیں ہیں، عبادت کے لائق تو وہ ذات ہے جو قادرِ مطلق ہو اور یہ بت تو عاجز مطلق ہیں، ان میں کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں، یہ تو اس قدر عاجز ہیں کہ اپنے اوپر سے مکھی کو بھی دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے انسان! تمہارے سمجھنے کے لیے ایک مثال بیان کی جاتی ہے، پس اس مثال کو کان کھول کر خوب غور سے سنو! جن بتوں کو تم اللہ کے سوا اپنی مدد کے لیے پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے حالانکہ وہ (مکھی) ایک انتہائی حقیر اور صغیر جانور ہے، اگرچہ وہ سب اس کام کے لیے جمع بھی ہو جائیں، اور متفق ہو کر پیدا کرنا چاہیں تو بھی مکھی جیسی حقیر اور چھوٹی سی چیز کو پیدا نہیں کر سکیں گے اور پیدا کرنا تو درکنار ان کی عاجزی اور بے بسی کا حال یہ ہے کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ مشرکین اپنے بتوں پر زعفران لگاتے اور ان کے سامنے کھانے اور مٹھائیاں رکھتے تو مکھیاں جمع ہو جاتیں اور اس میں سے لے جاتیں تو یہ بت ان مکھیوں سے بھی بدتر ہوئے اور وہ مکھیاں ان بتوں سے بہتر ہوئیں کہ وہ ان سے چھین لے جاتی ہیں، اور یہ بت ان سے کچھ نہیں چھین سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں اور کمزور ہیں۔ طالب سے مراد عابد اور بت پرست ہے اور مطلوب سے مراد ان کا معبود یعنی بت ہے۔ افسوس کہ ان نادانوں نے اللہ کی قدر نہ جانی، جیسا کہ اس کی قدر دانی کا حق تھا، جہالت اور حماقت کی حد ہے کہ خالقِ ارض وسماء کے ساتھ ان بتوں کو معبودیت میں شریک کر لیا کہ جو ایک مکھی کے سامنے بھی عاجز اور لاچار ہیں۔

بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا اور عزت وغلبہ والا ہے، عبادت تو اس کا حق ہے، قوی اور عزیز ذات کو چھوڑ کر ایک حقیر اور عاجز چیز کو خدا بنا لینا پرلے درجہ کی حماقت اور بے وقوفی ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵، ص ۵۶]

رئیس المفسرین ابوالفداء حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں، ''ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی عبادت اور پرستش کی جاتی ہے ان کی

عاجزی اور کمزوری اوران کے پجاریوں کی کم عقلی بیان ہورہی ہے کہ اے لوگو! یہ جاہل جس جس کی بھی اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں، رب تعالیٰ کے ساتھ یہ جو شرک کرتے ہیں ان کی ایک نہایت عمدہ اور واقعہ کے مطابق مثال بیان ہورہی ہے، ذرا توجہ سے سنو! کہ ان کے تمام بت، بزرگ وغیرہ جنہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہیں، جمع ہو جائیں اور ایک مکھی بنانا چاہیں تو سارے عاجز آجائیں گے اور ایک بھی پیدا نہ کرسکیں گے۔

مسندِ احمد میں ایک حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا؟ جو میری طرح کسی کو بنانا چاہتا ہے، اگر کسی کو واقعی قدرت حاصل ہے تو ایک ذرہ، ایک مکھی، یا ایک دانہ اناج کا ہی خود بنادیں۔'' بخاری اور مسلم میں الفاظ یوں ہیں کہ وہ ایک ذرہ یا ایک جَو بھی بنادیں۔ اچھا، ان کے معبودانِ باطل کی مزید کمزوری اور عاجزی سنو کہ یہ ایک مکھی کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتے، وہ ان کا حق اور ان کی چیز ان سے چھینے چلی جا رہی ہے، یہ بے بس ہیں، اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ اس سے اپنی چیز ہی واپس لے لیں، بھلا مکھی جیسی حقیر اور کمزور مخلوق سے بھی جو اپنا حق نہ لے سکے اس سے زیادہ ناتواں، کمزور، عاجز، بے بس اور گرا پڑا کوئی اور ہوسکتا ہے؟! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ طالب سے مراد بت اور مطلوب سے مراد مکھی ہے۔

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہی قول مختار ہے اور ظاہر عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ طالب سے مراد عابد (بت پرست) اور مطلوب سے مراد اللہ کے سوا دیگر معبودانِ باطل، (آگے فرمایا کہ) اللہ کی قدر وعظمت ہی ان کے دلوں میں رچی بسی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اتنے بڑے طاقتور اللہ کے ساتھ ایسی حقیر و عاجز مخلوق کو کیوں شریک کرتے جو مکھی اڑانے کی بھی قدرت نہیں رکھتی، جیسے مشرکینِ قریش کے بت تھے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت وقوت میں یکتا ہے، تمام چیزیں بلا نمونہ سب سے پہلے اس نے پیدا کردی ہیں، پھر کسی سے بھی مدد لیئے بغیر سب کو ہلاک کرکے دوبارہ اس سے بھی زیادہ آسانی سے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ بڑی مضبوط پکڑ والا، اول وآخر پیدا کرنے والا، رزق دینے والا اور بے حساب قوت رکھنے والا ہے،

سب کچھ اس کے سامنے ہیچ ہے، کوئی اس کے ارادہ کو بدلنے والا، اس کے فرمانِ ذی شان کو ٹالنے والا اور اس کی عظمت وسلطنت کا مقابلہ کرنے والا نہیں ہے وہ واحد وقہار ہے۔"

[تفسیر ابن کثیر ج۳، ص ۴۷۷]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اے لوگو! اللہ کے سوا تم جن خود ساختہ معبودوں کو مصائب میں پکارتے ہو وہ بالکل عاجز ہیں، تمہاری مدد کرنا تو درکنار وہ اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور وہ اپنے نفع ونقصان کے مالک بھی نہیں، لہٰذا وہ نذر و نیاز کا استحقاق بھی نہیں رکھتے، اس طرح اس سے شرک اعتقادی اور شرک فعلی، دونوں کی نفی ہوگئی، معبودانِ باطلہ کے عاجز و بے بس ہونے اور غیر اللہ کی پکار کے بے سود ہونے کو ایک تمثیل سے واضح کیا گیا ہے یعنی اے مشرکین! اللہ کے سوا تم جن خود ساختہ معبودوں کو مصائب و حاجات میں پکارتے ہو وہ تمہاری حاجت برآری اور دادرسی نہیں کر سکتے، وہ بالکل عاجز ہیں، حاجت روا اور مشکل کشا تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو سب کا خالق و مالک ہے اور تمہارے معبود تو سارے مل کر بھی ایک مکھی پیدا کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے، مکھی کو پیدا کرنا تو درکنار ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں سے مکھی کچھ تھوڑا سا اپنے منہ میں ڈال کر لے اڑے تو وہ اس کے منہ سے چھڑانے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تو جو معبود اس قدر عاجز اور بے بس ہو، ان کی عبادت کرنا، ان کو کارساز سمجھ کر مصائب میں پکارنا اور ان کی رضا جوئی کے لیے نذریں نیازیں دینا نہایت ہی بے عقلی کی بات ہے، ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ طالب یعنی غیر اللہ کو پکارنے والا اور مطلوب یعنی معبود باطل، دونوں کمزور ثابت ہوئے، طالب اس طرح کہ اس نے غیر محل سے حاجت مانگی اور مطلوب اس طرح کہ اپنے پجاری کو کچھ نہ دے سکا۔

اس آیت کریمہ سے اولیاء اللہ کو حاجات و مشکلات میں پکارنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، بعض جہلاء کا خیال ہے کہ اولیاء اللہ ان کی حاجت روائی کرتے ہیں، اس لیے وہ ان کی نذریں دیتے ہیں، وہ ان کو قبروں سے متصرف ومختار سمجھتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں متشکل ہو کر قبروں سے باہر نکل آتے ہیں اور ان کی مدد

کرتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور عالم مستند ترین تفسیر روح المعانی میں رقمطراز ہیں۔اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَاباً" اشارة الی ذم الغالین فی اولیاء اللّٰہ تعالیٰ حیث یستغیثون بھم فی الشدة غافلین عن اللّٰہ تعالیٰ وینذرون لھم النذور و العقلاء منھم یقولون انھم و سائلنا الی اللّٰہ تعالیٰ.......... ولایخفی انھم فی دعوٰھم اشبہ الناس بعبدة الاصنام القائلین انما نعبدھم لیقربونا الی اللّٰہ زلفی.......... ومنھم من یثبت التصرف لھم جمیعاً فی قبورھم.......... والعلماء منھم یحصرون التصرف فی القبور فی اربعة او خمسة واذا طولبوا بالدلیل قالوا ثبت ذلک بالکشف قاتلھم اللّٰہ تعالیٰ ما اجھلھم واکثر افترائھم و منھم من یزعم انھم یخرجون من القبور و یتشکلون باشکال مختلفة...... و کل ذلک باطل لااصل لہ فی الکتاب والسنة وکلام السلف وقد افسد ھولاء علی الناس دینھم الخ. [روح المعانی ج ۱۷، ص ۱۱۲،۱۱۳] (اس کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے)۔

ان ظالموں نے خدا کی قدر نہ پہچانی۔ اس حی و قیوم اور قادر و متصرف کے علاوہ ایسے عاجز معبودوں کو پکارنے لگے جو ان کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، نہ ان میں حاجت پوری کرنے اور مصیبتیں دور کرنے کی طاقت ہے بلکہ وہ تو ایک مکھی سے بھی عاجز ہیں۔ حالانکہ عبادت اور پکار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، اللہ تعالیٰ کا حق اس کی عاجز مخلوق کو دینا بہت بڑی بے انصافی اور بدترین قدر ناشناسی ہے اور اللہ تعالیٰ جو قدرت و طاقت کا مالک ہے اور سب پر غالب ہے، اس کے مقابلہ میں اس کی عاجز مخلوق کو کارساز سمجھنا ہرگز قرین عقل و انصاف نہیں ہے۔

[دیکھیے، جواھر القرآن ص ۷۴۸ تا ص ۷۴۹ ملخصاً]

☆☆☆

(۴۰)

﴿نورِ ہدایت اور ظلمتِ ضلالت کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [النور: ۳۵]

ترجمہ

’’اللہ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے، اللہ کے نور کی صفت، جیسے ایک طاقچہ جس میں ایک چراغ ہو، چراغ شیشہ کے فانوس میں ہو، شیشہ کا فانوس ایسا معلوم ہوتا ہو جیسے چمکتا تارہ، وہ چراغ برکت والے درخت یعنی زیتون سے روشن ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، اس کا تیل اتنا چمکیلا اور روشن ہے کہ قریب ہے کہ وہ خود بغیر آگ کو مس کرنے کے روشن ہو جائے، نور بالائے نور ہے، اللہ اپنے نور کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت یاب کر دیتا ہے اور لوگوں کے فائدے کے لیے اللہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔‘‘

تشریح:

گزشتہ آیات میں فرمایا تھا کہ ہم نے روشن آیات نازل کیں جس سے مقصود یہ تھا کہ لوگ گمراہی کی ظلمت سے نکل کر نور ہدایت میں آ جائیں، اس لیے ان آیات میں پہلے نور ہدایت اور ظلمت ضلالت کی مثال بیان فرماتے ہیں، پھر اہل ہدایت اور اہل ضلالت کا حال وانجام بیان فرماتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ ایمان و ہدایت کے دلائل نور مبین کی طرح روشن ہیں اور مذاہب کفر انتہائی ظلمت اور تاریکی میں ہیں۔ سابقہ آیت میں فرمایا تھا۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ "یعنی ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے آیات مبینات کو نازل کیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات بلاشبہ انوار ہیں اور یہ قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نور ہے، جیسا کہ ایک جگہ پر فرمایا۔ "فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا" اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: "قَدْجَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا"۔

لہٰذا ان آیات میں نور ہدایت کی مثال بیان کرتے ہیں کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، ساری کائنات کو جو نور وجود ملا ہے وہ سب اسی نور السموات والارض کے نور کا عکس اور پرتو ہے، اللہ تعالیٰ نورِ حق اور نورِ مطلق ہیں جو آسمان وزمین کے تمام حسی اور عقلی انوار پر غالب ہے، آسمانوں وزمین کی حدود میں جو ظاہری، باطنی، حسّی اور معنوی نور اور روشنی ہے وہ سب اسی نورِ حق اور نور مطلق کا فیض ہے، آسمان وزمین کے تمام انوار محدود ہیں اور اللہ تعالیٰ نور الانوار ہے اور اس کا نور غیر محدود ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور اصلی ہے اور مخلوقات کا نور عارضی اور خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے اور اس کا پیدا کردہ ہے، اگر وہ پیدا نہ کرتا تو دنیا کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی، اسی نے اپنی قدرت کاملہ سے آسمان وزمین کو عدم کی ظلمت سے نکال کر وجود کا لباس پہنایا اور ان کو ظاہر اور آشکارا کیا۔ آسمان وزمین میں جس قدر بھی انوار اور سامان ظہور موجود ہیں وہ سب اسی نور السموات والارض کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مثلاً آفتاب و ماہتاب کا نور اور نجوم وکواکب کا نور اور روشنی عالمگیر ہے اور نور بصر (آنکھ کی روشنی) جس سے سامنے کی چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور نور بصیرت (چشم دل)

اور نور عقل جس کے ذریعہ حسی اور عقلی چیزوں کا ظہور ہوتا ہے، یہ سب اس کی مخلوق ہیں۔

اور اللہ کا نور جو اس کی صفت ہے، وہ قدیم اور ازلی ہے اور بے چون و چگون ہے، یعنی وہاں کسی کمیت اور کیفیت کا ذکر نہیں اور "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" میں جس نور کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت (نسبت) کی گئی ہے وہ اللہ کی صفت ہے اور یہ حسی اور عقلی انوار جس سے آسمان و زمین لبریز ہیں وہ سب اس کے نور قدیم کا ایک ادنیٰ سا عکس اور پرتو ہیں، اس لیے نور کو آسمان اور زمین کی طرف مضاف کیا گیا ہے کہ یہ آسمان و زمین اس کے جمال بے مثال کے ایک ادنیٰ پرتو سے روشن ہیں، جیسا کہ فرمایا: وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا"۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لیے جو آیات بینات نازل فرمائیں وہ سب باطنی اور غیبی انوار ہیں جن سے حق و باطل کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور معنوی اعتبار سے آیات بینات کا نور، آفتاب و ماہتاب کے نور سے کہیں زیادہ روشن ہے۔ جس طرح نورِ عقل، نور آفتاب سے بڑھ کر ہے، اسی طرح نورِ وحی، نورِ عقل سے بڑھ کر ہے، نور آفتاب سے صرف محسوس چیزوں کا ظہور ہوتا ہے اور نور عقل سے محسوس اور معقول کے ظاہر و باطن کا انکشاف اور ظہور ہوتا ہے اور نورِ وحی سے ان چیزوں کا ظہور و انکشاف ہوتا ہے جو عقل کے ماوراء ہیں، جہاں نور عقل کی رسائی نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نور کی حقیقت یہ ہے کہ جو چیز بذات خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرنے والی ہو، پس نور اصل میں اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور وہ بذات خود ظاہر ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ظاہر ہے وہ اس کے ظاہر کرنے سے ظاہر ہوا ہے، جہاں کہیں بھی کوئی ظاہری یا باطنی نور اور روشنی ہے وہ اسی نور السموات والارض کے حسن و جمال اور اس کے فضل و کمال کا ایک پرتو (عکس) ہے، ممکنات، عدم کے ظلمت کدہ میں پڑی ہوئی تھیں اور باہم کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس لیے کہ جب اندھیرا ہوتا ہے تو ساکن و متحرک اور بلند و پست چیز میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون اوپر ہے اور کون نیچے؟ جب نور اور اجالا آتا ہے اور اندھیرا دور ہوتا ہے تب حقیقتیں اور کیفیتیں آشکار ہوتی ہیں اور

اچھے برے اور جوہر وعرض میں امتیاز ہوتا ہے، اسی طرح سمجھو کہ عدم، ظلمت اور تاریکی ہے اور وجود، نور اور ظہور ہے، اگر وہ نور السموات والارض (اللہ تعالیٰ) ممکنات کو نور وجود عطا نہ کرتا تو تمام ممکنات، عدم کی ظلمت اور تاریکی میں پڑی رہتیں اور بلندی و پستی میں کوئی امتیاز نہ ہو پاتا، آنکھ اور عقل میں روشنی نہ ہوتی تو چیز کا ادراک کیسے ہوتا؟ جس طرح زمین اپنی ذات کے اعتبار سے تاریک اور بے نور ہے، آفتاب کے عکس اور پرتو سے اس میں روشنی آئی اور زمین کی چیزیں دکھائی دینے لگیں، اندھیری رات میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون زید ہے اور کون خالد ہے اسی طرح ممکنات کی عدم کی ظلمت کو سمجھو کہ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے اندھیرے میں ہیں، جب نور السموت والارض کی تجلی سے نور وجود کا کوئی عکس ان پر پڑ جاتا ہے تو ظاہر ہو جاتے ہیں۔

آفتاب و ماہتاب ظاہری نور ہیں جن سے دنیا کی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اور بصر (آنکھ) بھی ایک ظاہری نور ہے جس سے رنگوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور بصیرت (چشم دل) ایک باطنی نور ہے اس سے چیزوں کی حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، آسمان، آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کی روشنی سے روشن ہے اور زمین، انبیاء، علماء اور اولیاء اللہ کے انوار علم اور انوار ذکر و تسبیح سے منور اور روشن ہے، الغرض آسمان و زمین میں جس قدر حسی اور عقلی انوار موجود ہیں وہ سب اسی نور السموات والارض کے پیدا کردہ ہیں جس طرح نور، اشیاء کے ظہور کا سبب ہے اسی طرح سمجھو کہ وہ نور السموات والارض آسمانوں اور زمینوں کے ظہور کا سبب ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سارا کون و مکان اور زمین و آسمان ظہور میں آیا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی سب ہستیوں سے زیادہ ظاہر اور روشن ہے اور سب ہستیوں کا ظہور اسی کی وجہ سے ہے، اسی لیے فرمایا: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، یعنی آسمان و زمین اور ان کی تمام چیزیں اسی کے ظاہر کرنے سے ظہور میں آئیں۔

پس جس طرح نور، اللہ کی صفت ہے اسی طرح ظہور بھی اللہ کی صفت ہے، جیسا کہ فرمایا: ''هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ''۔[الحدید]

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس جملہ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" میں پہلے اپنے نورِ عالم کا ذکر فرمایا جو اس کی صفت ذات ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے، پھر اگلی آیت میں اپنے نورِ خاص یعنی نورِ ہدایت اور نورِ توفیق کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو اس کی صفت فعل ہے، کیونکہ ہدایت اور توفیق عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا ایک فعل ہے اور اس کا ایک فضل ہے اور بندہ کو جو نور ہدایت ملتا ہے وہ اس کے فعل کا مفعول اور مخلوق ہے اور اس کے فضل و کرم کے دستر خوان کا ایک لقمہ ہے جس کو وہ مل گیا وہ جی اٹھا، پس ان آیات میں اس کے پیدا کردہ اور عطا کردہ نور ہدایت اور نور توفیق کی امثال بیان فرماتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے نور ہدایت کی مثال جو اس کی طرف سے مومن کے دل میں ڈالا گیا ہے اس کی عجیب شان ہے اور وہ شان ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہے تاکہ اس کی روشنی منتشر نہ ہو اور وہ چراغ شیشہ کے ایک روشن اور چمک دار ستارے کی طرح ہے اور وہ چراغ ایک مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جا رہا ہے اور مبارک درخت زیتون کا ہے جو نہ سمت مشرق میں ہے اور نہ سمت مغرب میں ہے، بلکہ ایک کھلے میدان میں ہے جس کو ہر طرف سے دھوپ پہنچ رہی ہے، ایسے درخت کا تیل نہایت صاف وشفاف اور روشن ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ درخت کسی پہاڑ یا غار کی آڑ میں نہیں ہے، اس کے اور آفتاب کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے، ایسے درخت کا تیل نہایت صاف اور چمکتا ہوا ہوتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ اس کا تیل اس قدر صاف وشفاف ہے کہ قریب ہے کہ وہ تیل خود بخود جل اٹھے اور روشن ہو جائے، اگرچہ اس کو آگ نہ لگی ہو، یعنی وہ تیل اس قدر صاف وشفاف ہے کہ جلتا ہوا نظر آتا ہے اور جب اس کو آگ لگ گئی تو پھر نور بالائے نور ہے، ایک نور تیل کا اور ایک نور آگ کا، جب دونوں جمع ہو جائیں تو نور پر نور اور روشنی پر روشنی ہے، اس آیت میں جو مثال ذکر کی گئی ہے وہ دراصل نور ایمان اور نور ہدایت کی مثال ہے جو مومن کے دل میں ہے، ایک نور تو فطرت سلیمہ کا ہے اور دوسرا نور وحی کا ہے اور مقصود یہ ہے کہ وہ نور بڑا ہی عظیم الشان ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف دو نور ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اسی طرح مومن کا دل

فطری طور پر ہدایت پر عمل کرنے لگتا ہے اور اپنی فطرت سلیمہ سے راہ راست پر چلنے لگتا ہے، قبل اس کے کہ اس کو ہدایت کا علم ہو، پھر جب اس کو ہدایت کا علم ہوتا ہے تو اس کی ہدایت میں اور زیادتی ہو جاتی ہے اور ایک ہدایت پر دوسری ہدایت حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی اول تو مومن کا دل خود روشن تھا، جب اس پر اس کو نور ہدایت ملا تو نور علی نور اور ہدایت بر ہدایت حاصل ہوگئی۔ [تفسیر ابن جریر ج ۱۸، ص ۹۶]

یحییٰ بن سلام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مومن قانت کا دل بتانے سے پہلے ہی حق کو پہچان لیتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله ''یعنی مومن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نور سے دیکھتا ہے۔ [تفسیر کبیر ج ۲، ص ۳۲۱]

مومن قانت کا جسم یا اس کا سینہ، طاق کی مثل ہے اور مومن کا دل صاف و شفاف آئینہ اور قندیل کے مثل ہے جو شکوک وشبہات کے زنگ سے پاک وصاف ہے اور نور معرفت اور نور بصیرت چراغ اور شمع کے مثل ہے جو مومن کے دل میں روشن ہے اور مومن قانت کی فطرت سلیمہ اور اس کی فطری صلاحیت روغن اور تیل کے مثل ہے، جو اللہ کی طرف سے مومن کو عطا کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا'' اور یہی فطری صلاحیت اور حسن استعداد اس کے چراغ معرفت کا مادہ ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''کل مولود یولد علی الفطرة'' اور دوسری حدیث ہے: ''خلقت عبادی کلهم حنفاء'' اور مبارک درخت سے صدق واخلاص کا درخت مراد ہے، کہ جو نہ مشرقی سمت ہے اور نہ مغربی سمت، بلکہ درحقیقت وہ جنت کا درخت ہے، ایسا مخلص مومن جس کا دل چراغ معرفت وہدایت سے منور اور روشن ہو تو ایسے مومن کا دل نورانیت کی وجہ سے بسا اوقات نور معرفت سے حق تک پہنچ جاتا ہے، اگرچہ ابھی تک اس کو اس حق کا علم نہ ہوا ہو، وہ دل کی شہادت سے پہچان لیتا ہے کہ یہ بات حق ہے اور یہ ناحق ہے، ایسے لوگ فطری نور اور ازلی عنایت کے باعث اچھے برے میں تمیز کر کے فضائل اور محاسن کی طرف رغبت کرتے ہیں اور طبعی طور پر مذموم اور قبیح چیزوں سے نفرت

کرتے ہیں جیسا کہ بعض اوقات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دل، نزول وحی سے پہلے ہی حق کی طرف پہنچ جاتا تھا اور اپنی نور بصیرت سے حق و باطل کے فرق کو سمجھ لیتا تھا اور بعد میں اسی کی موافقت میں وحی کا نزول ہوتا تھا اور نزول وحی کے بعد ان کے نور بصیرت اور نور معرفت میں اور زیادتی ہو جاتی تھی اور اس نور باطنی کے ساتھ جب نور وحی بھی مل جاتا تو نور علی نور ہو جاتا، ایک ظاہری نور اور ایک باطنی نور۔

الغرض مومن قانت پہلے ہی فطرت سلیمہ اور خداداد قلب سلیم کی بناء پر اجمالی طور پر حق کو پہچان لیتا ہے اور یکلخت اس کے دل میں ایسا جوش اٹھتا ہے کہ اس کام کے کرنے پر آمادہ بلکہ مجبور ہو جاتا ہے، پھر جب حکم خداوندی کو سنتا ہے تو تفصیلی طور پر حق کو جان لیتا ہے اور اس کے یقین واطمینان میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، جب نور فطرت کے ساتھ نور شریعت بھی مل جاتا ہے تو نور علی نور کا مصداق ہو جاتا ہے اور اس باطنی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر شرح صدر سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد فرمایا۔ ''اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ'' نیز فرمایا: ''فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ'' ایسا شخص اگرچہ کسی کام کے جائز اور ناجائز ہونے کو نہ جانتا ہو مگر طبعی اور فطری طور پر اس کا دل حلال چیز کے کھانے پر آمادہ ہوتا ہے اور حرام چیز کے کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ اس سے کراہت اور نفرت کرتا ہے اور ظاہری طور پر اس کو اس چیز کے حلال اور حرام ہونے کا بالکل علم نہیں ہوتا۔ یہ غیبی القاء ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو شریعت کی اصطلاح میں محدَّث من اللہ اور ملہم من اللہ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اولیاء اللہ کو کوئی امر پیش آتا ہے اور ان کو اس بارے میں حکم شرعی کا علم نہیں ہوتا مگر نور باطنی کی وجہ سے ان کو امر حق کے متعلق شرح صدر ہو جاتا ہے اور وہ پہلے ہی سے اس کو اختیار کر لیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی فطرت سلیمہ میں قبول حق کی استعداد اس قدر قوی تھی کہ قریب تھا کہ دیا سلائی دکھائے بغیر ہی جل اٹھے۔ اب ذرا اس کو دیا سلائی دکھائی اور ذرا سی آگ لگائی تو فوراً اس کی فطری روشنی بھڑک اٹھی، لہٰذا اس نور فطرت کے ساتھ اگر نور شریعت بھی لگ جائے تو یہ روشنی اس قدر تیز ہو جائے کہ نور علی نور کا

مصداق بن جائے اور حدیث میں آیا ہے: "استفت قلبک وان افتاک المفتون"یعنی جب تجھے کوئی بات پیش آئے تو اپنے دل سے فتویٰ لو، اگر چہ مفتی فتویٰ دیا کریں۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کا دل آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو اور نفسانی ظلمتوں اور کدورتوں سے پاک وصاف ہو، تو ایسے لوگوں کے لیے جائز ہے کہ اپنے قلب سلیم سے فتویٰ طلب کرلیں، لیکن جو چراغِ دل، مشرقی یا یا مغربی نفسانی اور شہوانی درختوں کے کشید کردہ تیل سے جل رہا ہو، اس سے فتویٰ طلب کرنا جائز نہیں ہے۔ غرض یہ کہ مومن قانت کو جو نور ہدایت عطا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور خاص عنایت ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو اپنے اس خاص نور کی راہ دکھاتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے، یہ نور، محض اس کا فضل وکرم اور احسان ہے جس کو چاہے اپنے فضل سے نوازدے، اس نور کی ابتداء بھی اسی کی طرف سے ہے، جیسا کہ فرمایا۔ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اور اس نور کی انتہاء بھی اس کی مشیت پر ہے، جیسا کہ فرمایا: "یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ۔"

اس آیت کریمہ میں نورِ ہدایت سے نور توفیق مراد ہے، جو ان لوگوں کو عطا ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظر کرم اور نظر عنایت ہوتی ہے۔

(آگے فرمایا) اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے، تاکہ ان پر حق وباطل کا فرق واضح ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے کہ اس نور کے لائق کون ہے اور کون نہیں، جو ذات دینے والی ہے وہ جاننے والی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ان کے وجود سے پہلے ہی کامل اور محیط علم تھا۔ اس آیت میں ہدایتِ عام کا بیان ہے جس میں تمام لوگ شریک ہیں جیسا کہ لفظ "لِلنَّاسِ" سے عموم کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ضرب الامثال پر جو ہدایت مرتب ہوتی ہے وہ ہدایتِ عامہ ہوتی ہے اور گزشتہ آیت یعنی "یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ" میں ہدایتِ خاصہ کا بیان ہے کیونکہ وہاں لفظ "مَنْ یَّشَآءُ" موجود ہے جو خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔

بہرحال! اکثر علمائے امت کے نزدیک اس آیت مبارکہ میں مومن کے نور کی

مثال ذکر کی گئی ہے کہ اس کے آئینہ دل میں ہدایت اور معرفت کا ایک چراغ اور شمع روشن ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس آیت میں حضور سرورِ دو عالم ﷺ کے نور کی مثال بیان کی گئی ہے کہ "مشکوٰۃ" سے آنحضور ﷺ کا سینہ مبارک مراد ہے اور "زجاجہ" سے آپ کا قلب منور مراد ہے جو انوارِ الٰہی سے منور اور روشن ہے جس کا اصل مادہ ملتِ ابراہیمیہ حنیفیہ ہے اور "شجرہ مبارکہ" حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں جو شجرۃ الانبیاء کے لقب سے معروف ہیں، یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔

[تفسیر قرطبی ج ۱۲، ص ۲۶۲]

اور پہلی تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ صلے يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ" ان آیات میں یہ بتاتے ہیں کہ وہ اہلِ ہدایت کون لوگ ہیں؟ اور وہ نورِ ہدایت یعنی وہ روشنی کہاں ملتی ہے؟ چنانچہ فرماتے ہیں کہ وہ روشنی مسجدوں اور خانقاہوں میں ملتی ہے۔ جہاں صبح و شام اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے اور یہ روشنی ان لوگوں کو ملتی ہے جو صبح و شام اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اور اس کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں اور ان رجالِ آخرت کی ہم نشینی اور صحبت میں ملتی ہے جو بظاہری دنیا کی تجارت میں لگے ہوئے ہیں لیکن در پردہ آخرت کی تجارت میں سرگرداں ہیں، یہ لوگ اہلِ ہدایت ہیں جن کے دِل نورِ ہدایت سے منور اور روشن ہیں، چنانچہ اس آیت مبارکہ میں فرماتے ہیں کہ اے لوگو! ہم نے تمہارے سمجھانے کے لیے یہ مثال بیان کر دی ہے، پس اگر تم نورِ ہدایت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ نور ایسے گھروں میں ملے گا جن کے ادب و احترام کا اور بلند کرنے اور ان کی تعظیم کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس بات کا حکم دیا ہے کہ ان گھروں میں اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے۔ اس میں تسبیح و تہلیل اور تلاوتِ قرآنِ پاک اور دیگر اذکار و اوراد سب داخل ہیں، گھروں سے مسجدیں اور خانقاہیں مراد ہیں جن میں شب و روز اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے،

ہدایت کے چراغ تمہیں مسجدوں میں ملیں گے وہاں جاؤ۔ اور ان گھروں میں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے ہیں ایسے مردانِ ہمت، جن کی صفت یہ ہے کہ کوئی دنیاوی تجارت اور کوئی خرید وفروخت ان کو اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔ یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ بظاہر دنیاوی تجارت میں مشغول ہیں لیکن درحقیقت یہ لوگ ایسے باہمت اور مردانِ شجاعت ہیں کہ اصل مقصود ان کا آخرت کی تجارت ہے، دنیا کی تجارت ان کو آخرت سے غافل نہیں کرتی۔ ان کا اصل مقصود دین ہے اور دنیا اس کے تابع ہے کیونکہ اگر انہیں دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے: "**لا یلهیهم ذکر اللّٰه عن التجارة**" یعنی اللہ کا ذکر ان کو تجارت سے غافل نہیں کرتا، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل مقصود دین ہے اور دنیا اس کے تابع ہے۔

[دیکھئے: معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵، ص ۱۲۷ تا ص ۱۳۲]

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ "تفسیر مظہری" میں رقمطراز ہیں

"بعض اہلِ علم نے نور کی تعریف یہ کی ہے کہ نور اس کیفیت کا نام ہے جس کو آنکھ سب سے پہلے ادراک کرتی ہے، پھر اس کے ذریعہ سے دوسری قابلِ دید چیزوں کا انکشاف کرتی ہے، جیسے چاند سورج کی روشنی کہ پہلے چاند سورج اس سے روشن ہوتے ہیں، پھر ان چیزوں کا اس سے ظہور ہوتا ہے جو سورج و چاند کے سامنے ہوتی ہیں، اس تعریف کے مطابق لفظِ نور کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ پر ممکن نہیں، کیونکہ یہ نور مادی ہے اور عوارض مادیات میں سے ہیں، لامحالہ تاویل کی جائے گی، چنانچہ تاویل کی چند صورتیں ہیں:

(۱) مضاف کو محذوف مانا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ، زمین و آسمان کو نور عطا کرنے والا ہے۔

(۲) مصدر کو مبالغہ کے طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر محمول کیا جائے، جیسے زید کا اگر بہت زیادہ منصف ہونا ظاہر کرنا ہو تو کہتے ہیں: زَیْدٌ عَدْلٌ. یعنی اللہ کی ذات میں اتنی زیادہ نور بخشی ہے کہ گویا خدا خود نور ہے۔

(۳) مصدر (نور) اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ، زمین و آسمان کو چاند سورج اور ستاروں، انبیاء، ملائکہ اور مومنوں سے روشن کرنے والا ہے۔ [قالہ الضحاکؒ] یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین کو درختوں اور ہری بھری گھاس اور پودوں سے نورانی بنا دینے والا بھی اللہ ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ اللہ نور ہیں، یعنی تمام انوار اسی کے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ہمارے لیے رحمت ہے، مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو رحمت ملی ہے وہ اسی سے ملی ہے۔

(۵) بعض اوقات مدح کے طور پر بھی لفظِ نور کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک شاعر کا شعر ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب کسی رات کو عبداللہ مرو سے چلا جاتا ہے تو مرو کا حسن اور نور چلا جاتا ہے۔

(۶) بعض کہتے ہیں کہ نور سے مراد مدبر ہے، جو قوم کا بڑا سردار، مدبر اور منتظم ہوتا ہے اس کو نور القوم کہا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ نور وہ کیفیت ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والی ہو اور اصل ظہور وجود وہستی ہے، جس طرح اصل خفاء عدم ونیستی ہے، پس نور السمٰوٰت سے مراد ہے آسمانوں کا موجود ہونا، اللہ تعالیٰ بذاتِ خود موجود ہے اور دوسری چیزوں کو موجود کرنے والا ہے۔ قوتِ باصرہ کا اطلاق اس پر بھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اشیاء کا ادراک اس پر موقوف ہے اور بصیرت تو بہر حال اعلیٰ ترین مُدرک ہے، آنکھ اپنا ادراک نہیں کرتی اور بصیرت اپنا بھی ادراک کرتی ہے اور اپنی ذات کے علاوہ تمام کلیات و جزئیات کا ادراک بھی اسی پر موقوف ہے، یہی حقائق پر غور کرتی اور ان کی تحلیل وترکیب کرتی ہے، اس لیے اس کو نور کہنا بدرجہء اولیٰ لازم ہے اور چونکہ بصیرت بذاتِ خود اختیار کامل کے ساتھ نہ اپنی ذات کا ادراک کر سکتی ہے کہ دوسری چیزوں کا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فیضان ادراک ہوتا ہے، کبھی بلا واسطہ اور کبھی ملائکہ اور انبیاء کے واسطہ سے، اس لیے ان سب کو انوار کہا جاتا ہے، ملائکہ بھی نور ہیں، انبیاء بھی نور ہیں اور سب سے بڑھ کر

اللہ نور ہے۔ اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس تفسیری قول سے ہوتی ہے جسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اہلِ سماء وارض کا ہادی (راہنما) ہے، اس کی راہنمائی سے سب حق کی طرف چل رہے ہیں اور حیرانگی اور گمراہی سے نجات پار ہے ہیں۔ لفظ نور کی اضافت بتا رہی ہے کہ اس کا جلوہ سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے یا یہ کہ اس کے اندر تمام حسّی اور عقلی نور سمائے ہوئے ہیں۔

"مَثَلُ نُوْرِہٖ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ نور جو مومن کے دل میں جگمگاتا ہے جس کی پرتواندازی کی وجہ سے مومن کا دِل، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی طرف راستہ پاتا ہے، عقلِ انسانی جس کو پانہیں سکتی، اس نور کی ضیاء پاشی کی وجہ سے وہاں تک پہنچ جاتی ہے، اور جس کے ذریعہ یہ عقل انسانی، حق کو حق اور باطل کو باطل جان لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پڑھتے تھے: مثل نوره فی قلب المؤمن. حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے اس نور کی صفت و حالت جو اللہ تعالیٰ نے مومن کو عطا فرمایا ہے۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ "نُوْرِہٖ" کی ضمیر مومن کی طرف راجع ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے مومن کے دل کے نور کی صفت۔ یہ مومن وہ بندہ ہے جس کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایمان اور سینہ کے اندر قرآن جما دیا ہے۔

حسن اور زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نور سے مراد قرآن ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اور امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نور سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارک مراد ہے۔

بعض کے نزدیک نور سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت مراد ہے۔ بندے کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

"كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ" مشکوٰۃ طاقچہ جس میں آر پار سوراخ نہ ہو، اگر

آر پار سوراخ ہوتو اس کو کُوَّةٌ (روشن دان) کہتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک مشکوٰۃ حبشی زبان کا لفظ ہے۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ کا معنی قندیل کیا ہے، اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا، یعنی نور قندیل کی طرح جس میں چراغ موجود ہو۔ اور مِصْبَاحٌ کا معنی ہے چراغ، یہ اسمِ آلہ بروزن مفعال ہے۔ صبح کا معنی ہے روشنی اور مصباح کا معنی روشنی کا آلہ۔ "اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ" امام زجاج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شیشہ کے اندر نور اور آگ کی روشنی بہت زیادہ جھلکتی ہے، اسی لیے لفظ زجاجہ ذکر کیا۔ "اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّهَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ" اس جملہ میں لفظ "دُرِّیٌّ" میں یا نسبتی ہے، دُرّ کا معنی ہے موتی، یعنی موتی جیسا ستارہ، صفائی اور حسن میں موتی کی طرح۔

شبہ:

ستارے کی چمک اور روشنی تو موتی سے زیادہ ہوتی ہے، پھر موتی سے تارے کو تشبیہ دینے کا کیا معنی؟ مشبہ کا وصف تو مشبہ بہ میں زیادہ ہونا چاہیے، حالانکہ اس جگہ مشبہ میں وصف زائد ہے؟

ازالہ:

مطلب یہ ہے کہ وہ ستارا تمام ستاروں سے زیادہ چمکدار اور پُر نور ہے، جیسے موتی کا دانہ تمام دانوں سے زیادہ صاف اور چمکدار ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ پانچ ستارے جو سب سے بڑے ہیں وہ یہ ہیں: زحل، مریخ، مشتری، زہرہ اور عطارد۔ ان میں سے کسی ایک ستارے کو "کوکب درّی" کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید زہرہ کو کہتے ہیں، کیونکہ زہرہ کی چمک دمک اور روشنی دوسرے ستاروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

شبہ:

دوسرے ستاروں سے تشبیہ دی ہے، سورج چاند سے تشبیہ کیوں نہ دی، حالانکہ

ان دونوں کی چمک اور روشنی تو دوسرے ستاروں سے زیادہ ہے؟

ازالہ:

چاند اور سورج کو کبھی گرہن بھی لگ جاتا ہے، جب کہ دوسرے ستارے گرہن میں نہیں آتے، میں (مصنف) کہتا ہوں کہ چراغ کو سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَجَعَلْنَا الشَّمْسَ سِرَاجًا" (ہم نے سورج کو چراغ بنایا)، اسی لیے زجاجہ کو ستارے سے تشبیہ دی، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ فانوس کی روشنی چراغ سے کم ہے، اگر سورج سے تشبیہ دی جاتی تو مضمون الٹ جاتا اور فانوس کی چمک، چراغ سے زیادہ ہونا سمجھا جاتا اور یہ بات مقصود کے خلاف ہو جاتی۔

(آگے فرمایا) "يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ" زیتون کا درخت بڑا بابرکت درخت ہوتا ہے، اس سے گونا گوں فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس کا تیل چراغوں میں بھی جلایا جاتا ہے اور نہایت نفیس اور مفید روشنی دیتا ہے۔ زیتون بطورِ سالن بھی کام میں آتا ہے اور ایک قسم کی خاص لذت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ درخت سے تیل نکالنے کے لیے کسی کولھو کی ضرورت نہیں، ہر شخص بآسانی خود نکال سکتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ زیتون کے تیل سے ناسور اچھا ہو جاتا ہے، چوٹی سے جڑوں تک اس کے درختوں میں تیل ہی تیل ہوتا ہے۔

نیز امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت اسید بن ثابت رضی اللہ عنہ یا حضرت اسید انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: زیتون کا تیل کھاؤ اور استعمال کرو، یہ مبارک درخت ہے۔ [رواہ الترمذی و احمد و الحاکم و ابن ماجہ]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: زیتون کا تیل کھاؤ اور استعمال کرو، یہ نفیس اور برکت والا ہوتا ہے۔"

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے "الطب" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "زیتون کا تیل کھاؤ اور (جسم پر) لگاؤ، یہ ستر بیماریوں کے لیے شفاء ہے جن میں سے ایک کوڑھ کی بیماری بھی ہے۔"

"لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ" کہ جو نہ مشرقی سمت ہو اور نہ مغربی سمت۔

امام سدّی رحمۃ اللہ علیہ اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ ایسے مقام میں ہے کہ ہر وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو اور اس کو جلا ڈالے، نہ ایسی پوشیدہ جگہ میں ہے کہ سورج ہمیشہ اس سے غائب رہے، کبھی بھی اس پر دھوپ نہ پڑے اور اس کے نتیجہ میں وہ کچا رہ جائے۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ صرف طلوع کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو، غروب کے وقت بالکل نہ پڑتی ہو، نہ غرب میں اس طرح واقع ہے کہ صرف غروب کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو، طلوع کے وقت نہ پڑتی ہو، بلکہ وہ پہاڑ کی چوٹی یا کھلے وسیع میدان میں واقع ہے کہ ہر وقت اس پر دھوپ پڑتی ہے، اسی وجہ سے اس کے پھل نہایت پختہ اور تیل بہت صاف و شفاف ہوتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب کہتے ہیں کہ نہ وہ کالا ہے نہ گورا، نہ میٹھا ہے نہ کھٹا، مطلب یہ ہوتا ہے کہ بالکل خالص سفید بھی نہیں ہے نہ بالکل سیاہ ہے بلکہ درمیانی رنگ اور معتدل ذائقہ رکھتا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق یہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ امام کلبی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر مفسرین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ درخت نہ زمین کے مشرقی حصہ میں واقع ہے، نہ مغربی حصہ میں، بلکہ درمیان میں واقع ہے، یعنی ملک شام میں واقع ہے، شام کا زیتون بہت عمدہ ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایسا کوئی درخت دنیا میں نہیں ہے جو نہ شرقی ہو نہ غربی، اصل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو ایسے درختِ زیتون سے تشبیہ دی ہے جو مغرب میں بھی نہ ہو اور مشرق میں بھی نہ ہو۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ اس قول کی بناء پر شاید درختِ زیتون سے مراد جنت کا شجرۂ زیتون ہو جس سے اللہ جل جلالہ نے اپنے نور کو تشبیہ دی ہے۔

"یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" یعنی اس کا تیل اتنا چمکدار اور روشن ہے کہ قریب ہے کہ وہ خود آگ کو مس کیے بغیر روشن ہو جائے، اس آیتِ کریمہ میں روغنِ زیتون کی صفائی اور چمک کا پُر زور اظہار ہے۔ نور بالائے نور ہے، ایک تو تیل کی بجائے خود چمک، پھر آگ کی وجہ سے اس کی مشتعل روشنی، یہ دوہرا نُور ہے بلکہ چند در چند نور ہے۔ تیل کے صاف ہونے کی وجہ سے اس کی ذاتی چمک، شیشہ کے اشتعال کی چمک اور ایسے طاقچہ کی جگمگاہٹ جس میں اِدھر اُدھر سوراخ اور آر پار راستہ نہیں ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس تمثیل کی تشریح میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمثیل ہے جیسا کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا تھا کہ آیتِ مبارکہ: "مَثَلُ نُوْرِهٖ کَمِشْکٰوۃٍ" کی تشریح کریں۔ کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت (وصف) کو بطورِ تمثیل بیان کیا ہے، مشکوٰۃ سے مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سینہ مبارک اور شیشہ سے مراد ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلبِ منور اور مصباح سے مراد نبوت ہے، اور یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ نہ بھی کیا ہوتا تب بھی قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور جگمگانے لگتا اور لوگوں کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نبی ہونا خود ظاہر ہو جاتا۔

حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح میری نظر میں نہایت لطیف ہے، واقعی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی حالت تھی، بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے کچھ احوال اس جگہ ذکر کرتے ہیں جو اس موضوع پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔

خلاصۃ السیر کے مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان معجزات کا ذکر کیا ہے جو بعثت سے پہلے ذاتِ مبارک سے ظہور پذیر ہوئے تھے، ہم ان کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ کا بیان ہے کہ میں نے حالتِ حمل میں خواب میں

دیکھا کہ ایک نور میرے اندر سے نکلا جس کی وجہ سے شہر بصریٰ علاقہ شام کے محلات میری نظر کے سامنے چمک اٹھے، پھر پیدا ہوتے ہی آپ ﷺ نے سر مبارک آسمان کی طرف اٹھایا، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جونہی رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تو آپ ﷺ کی والدہ نے ایک نور دیکھا جس سے ملک شام کے محل ان کی نظر کے سامنے چمک اٹھے۔ ابن حبان اور حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی والدہ کا بیان ہے کہ جب آپ پیدا ہوئے تو فرشتہ نے آپ ﷺ کو تین بار پانی میں غوطہ دیا، پھر ایک ریشمی بٹوے کے اندر سے ایک مُہر نکال کر آپ ﷺ کے شانہ مبارک پر لگائی جس کی وجہ سے ایک سفید انڈے کی طرح کی چیز بن گئی جو زہرہ کی طرح چمکنے لگی۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ اور ابن السکن رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کی رات کسریٰ کے محل میں لرزہ آ گیا، اس کے چودہ کنگرے گر پڑے اور کسریٰ خوف زدہ ہو گیا۔ اور فارس کی جو آگ ہزار برس سے نہیں بجھی تھی، وہ بجھ گئی اور ساوت جھیل خشک ہو گئی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی مکہ مکرمہ میں رہتا اور تجارت کرتا تھا، رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کی رات کو اس نے قریش سے کہا: اے گروہِ قریش! آج رات اس امت کا نبی ﷺ پیدا ہو گیا جس کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نشان ہے اور نشان میں گھوڑے کے ریال کی طرح چند بالوں کی ایک قطار ہے، لوگ یہودی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی والدہ کے پاس پہنچے اور نومولود بچے کی پشت کھول کر دیکھی، یہودی کی نظر جب مسّہ پر پڑی فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑا، لوگوں نے پوچھا ارے ارے تجھے کیا ہو گیا، یہودی کہنے لگا، واللہ! بنی اسرائیل (کے ہاتھ) سے نبوت نکل گئی۔ (رواہ الحاکم) مواهب لدنیہ میں عمیصا راہب کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، عمیصا، اہلِ مکہ سے کہتا تھا، اے اہلِ مکہ! عنقریب تم میں ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے، سارا عرب اس کا تابع ہو جائے گا، اور عجم پر بھی اس کا اقتدار ہوگا، یہ زمانہ اس کی پیدائش کا ہے۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں میرے داخل ہونے کا ایک خاص سبب ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی ہونے کی نشانی میں نے اسی وقت دیکھ لی تھی جب آپ جھولے میں پڑے ہوئے چاند سے باتیں کررہے تھے اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کررہے تھے اور جب آپ اس کی طرف اشارہ کرتے تھے وہ (کنارہ) جھک جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس سے باتیں کررہا تھا اور وہ مجھ سے باتیں کررہا تھا، وہ مجھے رونے سے بہلاتا تھا اور جب وہ عرش کے نیچے سربسجود ہوتا تھا تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات میں سے یہ بات بھی شمار کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھولے کو فرشتے جھلاتے تھے، یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ پیدا ہوتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلام کیا تھا۔

ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انا حضرت حلیمہؓ کہتی ہیں کہ جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گود میں لے لیا تو فوراً میری چھاتیاں بقدرِ ضرورت دودھ سے بھر آئیں، پہلے میرا بچہ یعنی ضمرہ بھوکا رہنے کی وجہ سے سوتا نہ تھا، اب دونوں نے سیر ہوکر دودھ پی لیا اور دونوں سو گئے، پہلے میرے پستان میں اتنا دودھ نہ تھا جو بچہ کے لیے کافی ہوتا، نہ ہماری اونٹنی کے پاس دودھ تھا جو بچہ کو پلایا جا سکتا، اب جو میرا شوہر اونٹنی کے پاس گیا تو دیکھتا کیا ہے کہ اونٹنی کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہیں، میرے شوہر نے اس کو دوھا اور میں نے خوب سیر ہوکر پیا اور شوہر نے بھی خوب پیا اور وہ رات بڑے چین سے گزری، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر جب میں واپس آئی اور گدھی پر سوار ہوئی تو خدا کی قسم وہ تو اتنی تیز چلنے لگی کہ ساتھیوں کا کوئی گدھا اس کا مقابلہ نہ کر سکا، ساتھ والیاں کہنے لگیں: اری ابی ذویب کی بیٹی! ذرا ٹھہر تو، کیا یہ تیری وہی اونٹنی ہے جس پر تو آئی تھی، میں نے کہا، ہاں، بات یہ تھی کہ لاغری اور کمزوری کی وجہ سے میری گدھی ساتھ والے قافلہ کے لیے بار ہوگئی تھی، بار بار ان کو رُکنا پڑتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: **اللّٰہ اکبر کبیرًا والحمد للّٰہ کثیرًا و سبحان اللّٰہ بکرۃ و اصیلاً** "یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے پہلا کلام تھا۔ (الحدیث)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حلیمہ رضی اللہ عنہا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دور نہیں جانے دیتی تھیں، تاکہ آپ کی طرف سے ان کو بے خبری نہ رہے، ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رضاعی بہن شیماء کے ساتھ باہر چلے گئے اور جہاں جنگل میں اونٹ تھے وہاں جا پہنچے، حلیمہ تلاش میں نکلیں، آپ اپنی بہن کے ساتھ کہیں مل گئے، حلیمہ نے کہا، اس گرمی میں تم کہاں پھر رہے ہو؟ شیماء نے کہا کہ اماں! مجھے اپنے بھائی کے ساتھ تو گرمی محسوس ہی نہیں ہوئی، برابر ان کے اوپر ایک بدلی سایہ کیے رہی، جب یہ کہیں ٹھہر جاتے تھے بدلی بھی ان کے اوپر ٹھہر جاتی تھی، یہ چل دیتے تھے تو بدلی بھی ان کے اوپر چل دیتی تھی۔

شمائل مجدیہ میں مذکور ہے کہ حضرت حلیمہ کہتی ہیں کہ جس روز سے ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لیا، کبھی ہم کو چراغ کی ضرورت نہیں رہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ کی روشنی تو چراغ سے زیادہ نورانی تھی۔ اگر ہم کو کسی جگہ چراغ کی ضرورت پڑتی تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں لے جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے تمام مقامات روشن ہو جاتے۔

نیز روایت میں آیا ہے کہ حضرت حلیمہؓ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر بتوں کی طرف گئیں تو ہُبل اور دوسرے بُت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم میں اپنی اپنی جگہ سرنگوں ہو گئے اور سنگِ اسود کے پاس لے کر گئیں تو وہ خود اپنی جگہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ کو چمٹ گیا۔

یہ بھی مروی ہے کہ حضرت حلیمہؓ جب آپ کو دودھ پلانے لگیں تو پستانوں سے اتنا دودھ بہنے لگا جو دس بلکہ اس سے بھی زیادہ بچوں کے لیے کافی ہوتا۔ جب حلیمہ آپ کو لے کر کسی خشک وادی سے گزرتیں تو وہ فوراً سرسبز ہو جاتی۔ حضرت حلیمہؓ خود دیکھتی اور سنتی تھیں کہ پتھر اور درخت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کرتے تھے اور درختوں کی شاخیں آپ کی طرف جھک جاتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رضاعی بھائی دونوں ساتھ ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ رضاعی بھائی کا بیان ہے کہ میرا رضاعی بھائی جب کسی وادی پر جا کر کھڑا ہوتا

تھا تو وہ فوراً سرسبز ہو جاتی تھی اور بکریوں کو پانی پلانے کے لیے ہم کنوئیں پر آتے تھے تو کنوئیں کا پانی ابل کر کنوئیں کے منہ تک آجاتا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دھوپ میں کھڑے ہوتے تھے تو بدلی آکر سایہ کر لیتی تھی اور جنگلی جانور، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چومتے تھے۔

خلاصۃ السیر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انا کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے اونٹوں کے مقام پر تھے، اچانک آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ دو سفید آدمیوں نے میرے قریشی بھائی کو پکڑ کر زمین پر لٹا کر پیٹ چاک کر دیا، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم یہ بات سن کر فوراً ان کی طرف نکل کھڑے ہوئے، جا کر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منہ لپیٹے کھڑے تھے، ہم نے آپ کو چمٹا لیا اور پوچھا کہ کیا واقعہ ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دو سفید پوش آدمی آئے اور انہوں نے مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا، پھر اس کے اندر کسی چیز کو ٹٹولا، مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کیا چیز نکالی؟!

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے ابویعلیٰؒ، ابونعیمؒ اور ابن ابی عساکرؒ نے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے کہ تین آدمیوں کا ایک گروہ آیا، ان کے پاس سونے کا طشت تھا، جو برف سے بھرا ہوا تھا، ان میں سے ایک نے مجھے زمین پر لٹایا (اور پیٹ چاک کر کے) پیٹ کے اندر کی چیزیں نکالیں، پھر ان کو برف سے دھویا، اور خوب دھویا، پھر ان کو ان کی جگہ دوبارہ رکھ دیا، پھر دوسرا کھڑا ہوا اور اس نے میرا دل نکال کر پھاڑا (اور اس کو صاف کیا) یہ سب باتیں میں دیکھ رہا تھا، پھر ایک سیاہ بوٹی اس کے اندر سے نکال کر پھینک دی، پھر دائیں بائیں ہاتھ گھمانے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز تلاش کر رہا ہے، پھر مجھے نظر آیا کہ اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی ہے جو مجسم نور ہے، اس کو دیکھنے سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں، اس انگوٹھی سے اس نے میرے دل پر مہر لگا دی، مہر لگاتے ہی میرا دل نور سے بھر گیا، یہ نبوت و دانش کا نور تھا، پھر دل کو لوٹا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا، میں اس مہر کی خنکی اپنے دل میں مدت تک محسوس کرتا رہا، پھر تیسرے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ تم ہٹ جاؤ (وہ ہٹ گیا)، تیسرے شخص نے سینہ کی وسطی لکیر کے آغاز سے زیرِ ناف کے

آخری حصہ تک ہاتھ پھیرا تو فوراً شگاف جڑ گیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ پر سلائی کا نشان دیکھتا تھا۔

ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں آیا ہے کہ ایک سال قحط پڑا، ابو طالب، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لے کر بارش کی دعا کرنے کعبۃ اللہ کے پاس پہنچے، کعبہ کی دیوار سے اپنی پشت لگائی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگلی پکڑی، اس وقت آسمان پر بادل کا ٹکڑا بھی نہ تھا، فوراً اُدھر اُدھر سے بادل آ گیا اور موسلا دھار خوب بارش ہوئی، اتنی کہ ساری وادی بہہ نکلی۔

خلاصۃ السیر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ملکِ شام کی طرف گئے، مقامِ بصریٰ میں پہنچے تو بُحیرا راہب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ دیکھ کر پہچان لیا اور دستِ مبارک کو پکڑ کر کہا: یہ رب العالمین کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو انسانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا، راہب سے دریافت کیا گیا کہ تمہیں اس کا کیسے علم ہوا؟ راہب نے کہا کہ جب تم لوگ گھاٹی سے نکل کر آ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ہر درخت اور پتھر ان کی طرف جھک رہا تھا اور ایسا صرف نبی کے لیے ہوتا ہے، ہم نے اپنی کتابوں میں ان کے حالات پڑھے ہیں، پھر ابو طالب سے بُحیرا نے کہا کہ اگر تم ان کو لے کر ملکِ شام گئے تو یہودی ان کو قتل کر دیں گے، چنانچہ راہب کے مشورہ سے ابوطالب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بصریٰ ہی سے واپس لے آئے، دوبارہ حضرت خدیجہؓ کے غلام کو ساتھ لے کر تجارت کی غرض سے آپ ملکِ شام گئے، اس وقت عمر مبارک پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ سے نکاح نہیں ہو پایا تھا، شام میں پہنچ کر ایک راہب کے گرجے کے پاس اترے، راہب نے اوپر سے میسرہ کی طرف جھانک کر دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ یہ کون شخص ہے؟ میسرہ نے کہا کہ حرم کے لوگوں میں سے ایک قریشی شخص ہے، راہب نے کہا کہ اس درخت کے نیچے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کبھی کوئی نہیں اُترا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ راہب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا میں

ایمان لے آیا، اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ وہی نبی ہیں جن کا ذکر اللہ نے تورات میں کیا ہے، پھر مہرِ نبوت کو دیکھ کر چوما اور کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ، اللہ کے رسول، نبی امی، ہاشمی عربی ہیں۔ آپ ﷺ ہی صاحبِ حوض ہیں، آپ ﷺ ہی شفاعت کرنے والے ہیں، آپ ﷺ ہی کے ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ میسرہ کا بیان ہے کہ دوپہر کا وقت ہوا اور گرمی سخت ہوگئی تو دو فرشتے اتر کر آپ ﷺ پر سایہ کرنے لگے، تاکہ گرمی سے آپ ﷺ کو تکلیف نہ ہو، آپ ﷺ اس وقت اپنے اونٹ پر سفر کر رہے تھے، حضرت خدیجہؓ نے میسرہ کا جب بیان سنا تو ان کے دل میں آنحضور ﷺ سے نکاح کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔

علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے راہب کے قول کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ راہب کی مراد یہ تھی کہ اس وقت اس درخت کے نیچے پیغمبر ہی فروکش ہوا ہے، سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کو اس تاویل کی ضرورت اس لیے پڑی کہ انبیاء کے دور کو گزرے ایک طویل مدت (پانچ سو سال) گزر چکی تھی، اتنی طویل مدت تک کسی ایک درخت کا باقی رہنا بعید از عقل تھا، پھر درخت بھی سرِ راہ تھا، آنے جانے والے لوگ اس کے نیچے ضرور آرام لیتے رہے ہوں گے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لبِ راہ درخت کے نیچے کوئی مسافر نبی کے سوا کبھی نہ اترا ہو، سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ (ٹھیک ہے لیکن) لفظِ قَطُّ کے خلاف ہے، قط کے تو معنی یہ ہیں کہ کبھی اس درخت کے نیچے نبی کے سوا اور کوئی نہیں اترا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے ایسے غیر معمولی حالات اللہ کی قدرت سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس درخت کے نیچے نبی کے سوا اور کوئی کبھی نہ اُترا ہو، اللہ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔ واللہ اعلم

سالم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں آیا ہے کہ آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مشکوٰۃ سے مراد رسول اللہ ﷺ کا سینۂ مبارک ہے اور زجاجہ سے مراد آپ کا دل ہے اور مصباح وہ نور ہے جو آپ ﷺ کے دل میں روشن تھا اور شجرۂ مبارکہ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور شرقی اور غربی نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی، اور نورٌ علی نورٍ کا مطلب یہ ہے کہ ایک نور تو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کا نور ہے اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کا نور۔

امام محمد بن کعب القرظی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشکوٰۃ، حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور زجاجہ، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور مصباح، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات کو اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ: سِرَاجًا مُّنِيرًا'' میں سراج فرمایا ہے۔ یہ چراغ ایک برکت والے درخت کے تیل یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے روشن تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً بہت ہی بابرکت تھے، اکثر انبیاء علیہم السلام آپ ہی کی نسل سے ہوئے، پھر آپ ایسے درخت کی طرح تھے جو نہ شرقی ہو نہ غربی یعنی آپ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، یہودی مغرب کو منہ کر کے عبادت کرتے ہیں اس لیے یہودیوں کو غربی قرار دیا اور عیسائی شرقی قرار پائے۔ ''يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَ لَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ'' سے اس طرف اشارہ ہے کہ وحی آنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات اور محاسن ظہور پذیر ہونے والے تھے۔

''نُورٌ عَلٰى نُورٍ'' (نور بالائے نور) کا مطلب یہ ہے کہ نورِ اصل نورِ نسل کے ساتھ شامل ہو گیا، ایک تو نورِ ابراہیمی تھا، پھر نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ساتھ شامل ہو گیا، پس نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور علیٰ نور ہو گیا۔

ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یوں تفسیر بیان کی ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مومن کی مثال ہے، مومن کی ذات ایک مشکوٰۃ ہے، زجاجہ مومن کا سینہ ہے، مصباح اس کا دِل ہے اور نورِ مصباح ایمان اور قرآن کی روشنی ہے جو مومن کے دل میں ہوتی ہے اور شجرۂ مبارک سے یہ روشنی اخلاص للہ کے مبارک درخت سے حاصل ہوتی ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سرسبز و شاداب درخت جو گھنے باغ میں دوسرے درختوں سے گھرا ہوا ہو کہ سورج کے طلوع و غروب کے وقت دھوپ سے محفوظ ہو، مومن بھی ہر طرح کے فتنہ سے محفوظ رہتا ہے، چار اوصاف اس کے خصوصی اوصاف ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کچھ ملتا ہے تو شکر ادا کرتا ہے اور اگر نہیں ملتا تو صبر کرتا ہے، فیصلہ کرتا ہے تو انصاف کا کرتا ہے، بات کرتا ہے تو سچی کرتا ہے، اس کا دل ایسا چراغ ہوتا

ہے جو آگ کو چھوئے بغیر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشن ہو جانے کے قریب ہے یعنی ظہورِ حق سے پہلے ہی اس کو معرفتِ حق حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کا دل فطری طور پر حق پرست ہوتا ہے، وہ نور بالائے نور ہوتا ہے، اس کا قول ایک نور ہوتا ہے، اس کا علم ایک نور ہوتا ہے، اس کا آنا نور اور جانا نور ہوتا ہے اور قیامت کے دن وہ نور ہی کی طرف جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے نور کی مثال ہے جو مومن کے دل میں ہوتا ہے، مومن کا دل فطری طور پر ہدایت پر عمل کرتا ہے، جب اس کو (شریعت کے ذریعہ) علم حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی ہدایت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور نور بلائے نور ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ صوفی کا دل حق بات، حق عمل اور حق اعتقاد کی وجہ سے کھل جاتا ہے، یعنی حق کو قبول کرتا ہے اور باطل کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، باطل سے انقباض پیدا ہو جاتا ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو، اگرچہ مفتیوں نے تم کو فتویٰ دے دیا ہو۔ [رواہ البخاری فی التاریخ بسند حسن]

جب مومن کے دل میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم آ جاتا ہے تو اس کے اندر یقین و ہدایت کا نور مزید بڑھ جاتا ہے۔

نور علیٰ نور کی تشریح میں امام کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مومن کا ایمان اور اس کا عمل مراد ہے۔ امام سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد نورِ ایمان اور نورِ قرآن ہے۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی مثال ہے، مصباح، قرآن ہے، جس طرح چراغ سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے، زجاجہ، مومن کا دل ہے، مشکوٰۃ، اس کا منہ اور زبان ہے، مبارک درخت، وحی کا درخت ہے، زیت (تیل) سے مراد قرآنی دلائل ہے، تیل کے روشن ہو جانے سے مراد ہے حجتِ قرآن کا واضح ہو جانا، خواہ اس کو پڑھا نہ گیا ہو، یعنی نزولِ قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کی نشانیاں اور دلائل قائم فرما دی تھیں، پھر

جب قرآن نازل ہوا تو نور بالائے نور ہو گیا، نورِ فطرت میں نورِ قرآن کا اضافہ ہو گیا۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ حقیقت میں اس ہدایت کی تمثیل ہے جو واضح آیات کے مفہوم کے اندر موجود ہے، اور اس ہدایت کا ظہور مشکوٰۃ ہے، یا یوں کہا جائے کہ لوگوں کے اوہام وخیالات کی تاریکیاں ہدایت کو گھیرے رہتی ہیں، پس یہ ہدایت، چراغ کی طرح ہے جس کو ہر طرف سے ظلمت محیط ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ علمی ادراکی قوتیں عطاء فرمائی ہیں جن سے انسانی معاش ومعاد وابستہ ہے۔

(۱) حسّی قوت، جس کے ذریعہ سے دماغ ان چیزوں کو جان لیتا ہے جو ظاہری پانچوں حواس کے ذریعہ سے محسوس ہوتی ہے۔

(۲) خیالی قوت، یہ طاقت، حسی قوت کے معلومات کا خزانہ ہے۔ محسوسات کی جو صورتیں حسی قوت میں آتی ہیں ان کو یہ اپنے اندر جمع رکھتی ہے تاکہ ضرورت کے وقت قوت عقلیہ کے سامنے لاسکے۔

(۳) عقلی قوت، جو صرف کلی حقائق کا ادراک کرتی ہے۔

(۴) فکری قوت، یعنی قوت متفکرہ جو معلومات کو ترتیب دے کر نامعلوم چیزوں کا علم حاصل کرتی ہے، اس کا کام دلائل کو جوڑنا اور معلومات کو ترتیب دینا ہے۔

(۵) قدسی قوت، یہ قوت انبیاء اور اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے اس کے ذریعہ سے اسرار ملکوت اور انوار غیب کا انکشاف ہوتا ہے۔ آیت کریمہ ''وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا'' میں یہی قوت مراد ہے۔

زیر تفسیر آیت میں یہی پانچوں قوتیں مشکوٰۃ، زجاجہ، مصباح، شجرہ اور زیت سے مراد ہیں۔ حسی قوت، مشکوٰۃ کی طرح ہے گویا یہ ایک کھڑکی یا روشندان ہے جس کا رخ باہر کی طرف کو ہے اور صرف محسوسات خارجیہ کو جانتی ہے، اپنے پیچھے کا اس کو کچھ ادراک نہیں، اس کا معقولات کے ذریعہ سے روشن ہو جانا بالذات نہیں۔ قوت خیالیہ، اس شیشہ کی طرح ہے جو ہر جہتی معقولات کی صورتوں کا ادراک کرتی ہے اور انوار عقلیہ کو اپنے اندر

محفوظ رکھتی اور قوت عقلیہ کی ضیاء پاشی سے روشن رہتی ہے۔ قوت عقلیہ، ایک چراغ ہے جو علومِ کلیہ اور معارفِ ربانیہ کے نور سے جگمگا رہا ہے، قوت متفکرہ ایک مبارک درخت ہے جس کے پھل لامحدود ہیں، یہ زیتون کا درخت ہے جس سے روغن پیدا ہوتا ہے اور اسی روغن سے چراغ روشن ہوتا ہے۔ یہ درخت نہ غربی ہے نہ شرقی، کیونکہ تمام جسمانی عوارض سے پاک ہے، یا یوں کہو کہ یہ درخت فکر یہ صورتوں اور معانی کے درمیان واقع ہے، دونوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے اور دونوں میں تصرف کرتا ہے۔

قوت قدسیہ، روغن زیتون کی طرح صاف وشفاف ہے، غور وفکر اور سیکھے بغیر خود ہی معارف وعلوم کی نورانیت سے جگمگا جانے کے قریب ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت مذکورہ میں قوت عقلیہ کی تمثیل ہو، ہر شخص کی قوت عقلیہ وعلمیہ ہر قسم کی صورتوں سے خالی ہوتی ہے البتہ قبول علم کی اس میں استعداد اور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس درجہ کو آیت مذکورہ میں مشکوٰۃ قرار دیا ہے۔ اس مرتبہ سے ترقی کر کے قوت عقلیہ کا دوسرا درجہ وہ آتا ہے کہ بدیہی علوم اس کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ نظر وفکر کے بغیر بعض چیزوں کا علم ہو جاتا ہے لیکن کسی نظری چیز کا علم بالفعل نہیں، ہاں استعداد وصلاحیت نظری علوم کو حاصل کرنے کی موجود ہتی ہے۔ احساس جزئیات سے حاصل شدہ بدیہی علوم کی صورتیں اس کے اندر موجود ہوتی ہیں اور ان بدیہی علوم کو ترتیب دے کر وہ نظری امور کا علم حاصل کر سکتی ہے، گویا اس درجہ میں پہنچ کر وہ ایک جگمگاتا شیشہ ہوتی ہے۔ اگر اس درجہ میں پہنچ کر قوت عقلیہ فکر واجتہاد کے ساتھ نظری علوم حاصل کرنا چاہتی ہے تو یہ زیتون کے درخت کے مشابہ ہے اور اگر حدس کے ذریعہ سے علم حاصل کرتی ہے تو روغن زیتون کی طرح ہے، فکر کا معنی ہے مبادی اور مقدمات کے ذریعہ سے نتائج کی جانب قوت فکریہ کی حرکت اور حدس کا معنی ہے نتائج سے مبارک کی طرف بازگشت اور اگر تحصیل علم کا سرچشمہ قوت قدسیہ ہے تو اس کی حالت ایسی ہے جیسے اتنا صاف وشفاف روغن کہ بغیر آگ اور دیا سلائی کو مس کیے بھی گویا مشتعل ہو جائے گا۔

وحی اور الہام کا فرشتہ قوت عقلیہ کے لیے مرکز نور واشتعال ہے، قوت قدسیہ کا

مرتبہ اتنا جلی اور نورانی ہوتا ہے کہ وحی والہام کے ملائکہ سے اتصال وتعلق کے بغیر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود اس میں اشتعال ونورانیت کا ظہور ہو جائے گا۔ اس سے آگے بڑھ کر جب قوت عقلیہ کو علوم نظریہ حاصل ہو جاتے ہیں تو دو صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) علوم نظریہ عقل کے سامنے ہر وقت حاضر نہیں ہوتے، لیکن عقل جب ان کو حاضر کرنا چاہتی ہے تو حاضر کر لیتی ہے، تصویریں موجود ہیں التفات نظر کی ضرورت ہے، جب چاہا اور التفات نظر سے کام لے کر حاضر کر لیا، اس مرتبہ کو ہم مصباح سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

(۲) لیکن اگر تصویریں ہر وقت عقل کے سامنے حاضر ہوں تو یہ نور بالائے نور ہو جاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کشفِ الہامی پر مبنی زیر تفسیر آیت کی دو تاویلیں اور بھی ہیں جن کو ہم اس جگہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "یعنی آسمان و زمین کو موجود کرنے والا اور پردۂ عدم سے میدان خارجی میں لانے والا ہے اور یہ وجود خارجی سایہ کے مثل ہے۔

"مَثَلُ نُوْرِهٖ" سے مراد وجود ہے۔ عظمت نور کو ظاہر کرنے کیلئے اپنی ذات کی طرف نور کی نسبت کی ہے۔ جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ کہا جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ ماہیات ممکنات پر وجود خداوندی پرتو انداز اور سایہ فگن ہے جیسے چاند اور سورج کے مقابل جو خطہ زمین آجاتا ہے اس پر چاند اور سورج کا نور عکس ریز ہوتا ہے۔ "کَمِشْکٰوۃٍ" یعنی مشکوٰۃ (طاقچہ) کی روشنی، یہاں مضاف محذوف ہے۔ "فِيْهَا مِصْبَاحٌ" یعنی مشکوٰۃ کے اندر چراغ روشن ہے او چراغ کی روشنی سے مشکوٰۃ پر نور ہو رہا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے چراغ سے تمام ممکنات کی حقیقتیں نور وجود کو حاصل کر رہی ہیں۔

"اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ" یعنی چراغ کی نور پاشی بدرجہ کمال ہے۔

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء کو چھوڑ کر باقی تمام

ممکنات کے مبادی تعین اللہ کی صفات نہیں بلکہ صفات کا پرتو اور ظل مبدء تعین ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کمال کو بھی جانتا ہے اور ان صفات کے نقائص کو بھی یعنی وہ اپنی صفات ثبوتیہ کا بھی علم رکھتا ہے اور صفات سلبیہ تنزیہیہ کا بھی۔ جیسے موت نقیض حیات ہے، جہالت نقیض علم ہے، کمزوری اور عجز، قدرت کی نقیض ہے۔ بہرہ ہونا، سننے کی نقیض ہے، نابینا ہونا، بینا ہونے کی نقیض ہے، گونگا ہونا بولنے کی نقیض ہے، مجبو رہونا، بااختیار ہونے کی نقیض ہے اور تعطل، تکوین کی نقیض ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ اور سلبیہ مرتبہ علم میں جمع ہوجاتی ہیں تو نقائض کی تصویریں صفات سلبیہ کے ساتھ آمیختہ ہوجاتی ہیں، ان مخلوقات کی حقیقت عدم ہوتی ہے اور سلب صفات ان کے عوارض ہوتے ہیں، یعنی یہ صفات سلبیہ اور تنزیہیہ ہوتی ہیں، صوفیاء کی اصطلاح میں ان ہی مخلوقات کو ظل صفات کہتے ہیں، ان ہی کو ایمان ثابتہ کہا جاتا ہے، یہی ممکنات اور حقائق ممکنات کے مبادی تعین ہوتے ہیں۔ یہی حقائق امکانیہ کی مربی (تعین کرنے والی) ہوتی ہیں۔ صفات کی تشبیہ روشن چراغ سے دی جاسکتی ہے اور ظلال صفات کو شیشہ کہہ سکتے ہیں، اور ماہیات امکانیہ کے وجود وظہور کو مشکوٰۃ قرار دیا جاسکتا ہے، چراغ کی روشنی سے شیشہ روشن ہوجاتا ہے۔ مصباح کے نور سے شیشہ جگمگا جاتا ہے، پھر اس شیشے کی جلوہ افروزی مشکوٰۃ پر ہوتی ہے اور مشکوٰۃ میں نورانیت اور چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح صفات کا نور ظلال صفات کی عکس ریزی ماہیات امکانیہ پر ہوتی ہے اور ممکنات کو نور وجود حاصل ہوجاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مشکوٰۃ کا نور یعنی ممکنات کا وجود اور ظہور شیشہ سے یعنی ظلال صفات سے حاصل ہوتا ہے اور شیشہ کی نورانیت یعنی ظلال کی نور چینی اور نور پاشی اصل مصباح یعنی صفات کی پرتو اندازی کی ممنون کرم ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ ''نور اللہ کے چہرہ کا نقاب ہے، اگر وہ اس نقاب کو کھول دے تو اس کے چہرے کے چمکارے (شعاعیں) وہاں تک ساری مخلوق کو جلا کر سوختہ کردیں

جہاں تک اس کی نظر پہنچے‘‘ شاید اس حدیث میں نظر سے مراد مرتبہ ظلال ہے اور انوار وجہ سے صفات مراد ہیں۔

بات یہ ہے کہ علم ممکنات کی ماہیات اپنی استعداد کی کمزوری سے براہ راست ظلال کی وساطت کے بغیر صفات سے نور وجود کو حاصل نہیں کرسکتیں، اگر ظلال صفات کا واسطہ نہ ہو تو عام ممکنات معدوم ہو جائیں، البتہ انبیاء و اولیاء اپنی استعداد اور صلاحیت کی قوت کی وجہ سے براہ راست صفات سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ پس جس طرح ظلال، صفات سے براہ راست نور چیں ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء و اولیاء بھی براہ راست صفات سے نور اندوز ہوتے ہیں اور چونکہ ان کے اصول میں شر کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اس لیے وہ فطری طور پر گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

’’وَالزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ‘‘ یعنی نور مصباح سے شیشہ روشن اور چمکدار ہوتا ہے کہ شیشہ کو دیکھ کر دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ مصباح ہے، دیکھنے والے شیشہ اور چراغ میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ ظلال اور صفات میں چونکہ اتنا اشتباہ ہے کہ دونوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے، اسی لیے عارفوں کا ایک گروہ یعنی وہ صوفیاء جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، نظر فریب میں مبتلا ہو گئے، ظلال کو صفات سمجھ بیٹھے، دونوں مرتبوں میں فرق نہ سمجھ سکے اور صفات کو عین ذات کہنے لگے اور خیال کرنے لگے کہ ممکنات کی ماہیات میں جو حقیقت جلوہ اندوز ہے وہ ان ممکنات کی عین ہے، نور پذیر اور نور فگن ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اسی غلط فہمی کی بنیاد پر وہ پکار اٹھے کہ **لیس فی الکون الا اللّٰہ** یعنی عالم وجود میں اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

یہ ساری خرافات، سکر اور فریفتگی عشق کا نتیجہ ہیں، یہ لوگ جلوہ پذیر اور جلوہ آفریں میں فرق نہ کر سکے۔ ’’يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ‘‘ یعنی وہ چراغ، زیتون کے بابرکت درخت کے تیل سے روشن ہے۔

خاص ہدایت:

اللہ تعالیٰ کی صفات کا خارج میں وجود و ظہور، اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ

ہے، اس لیے صفات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن ہیں اورذات خداوندی کی وجہ سے واجب، پس ذات خداوندی زیتون کے بابرکت درخت کے مشابہ ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔اور صفات چراغ کے مثل ہیں، ذات سے زائد ہیں قرآن اور فرامین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی مستفاد ہے اور اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے۔

ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صفات نہ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات، یعنی ذات سے زائد ہیں، اس لیے عین ذات نہیں اور ذات سے جدا نہیں اس لیے غیر ذات بھی نہیں ہیں، فلاسفہ اور معتزلہ وجود صفات کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر ذات خداوندی کو فی نفسہا صفات سے الگ مانا جائے گا اور صفات کو ذات سے الگ قرار دیا جائے گا تو ترتبِ آثار میں صفات کی محتاج نہیں ہے، اگر ہم ساری صفات کا عدم فرض کرلیں تب بھی آثار کا ظہور ذات سے ضرور ہوگا، مثلاً اگر سننے اور دیکھنے کی صفت ذات میں نہ مانی جائے تب بھی تنہا ذات ان آثار کے اظہار کے لیے کافی ہے جو شنوائی اور بینائی کی صفات پر مرتب ہوتے ہیں۔شنوائی کے آثار اگر تنہا ذات سے ظاہر ہوں تو اس وقت اس کو شان سمع کہا جائے گا، اسی طرح بصارت کے آثار بغیر صفت بصارت کے ذات سے ظاہر ہوسکتے ہیں، اس لیے اس کو شان بصارت کہا جائیگا، پس یہی شیون ذات، صفات کے اصول ہیں اور صفات، ظلال کے اصول ہیں، شان کہو یا اعتبار، بہرحال یہ اس روغن کے مشابہ ہے جو زیتون کے مبارک درخت کے اندر ہوتا ہے۔اس تقریر کی بناء پر" یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ" کے ساتھ تشبیہ کامل ہوگئی، صفات نہ ہوں تب بھی شیون ذات پر آثار مرتب ہونا یقینی ہے، گو صفات چراغ کی آگ کی طرح ہیں اور زیت شیون ذات ہیں "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" یعنی ایک تو چراغ کا نور ہے جو شیشہ اور مشکوٰۃ کو روشن کررہا ہے اور دوسرا درخت زیتون کے روغن کا نور ہے، جیسے ایک نور صفات ہے جس سے آثار کا ظہور ماہیات کی نور اندازی اور ممکنات کی ایجاد وابستہ ہے اور دوسرا نور شیون ذات کا ہے، اس طرح نور بالائے نور ہے۔

"یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ" یعنی جس شخص کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا نور

معرفت عطا فرماتا ہے۔اس کی معرفت کا نور خاص خاص عارف ہی حاصل کرتے ہیں۔

اس توجیہ پر اس آیت مبارکہ میں ایجاد اشیاء کی طرف اشارہ ہوگا، وجود خارجی ظلی کے میدان میں پردہ عدم سے نکل کر آنا مراد ہوگا اور اس بات کا ثبوت ہوگا کہ تمام موجودات سے ذات خداوندی انتہائی قریب ہے۔ سورہ قٓ کی آیت کریمہ: "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" کی تفسیر میں ہم نے اقربیت کی مفصل تشریح کردی ہے۔

(۲) دوسری تاویل جو اسلاف کرام سے مروی ہے یہ ہے کہ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی آسمان وزمین کے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی معرفت کا راستہ بتانے والا ہے۔ پس تمام اہل ارض وسماء اس کے نور کے ذریعہ ذات وصفات کی معرفت کا راستہ پاتے اور مراتب وقرب ملک ترقی کرتے جاتے ہیں۔ آیت مبارکہ: قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ" اور آیت کریمہ: "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" میں در پردہ اسی نور کو بیان کیا گیا ہے۔

ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، بالآخر میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔(الحدیث) اسی قرب کا نام ولایت خاصہ ہے۔

"مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ" یعنی مومن کے دل میں اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے مشکوٰۃ کا نور، جس کے اندر چراغ روشن ہو، پس مومن کا دل ایک مشکوٰۃ (طاق) ہے جس کے اندر صفات الٰہی کی جلوہ پاشی ہورہی ہے اور صفات الٰہی روشن چراغ کے مثل ہے اور یہ چراغ زیتون کے ایک بابرکت درخت (کے تیل) سے روشن ہے اور درخت بھی وہ ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ یعنی صفات الٰہی، ذات الٰہی سے پھوٹ رہی ہیں اور ذات کے اندر شیون ذاتیہ اور اعتبارات ان صفات کے لیے سرچشمہ ہیں۔

"اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ، اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ" اس آیت کریمہ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اولیاء عموماً براہ راست صفات الٰہیہ سے پرتو اندوز نہیں ہوسکتے،

ان کی نور چینی ظلال کی وساطت پر موقوف ہے۔ ظلال کے پردے کے پیچھے صفات ہیں جو ظلال پر پرتو فگن ہیں اور ظلال کی نور پاشی اولیاء پر ہوتی ہے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے تمام لوگوں کا مبدتعین یہی ظلال صفات ہیں، صفات نہیں ہیں، عام اولیاء کی براہ راست ترقی اپنے اصول یعنی ظلال تک ہوتی ہے۔ ظلال ہی کی وساطت سے وہ انور صفات کی خوشہ چینی کرتے ہیں۔ ان ہی انوار ظلال میں اولیاء کی فناء و بقاء ہوتی ہے۔ اسی وساطت سے ان کو تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور اسی تقرب کا نام ولایت ہے لیکن یہ ولایت صغریٰ کہلاتی ہے، ہاں کچھ کامل ترین اولیاء ایسے بھی ہوتے ہیں کہ صاحب شریعت کی اتباع کی وجہ سے ان کو مقام صفات تک بلکہ مرتبہ شیون تک ترقی مل جاتی ہے اور یہی مقام ان کے لیے فناء و بقاء کا مقام ہوتا ہے۔

مرتبہ صفات کی دو حیثیتیں ہیں۔ (۱) ظہور، (۲) بطون۔ ظہور کی حیثیت تو یہ ہے کہ وہ ذات الٰہی سے قائم ہیں۔ یہی ظہور صفات ولایت کبریٰ یعنی ولایت انبیائے کرام ہے اور بطون کی حیثیت کا نام ولایت علیا یعنی ولایت ملائکہ ہے۔ انبیاء کے بعد صدیقین کا مرتبہ ہے۔ صدیقین صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق فرمایا ہے۔ "ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ" اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد دوسرے صدیقوں کے متعلق فرمایا: "وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ" صدیق مرتبہ صفات و شیون کے حجاج کے بغیر خالص ذات ان پر جلوہ پاش ہو جاتی ہے۔ آیت مبارکہ میں آخری دونوں فریقوں کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے، البتہ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ سے اولیاء کے مراتب وصول کے اختلاف کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر ایک نور دوسرے نور سے اوپر ہے، درجہ نورانیت میں بڑا فرق ہے۔

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ "اللہ تعالیٰ اپنے نور کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا، پھر اس پر اپنے نور کا کچھ حصہ (پرتو) ڈالا بس جس شخص نے اس نور کا کچھ حصہ پالیا۔ وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس نے نور کا حصہ نہ پایا وہ گمراہ ہو گیا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم پر قلم خشک

ہوگیا۔" [رواہ احمد والترمذی] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو جہالت اور گمراہی کی حالت میں پیدا کیا۔ اس جہالت کا سرچشمہ عدم ذاتی ہے، اس کے بعد اپنے اس نور کا کچھ حصہ اس پر ڈالا، یعنی ظلال میں جو نور، صفات سے آتا ہے اس نور کا کچھ حصہ مخلوق پر ڈالا جس پر اس نور کا کچھ چمکارا پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہوگیا، نہ پڑا تو گمراہ ہوگیا، نور پڑنے کی صورت یہ ہے کہ جس ذات گرامی کو اللہ تعالیٰ نے رحمت عالم بنا کر بھیجا اور اس کے سینہ کو کھول دیا اور اس کے دل کے اندر نور حکمت اور ایمان کو بھر دیا اس کی اتباع اور پیروی کی جائے، اس کے چمکتے ہوئے نور کا کوئی چمکارا چن لیا جائے، اپنے دل کو اس رحمت عالم کے دل کا آئینہ بنا دیا جائے تاکہ اپنا دل بھی بقدر نور چینی روشن ہو جائے۔

آدمی تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ گروہ ہے جس نے صورت ایمان حاصل کرلی، دنیا میں کفر سے اور آخرت میں دوزخ سے نجات پالی، دوسرا گروہ وہ ہے جس نے حقیقت ایمان پالی، حقیقت ایمان پانے والوں کے درجات مختلف ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جس نے نورِ ایمان قطعاً حاصل نہیں کیا، راہ راست سے محروم رہا اور اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، یہ گروہ اہل ضلالت کا ہے۔

حضرت ابوعنبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "زمین والوں میں اللہ کے نور کے کچھ ظروف ہیں، یعنی اللہ کے نیک بندوں کے دل، جو دل سب سے زیادہ نرم اور پسیجنے والے ہیں، اللہ کو وہ سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ [رواہ الطبرانی]

"وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ" اور لوگوں کے فائدے کے لیے اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتے ہیں۔ یعنی وہ عقلی معانی جن کو آدمی حواس کے ذریعہ نہیں سمجھتا، ان کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ محسوس مثالیں دیتے ہیں، تاکہ غیر محسوس امور کا انسان کو علم ہو جائے۔ آیت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو عالم مثال میں ان چیزوں کی تصویریں دکھا دیتا ہے جن کی عالم محسوسات میں کوئی تصویر نہیں، اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ حق بالکل نمایاں ہو کر ان کے سامنے آجائے اور وہ حقیقت کی صورت دیکھ لیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ سے بندے کا قریب ہونا تو قرآن وحدیث سے ثابت ہے،

نوافل کے ذریعہ بندہ، اللہ کا قرب حاصل کرتا رہتا ہے لیکن یہ قرب بے کیف ہے، اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی، نہ ہی حواس ظاہری و باطنی سے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ نہ عقل نارسا کی علمی رسائی وہاں تک ہے، نہ علم حصولی کا اس سے تعلق ہے۔ نہ اس کا علم، حضوری ہوسکتا ہے، بلکہ عقلی اور حسی علم کے علاوہ براہ راست اللہ کی طرف سے اس کا فیضان ہوتا ہے، اسی علم کو بطور کنایہ اس حدیث قدسی میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حَتّٰی کنت سمعه الذی یسمع به یعنی میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ علم وجدانی کے حصول کا براہ راست فیضان کے علاوہ ایک اور ذریعہ بھی ہوتا ہے، عالمِ مثال میں ان تمام معانی وحقائق کی صورتیں اور جسمانی شکلیں موجود ہیں، جن کی اس عالمِ جسمانی میں کوئی شکل نہیں۔ (مثلاً عداوت، محبت، صداقت، ایمان، علم اور جہالت وغیرہ ایسے معانی ہیں جن کی کوئی شکل اس عالم میں موجود نہیں، ہاں البتہ ان معانی کے مظاہر موجود ہیں)۔

صوفی، عالم مثال میں ظلال کا دائرہ دیکھتا ہے اور صفات کا دائرہ بھی اس کو نظر آتا ہے اور جتنا نوافل کو انابت اور رجوع الی اللہ کے زینہ پر آگے بڑھاتا ہے اس کو اپنی ذات، دائرہ ظلال کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آخر دائرہ ظلال میں اس کی ذات مخلوط ہوکر گم ہو جاتی ہے اور دائرہ کے رنگ میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے آگے دائرہ صفات کی طرف اس کی سیر شروع ہوتی ہے اور جب حدود صفات تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنی انفرادی حیثیت کھو دیتا ہے اور صفات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ حقیقت میں وہاں کوئی رنگ نہیں ہوتا، لیکن سمجھانے کے لیے کوئی لفظ نہیں، زبان اس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہے، اس لیے رنگ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ یعنی ہم ان کو آفاقی اور انفسی نشانیاں دکھاتے ہیں تاکہ ان کو کامل انکشاف ہو جائے کہ اللہ ہی حق ہے۔'' وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ بغیر علم کے اللہ مثالیں بیان کرتا ہے، نہیں ایسا نہیں، بلکہ بخوبی کامل علم کی حالت میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں۔

"فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ" ان گھروں میں جن کو بنانے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ بیوت سے مراد مساجد ہیں، حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ مسجدیں زمین پر اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں، یہ آسمان والوں کی نظر میں ایسی چمک دار اور روشن دکھائی دیتی ہیں جیسے زمین والوں کے لیے ستارے، مسجدیں بلند کرنے سے مراد ہے، مسجدوں کا بنایا جانا۔ [قاله مجاهد] رفع کا لفظ تعمیر کے معنی میں آیت کریمہ "وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمَاعِیْلُ" میں بھی آیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو اللہ (کے ذکر) کے لیے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ جنت کے اندر اس کے لیے گھر بنا دے گا۔" [متفق علیه از حدیث عثمان]

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ: "اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے گھر کی تعظیم کی جائے۔ یعنی اس میں بیہودہ بری باتیں نہ کی جائیں۔ نیز آیت کریمہ: اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ" میں پاک رکھنے سے بھی یہی مراد ہے کہ اس میں بری باتیں نہ کی جائیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت صالح بن حبان رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ صرف چار مسجدیں ہیں جن کو پیغمبروں نے بنایا تھا، خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے بنایا، بیت المقدس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے بنایا، مسجد نبویؐ اور مسجد قبا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنایا۔ مسجد قبا وہی مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مسجدیں گو بڑی فضیلت رکھتی ہیں، لیکن ان ہی کو خاص طور پر مراد لینے کی کوئی دلیل نہیں، "فِیْ بُیُوْتٍ" کا تعلق گزشتہ عبارت سے ہے۔ یعنی اللہ کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے اللہ کے گھروں میں مشکوٰۃ کی روشنی۔ میرے نزدیک یہ تفسیر ضعیف و کمزور ہے۔ پچھلی عبارت ختم ہو چکی، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو نور مشکوٰۃ سے تشبیہ دی اور مشکوٰۃ کی کچھ صفتیں اور قیدیں ذکر کر دیں جو نور کی شدت اور قوت پر دلالت کر رہی ہیں، اور اس آیت سے نور کی چمک میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا، اس لیے اس کا تعلق ماقبل

سے نہیں ہے۔ یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے کہ مسجدوں کی قندیلیں زیادہ روشن اور چمکدار ہوتی ہیں، سرمایہ داروں کے مکانوں کی قندیلیں تو مساجد کی قندیلوں سے کہیں زیادہ چمکدار اور روشن ہوتی ہیں۔ اس لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "فِيْ بُيُوْتٍ" کو "يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ" سے وابستہ قرار دیا جائے کیونکہ اکثر ہدایت الٰہیہ مسجدوں کے اندر اعتکاف کرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "نماز مومن کی معراج ہے۔" نیز ارشاد فرمایا۔ "بندہ اپنے رب سے بہت زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، لہٰذا تم (سجدہ کی حالت میں) دعا بہت کیا کرو۔" [رواہ مسلم و ابوداود والنسائی]

یہ بھی ممکن ہے کہ "فِيْ بُيُوْتٍ" کا تعلق امر محذوف سے ہو۔ یعنی اللہ کے گھروں میں اللہ کی پاکی بیان کرو۔ "وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ" اور اللہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کے اندر اللہ کا نام لیا جائے۔ نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کی جائے۔ "يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ" صبح و شام ان مسجدوں میں کچھ لوگ، اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ صبح و شام کی تسبیح سے پانچوں فرض نمازیں، مسجدوں کی تعمیر ان ہی نمازوں کی ادائیگی کے لیے کی جاتی ہے، فجر کی نماز صبح کی تسبیح ہے اور باقی چاروں نمازیں، شام (پچھلے وقت) کی تسبیحیں۔ آصال، اصل کی جمع ہے یعنی شام۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف فجر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں۔ ان اوقات کی نمازوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے، فجر کا وقت سونے کا وقت ہے اور عصر کا وقت بازاروں میں کاروبار کا وقت ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس نے دونوں ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہو گیا۔" [رواہ مسلم]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول آیا ہے کہ صبح کی تسبیح سے چاشت کی نماز مراد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص باوضو ہو کر فرض نماز کے لیے چل کر جاتا ہے اس کا ثواب مُحرِم حاجی کی طرح ہوتا ہے اور جو چاشت کی نماز کی غرض سے چل کر جاتا ہے اور صرف چاشت کی نماز کا ارادہ ہی اس کو

کھڑا کرتا ہے اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز علیین میں لکھ دی جاتی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ جو شخص فرض نماز کے لیے پیدل چل کر گیا تو اس کا یہ عمل ایسا ہے جیسے ایک حج کرنا اور جو شخص نفل نماز کے لیے پیدل چل کر گیا تو یہ عمرہ کی طرح ہوگی۔''

''رِجَالٌ''، عورتوں سے قطع نظر کر کے خصوصیت کے ساتھ مردوں کا تذکرہ اس لیے کہ عورتوں پر مسجد کے اندر جا کر نہ جمعہ لازم ہے نہ جماعت کی نماز، یا اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر عورتوں پر جہالت اور غفلت چھائی رہتی ہے۔

''لَا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ان کو اللہ کی یاد سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے اور نہ بیع۔ تجارت کا لفظ خرید و فروخت دونوں کو شامل ہے۔ اس لیے لفظ تجارت کے بعد لفظ بیع کی ضرورت نہ تھی لیکن خرید سے فروخت کی زیادہ اہمیت ہے، خریدنے میں تو نفع کی امید ہوتی ہے اور فروخت میں فائدہ یقینی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وضع لغوی کے اعتبار سے اگرچہ تجارت میں خرید و فروخت دونوں داخل ہیں لیکن اس جگہ تجارت کے مقابلہ میں بیع کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، اس لیے تجارت سے مراد ہے خرید اور اشتراء کو چھوڑ کر لفظ تجارت اس لیے اختیار کیا کہ اشتراء (خرید) سے تجارت کا آغاز ہوتا ہے۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ تجارت سے مفید لین دین مراد ہے اور اس کے بعد بیع کا خصوصی ذکر بیع کی اہمیت بتانے کے لیے کیا گیا۔ امام فراء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تجارت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو باہر سے مال لانے والے ہیں، اور بیع کا تعلق دست گردان بیع سے ہے۔ ''ذِكۡرُ اللّٰهِ'' سے مراد ہے نماز پڑھنے کے لیے مسجدوں میں آنا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت سالم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں بازار میں تھا، اتنے میں نماز کی اقامت ہوئی، لوگ اٹھ کر دکانیں بند کر کے مسجد میں چلے گئے، ان ہی

کے متعلق یہ آیت: ''لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ'' نازل ہوئی۔ یا ''ذِكْرُ اللّٰہ'' سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی عمومی یاد اور مالک سے لو لگانا۔ اس صورت میں ذکر اللہ کا لفظ عام ہوگا، اس کے مصداق وہ لوگ بھی ہوں گے جو سب سے کنارہ کش ہو کر سارے دنیوی دھندوں کو چھوڑ کر ہر وقت طاعت الٰہی میں ڈوبے رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی اس کا مصداق قرار پائیں گے جنہوں نے دنیوی معاملات ترک نہیں کئے لیکن تجارت وغیرہ میں مشغول رہنے کے باوجود تجارت نے ان کے دل کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کیا۔ بظاہر لوگوں کے ساتھ دنیوی مشاغل میں ہیں اور باطن میں اپنے خالق کے ساتھ ساری مخلوق سے بے نیاز۔

''وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ'' اور نماز قائم کرنے سے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نماز قائم کرنے سے مراد ہے مقررہ اوقات میں نماز ادا کرنا، مقررہ وقت سے نماز کو موخر کرنے والا نماز کو قائم کرنے والا نہیں ہوتا۔

''وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ'' اور زکوٰۃ ادا کرنے سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ادائے زکوٰۃ کا وقت آجاتا ہے تو وہ زکوٰۃ کو روکتے نہیں۔ (فوراً ادا کر دیتے ہیں)۔ بعض علماء کا قول ہے کہ زکوٰۃ سے تمام اچھے اعمال مراد ہیں۔ ''یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ'' ایسے دن کی (دار و گیر) سے ڈرتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی۔

''تَتَقَلَّبُ'' یعنی مضطرب ہو جائیں گے اور ہولناکی کی وجہ سے حالتِ غیر ہو جائے گی۔ بعض علماء نے ''تَتَقَلَّبُ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کافروں کے دل اس کفر و شرک سے پلٹ جائیں گے جس پر وہ دنیا میں قائم تھے اور ان کی آنکھوں سے پردے ہٹ جائیں گے اور وہ چیزیں ان کو دکھائی دیں گی جو کبھی نہ دیکھی ہوں گی، بلکہ خیال و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ رہے مومن تو پہلے وہ (جنت کی نعمتوں پر) قناعت کیے ہوئے ہیں پھر ان کے دل اور آنکھیں پلٹا کھائیں گی اور اپنے رب کو چودھویں رات کے چاند اور چوتھی ساعت کے آفتاب کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

بعض کہتے ہیں کہ خوف و امید کی وجہ سے مومنوں کے دل الٹ پلٹ ہوں گے،

ہلاکت کا خوف ہوگا اور نجات کی امید ہوگی، آنکھیں گردوپیش کی طرف دیکھ کر چکرائیں گی اور ہر طرف پلٹ کر دیکھیں گی کہ کس طرف سے پکڑ ہوتی ہے، دائیں جانب سے یا بائیں جانب سے اور کس رخ سے اعمال نامہ ملتا ہے، سیدھی طرف سے یا الٹی طرف سے یا پیچھے سے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ خوف کی وجہ سے دل الٹ پلٹ ہوں گے اور گلے تک آ کر پھنس جائیں گے، نہ نیچے اتر سکیں گے نہ اوپر آ کر نکل سکیں گے اور حالات کی ہولناکی دیکھ کر آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ ''لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ'' تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ثواب عطا کرے۔'' اس جملہ کا تعلق يُسَبِّحُ یا لَاتُلْهِيْهِمْ سے ہے۔ اور یہ کلام سابق کی غرض و غایت ہے۔ یا اس کا تعلق ''يَخَافُوْنَ'' سے ہے۔ اس صورت میں لِيَجْزِيَهُمْ میں لام عاقبت ہوگا، کلام سابق کی علت و غایت بیان کرنے کے لیے نہ ہوگا، کیونکہ خوف غیر اختیاری چیز ہے اور علت و غایت اختیاری افعال کی ہوتی ہے۔ ''اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا'' بہترین ثواب یا اچھے اعمال کا ثواب۔ دوسرے ترجمہ پر اَحْسَنَ'' اسم تفضیل بمعنی حَسَن (صفت مشبہ) کے ہوگا۔ ''وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ'' یعنی اور ہر عمل کے ثواب کا جتنا اس نے وعدہ کر رکھا ہے اپنے فضل اور مہربانی سے اس سے زیادہ کر دے۔ اتنا زیادہ کر دے کہ ان کے خیال میں بھی نہ آیا ہو۔ ''وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ'' اور اللہ تعالیٰ بے گنتی عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ [تفسیر مظہری ج۸، ص ۲۴۲ تا ص ۲۵۸]

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آیت مبارکہ ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''یعنی اللہ سے رونق اور بستی ہے زمین و آسمان کی اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائیں۔'' [موضح القرآن]

حاصلِ کلام یہ کہ سب مخلوق کو نور وجود اسی سے ملا ہے، چاند سورج، ستارے، فرشتے اور انبیاء و اولیاء میں جو ظاہری یا باطنی روشنی ہے (وہ) اسی منبع النور سے مستفاد ہے، ہدایت و معرفت کا جو چمکارا کسی کو پہنچتا ہے اسی بارگاہِ رفیع سے پہنچتا ہے، تمام علویات و سفلیات، اس کی آیات تکوینیہ و تنزیلیہ سے منور اور روشن ہیں۔ حسن و جمال یا خوبی و کمال کی کوئی چمک اگر کہیں نظر پڑتی ہے وہ اسی کے وجہ منور اور ذات مبارک کے جمال و کمال کا

ایک پرتو ہے۔

سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ طائف میں جب لوگوں نے حضور ﷺ کو ستایا تو یہ دعا زبان پر تھی: ''اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَیْهِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ اَنْ یَّحُلَّ بِیْ غَضَبُکَ اَوْیَنْزِلَ بِیْ سَخَطُکَ لَکَ الْعُقْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ''رات کی تاریکی میں آپ ﷺ اپنے رب کو''اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کہہ کر پکارا کرتے اور اپنے کان، آنکھ، دل، ہر ہر عضو بلکہ بال بال میں اس سے نور طلب فرماتے تھے اور اخیر میں بطور خلاصہ فرماتے۔ ''وَاجْعَلْ لِیْ نُوْرًا'' یا ''وَاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا'' یا ''وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا'' یعنی میرے نور کو بڑھا بلکہ نور ہی نور بنا دے اور ایک حدیث میں ہے:''اِنَّ اللّٰه خلق خلقه فی ظلمة ثم القی علیهم من نوره فمن اصابه من نوره یومئذ اهتدی ومن اخطاه ضلّ''[فتح الباری ج۶، ص ۴۳۰] یعنی جس کو اس وقت اللہ کے نور (توفیق) سے حصہ ملا وہ ہدایت پر آیا اور جو اس سے چوکا گمراہ رہا۔ واضح رہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات مثلاً سمع، بصر وغیرہ کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی ایسے ہی صفت نور بھی ہے ممکنات کے نور پر قیاس نہ کیا جائے۔ تفصیل کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''مشکوٰۃ الانوار'' دیکھئے۔[تفسیر عثمانی ملخصاً ص ۴۶۰]

فائدہ:

اس آیت مبارکہ ''رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ'' سے معلوم ہوا کہ عبادت اور تجارت دونوں ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں، اور دین، دنیا کے منافی نہیں ہے، لہٰذا جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے جاتا رہتا ہے، بے کار ہو جاتا ہے، بالکل غلط اور جہالت ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کو فرض قرار دیا ہے۔ جس پر دنیا کا دارومدار ہے، جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں ہے کہ

''کسب الحلال فریضة''یعنی کسب حلال، فرض ہے۔ البتہ دنیا کی دل میں محبت بٹھالینا ممنوع اور مذموم ہے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں ہے:''حب الدنیا رأس کل خطیئة''یعنی دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔

شریعت مقدسہ نے حلال طریقہ سے ضروریات معاش کی تحصیل کوفرض قرار دیا ہے، البتہ اس کے ساتھ اس کے احکام بھی بتا دیئے ہیں اور از روئے عقل یہ بالکل درست ہے، دنیا کی کون سی حکومت ہے جس میں تجارت اور زراعت وغیرہ کے متعلق قوانین اور احکام موجود نہ ہوں۔ اسی طرح شریعت مطہرہ میں بھی تجارت اور زراعت وغیرہ کے احکامات موجود ہیں اور یہ احکام، دنیا کی مہذب اور متمدن حکومتوں کے احکام سے ہزار ہا درجہ سہل اور آسان ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ علماء کسب معاش یا حصول دنیا سے منع کرتے ہیں، قطعاً غلط ہے قرآن اور حدیث اور فقہ کی کتب میں ضروریات معاش کی تحصیل کوفرض قرار دیا گیا ہے، نیز اس کے احکام وضوابط بھی بیان کیے ہیں اور بے کار اور نکما رہنے کو ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ غربت وافلاس بسا اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:''کادالفقر ان یکون کفراً''یعنی قریب ہے کہ فقر وافلاس، کفر تک پہنچا دے۔

شریعت غراء نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ تم دنیا ترک کردو اور سب کے حقوق کو معطل کر کے کسی گوشہ میں بیٹھ جاؤ، بلکہ شریعت کہتی ہے کہ حلال طریقہ سے دنیا کماؤ اور اس کے تمام حقوق بھی ادا کرو اور کسی صورت میں قانون شریعت کے دائرہ سے باہر نہ نکلو۔ دنیا کی وہ کون سی مہذب اور متمدن حکومت ایسی ہے کہ جہاں کے باشندے تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت میں حکومتی قوانین سے آزاد ہوں۔

نکتہ:

اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کرنے والے شخص کو''مرد''نہیں کہا بلکہ ایسے لوگوں کو''مرد'' کہا جو دنیا کی تجارت، زراعت وغیرہ میں مشغول ہو کر بھی آخرت سے غافل نہ ہوں۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو ایسا نہ ہو وہ مرد نہیں۔

☆☆☆

(۴۱)

﴿کفار کے اعمال کی دو مثالیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــٴًـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾

[النور: ۳۹، ۴۰]

ترجمہ

''اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے کسی چٹیل میدان میں چمکتی ہوئی ریت، پیاسے آدمی (دور سے) اس کو پانی خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچا تو اس کو (اپنے گمان کے مطابق) کچھ بھی نہ پایا اور اس کے پاس اللہ کی قضاء کو پایا، پھر اللہ نے اس کی عمر کا حساب کتاب برابر چکا دیا اور اللہ تیزی کے ساتھ حساب لینے والا ہے یا (ان کے اعمال) تاریکیوں کی طرح ہیں۔ (وہ تاریکیاں) جو گہرے سمندر میں ہوں جس میں موجوں پر موجیں چڑھی ہوئی ہوں اور اس لہر پر بادل ہوں، یہ تاریکیاں ایسی ہوں کہ ایک کے اوپر دوسری چھائی ہو، اگر (ایسی تاریکیوں میں پھنس جانے والا) اپنا ہاتھ (جو اس کے بہت قریب ہے) تاریکی

میں باہر نکالے تو ہاتھ بھی اس کو دکھائی نہ دے اور جس کو اللہ نے روشنی عطا نہ فرمائی ہو اس کو روشنی نہیں مل سکتی۔“

تشریح

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے نور ہدایت کی مثال بیان فرمائی اور اس کو نور بالائے نور فرمایا۔ اب ان آیات کریمہ میں کافروں کے تاریک اور پر ظلمت اعمال کی دو مثالیں بیان فرماتے ہیں جو ظلمات بر ظلمات اور اندھیروں پر اندھیرا ہیں۔

کافر دو طرح کے ہیں، ایک وہ ہیں جو معاد کے قائل ہیں اور اپنے خیال کے مطابق کچھ ایسے کام کرتے ہیں اور یہ زعم رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد یہ اچھے کام ہمارے کام آئیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو معاد، جزا و سزا اور حشر و نشر کے منکر ہیں، اور دنیا کی لذتوں اور شہوتوں میں مستغرق اور منہمک ہیں۔ ان آیات کریمہ میں ان دو قسم کے کفار کے اعمال کی دو مثالیں بیان کرتے ہیں، جیسا کہ سورۃ البقرہ کے آغاز میں منافقین کے اعمال کی دو مثالیں ذکر فرمائیں۔ ایک آتشی اور ایک آبی نیز جس طرح سورہ رعد میں بھی دو مثالیں ذکر فرمائیں، ایک آتشی اور ایک آبی، اسی طرح یہاں بھی دو مثالیں بیان فرماتے ہیں۔

پہلی مثال

پہلی قسم کے کفار کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے کسی چٹیل میدان میں چمکتی ہوئی ریت، کہ پیاسا شخص اس کو دور سے دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے یہاں تک کہ جب وہ پیاسا آدمی اسے پانی سمجھ کر وہاں پہنچتا ہے تو اپنے خیال وگمان کے مطابق کوئی چیز نہیں پاتا، پانی کی بجائے اپنے پاس اللہ کے قہر و غضب کو پاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے حساب کتاب کو پورا پورا چکا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ اسے حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگتی، اس کے لیے کوئی دشواری یا مشکل نہیں ہے۔ یہ ان کفار کے اعمال کی مثال ہے جنہوں نے دنیا میں کچھ اچھے کام کیے، اپنے زعم

کے مطابق صدقہ وخیرات کیا اور ان کو آخرت کا ذریعہ خیال کیا ہم نے چند نیکیاں حاصل کرلی ہیں اور ہمیں اس کا ثواب اور بدلہ ملے گا، پس یہ کافر دنیا میں اپنے اعمال کو پانی کی طرح سمجھتا رہا کہ وقت آنے پر میرے کام آئیں گے۔ حالانکہ کفر وشرک کی نحوست کی وجہ سے وہ (اعمال) حقیقت میں پانی نہ تھے بلکہ ظاہری طور پر صورت وشکل کے اعتبار سے وہ پانی کے مشابہ تھے اور درحقیقت وہ سراب تھے، چمکتی ہوئی ریت کے مشابہ تھے، جب پیاس سے بے تاب اور بے چین ہوکر وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، اور اس وقت حقیقت آشکارا ہوئی اور ساری امیدوں پر پانی پھر گیا اور ہزاروں حسرتوں اور غم میں پیاسا ہی مر گیا، اسے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے ان اعمال سے راضی اور خوش ہوگا جب مر کر خدا کے حضور پہنچا تو آبِ حیات کی بجائے اسے غضب الٰہی کی آگ نظر آئی اور عمر بھر کی بداعمالیوں کا حساب چکا دیا گیا اور ہمیشہ کے لیے مبتلائے عذاب ہوکر تباہ وبرباد ہوگیا۔

دوسری مثال

دوسری قسم کے کافروں کے اعمال کی مثال بڑے گہرے سمندر کی تاریکیوں اور اندھیروں کی طرح ہے، جس پر موج سوار ہے اور موج کے اوپر ایک اور موج ہے اور پھر اس کے اوپر ایک بادل جو ستاروں کی روشنی کو بھی چھپائے ہوئے ہے، یہ تاریکیاں ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ہیں، اندھیرے پر اندھیرا ہے، مقصد یہ ہے کہ نہایت درجہ کا اندھیرا ہے، جب وہ اپنے ہاتھ کو باہر نکال کر دیکھنا چاہتا ہے جو (ہاتھ) تمام اعضاء میں اس کے قریب تر ہے اور قریب سے دکھائی دیتا ہے تو تاریکیوں اور اندھیروں کی شدت کی وجہ سے اپنے ہاتھ کو بھی نہیں دیکھ سکتا، پس جب وہ اپنے ہاتھ کو نہیں دیکھ سکتا جو آنکھ کے بالکل قریب ہے تو اور چیزوں کو بطریق اولیٰ نہیں دیکھ سکے گا، یہ دوسری مثال ان کافروں کے اعمال کی ہے جو ہمہ وقت نفسانی خواہشات اور دنیاوی لذات میں مستغرق ہیں اور اعمالِ بد کے اندھیروں اور تاریکیوں میں چھپے ہوئے ہیں کہ ان اندھیروں سے نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں، کفر اور جہالت کے تاریک اور عمیق سمندر میں غرق ہیں، جہاں روشنی کا نام و

نشان تک نہیں، ہر سو تاریکی ہی تاریکی اور اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اعتقاد بھی تاریک، قول بھی تاریک اور عمل بھی تاریک، ان لوگوں کے پاس روشنی کی اتنی بھی چمک نہیں جتنی سراب کو دیکھ کر نظر آتی ہے یہ لوگ تو ہر طرف سے تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں، روشنی کا کہیں نام ونشان بھی نہیں، اور جسے اللہ تعالیٰ روشنی عطا نہ فرمائے تو اس کے لیے پھر کہیں بھی روشنی نہیں، روشنی تو دین اسلام میں ہے، کفر وشرک میں روشنی کہاں سے آئی؟

ان کافروں کی مثال کے آخر میں یہ جملہ ایسا ہے جیسے مومنین کی مثال کے آخر میں ارشاد فرمایا تھا۔ ''یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ'' یہاں بھی اس کے مقابل میں فرمایا: وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ'' مومن کی حالت تو روشن ہے اور نور پر نور ہے اور کافر کی حالت تاریک ہے اور اندھیروں پر اندھیرے ہیں۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ، ج۵، ص ۱۳۴ تا ص ۱۳۵]

رئیس المفسرین حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''یہ دو قسم کے کافروں کی دو مثالیں ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں دو قسم کے منافقوں کی دو مثالیں بیان ہوئی ہیں، ایک آگ کی اور ایک پانی کی نیز جیسے سورۂ رعد میں بھی دو مثالیں، آگ اور پانی کی بیان ہوئی ہیں۔ اس آیت کریمہ میں پہلی مثال تو ان کفار کی ہے جو دوسروں کو کفر کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خود کو ہدایت پر سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ سخت گمراہ ہیں، ان کی مثال تو ایسی ہے جیسے کسی پیاسے آدمی کو جنگل و بیابان میں دور سے ریت چمکتی ہوئی دکھائی دے اور وہ اسے پانی کا موج زن دریا سمجھ بیٹھتا ہے، جیسے میدانوں میں سراب نظر آیا کرتے ہیں، دوپہر کے وقت ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ پانی کا وسیع دریا موجیں مار رہا ہے، جنگل میں جو پیاسا ہو، پانی کی تلاش میں اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور اسے پانی خیال کر کے جان توڑ کوشش کر کے اس تک پہنچتا ہے، لیکن حیرت وحسرت سے اپنا منہ لپیٹ لیتا ہے، دیکھتا ہے کہ وہاں تو پانی کا نام ونشان بھی نہیں، اسی طرح یہ کفار ہیں کہ اپنے دل میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم نے بہت سے اعمال کیے ہیں، بہت سی نیکیاں جمع کر رکھی

ہیں، لیکن قیامت کے روز وہ دیکھیں گے کہ ایک نیکی بھی ان کے پاس نہیں ہے یا تو ان کی بدنیتی کی وجہ سے غارت ہوچکی ہے یا شریعت کے مطابق نہ ہونے کی بناء پر برباد ہوگئی ہے۔ یہاں بالکل خالی ہاتھ رہ گئے ہیں۔ حساب کتاب کے موقع پر اللہ تعالیٰ خود موجود ہے اور وہ ایک ایک عمل کا حساب لے رہا ہے اور ان کا کوئی عمل اس قابل نہیں کہ اس کا انہیں ثواب دیا جائے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ یہودیوں سے قیامت کے روز سوال ہوگا کہ تم دنیا میں کس کی عبادت کرتے رہے، وہ کہیں گے کہ اللہ کے بیٹے عزیر کی، کہا جائے گا کہ تم جھوٹے ہو، اللہ کا کوئی بیٹا نہیں، اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اے اللہ! ہمیں بہت پیاس لگی ہوئی ہے، ہمیں پانی پلایا جائے، ان سے کہا جائے گا کہ دیکھو! وہ کیا نظر آرہا ہے؟ تم وہاں کیوں نہیں جاتے؟ اب انہیں دور سے دوزخ ایسی نظر آئے گی جیسے دنیا میں سراب ہوتا ہے جس پر پانی کے چلنے کا دھوکہ ہوتا ہے، یہ وہاں جائیں گے اور دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ یہ مثال تو جہل مرکب والوں کی تھی۔ اب جہل بسیط والوں کی مثال ملاحظہ کریں جو مطلق عقل سے کام نہیں لیتے تھے، کفر کے جن سرداروں کی اوپر مثال بیان ہوئی، یہ لوگ ان کی پیروی کرتے تھے اور آنکھیں بند کیے ان کی آواز پر کان دھرتے تھے، ان کی مثال گہرے سمندر کی تہہ کے اندھیروں جیسی ہے جسے اوپر سے تہہ بہ تہہ موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو، اوپر سے بادل ڈھانکے ہوئے ہوں، یعنی اندھیرے پر اندھیرا ہو، یہاں تک کہ ہاتھ بھی سجائی نہ دیتا ہو، اسی طرح یہ جاہل کفار ہیں کہ مطلق جاہل ہیں، جس کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں اسے بھی صحیح طور پر نہیں پہچانتے، اس کا بھی حق یا باطل پر ہونا انہیں معلوم نہیں، انہیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ انہیں کہاں لے جارہا ہے؟ جیسا کہ کہتے ہیں کہ کسی جاہل سے کسی نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ جارہا ہوں، پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کہاں جارہے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں، پس جس طرح اس سمندر پر موجیں اٹھ رہی ہیں اسی طرح کافر کے دل پر، اس کے کانوں پر اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ

غِشَاوَةً. یعنی اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے، نیز ایک اور آیت مبارکہ میں ارشاد ہے: ''اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ الخ یعنی کیا تم نے ان کو دیکھا ہے جنہوں نے خواہش پرستی شروع کر رکھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم پر بہکا دیا ہے اور ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔''

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ پانچ طرح کے اندھیروں میں ہوتے ہیں۔ (۱) قول (۲) عمل (۳) جانا (۴) آنا (۵) انجام۔ سب اندھیروں میں ہیں۔ جسے اللہ تعالیٰ اپنے نور (توفیق) کی طرف ہدایت نہ دے وہ نورانیت سے خالی رہ جاتا ہے، جہالت میں مبتلا رہ کر ہلاکت و تباہی میں پڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ ''مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ'' کہ جسے اللہ ہی گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ [تفسیر ابن کثیر ج۳، ص ۵۵۳ تا ص ۵۵۴]

علامہ قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

''یعنی کافروں کے اعمال (قیامت کے روز) ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچائیں گے، کیونکہ وہ سراب کی طرح (بے حقیقت) ہوں گے، سراب اس سفید ریت کو کہتے ہیں جو ریگستانی میدان میں دوپہر کے وقت دھوپ میں آب رواں کی طرح دور سے نظر آتی ہے، قیعة اور قاع (مفرد) بمعنی میدان، اس کی جمع قیعان آتی ہے، اور اس کی تصغیر قُوَیْع ہے۔ بعض کے نزدیک قیعة، قاع کی جمع ہے۔ کافر قیامت کے دن سخت ناکام ہوگا۔ اس کو اس پیاسے سے تشبیہ دی جو پانی کا سخت ضرورت مند ہو اور سراب کو آب (پانی) سمجھ کر نامراد ہو جائے۔ یہاں تک کہ جب اس ریت کے پاس جس کو پانی خیال کیا تھا پہنچ جائے یا سراب کی جگہ پر پہنچ جائے تو اسے گمان کے مطابق کچھ نہ ملے اور اس کے پاس اللہ کی قضاء کو پائے۔ وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ کا عذاب اپنے پاس پایا اور اللہ نے اس کے اعمال کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا۔

شبہ

آیت مذکورہ میں :وَجَدَ کا فاعل ظَمْاٰن ہے، لیکن اس صورت میں آیت کا مطلب خبط ہو جاتا ہے، کیونکہ مطلب یہ ہوگا کہ پیاسا آدمی سراب کے پاس اللہ کا عذاب پاتا ہے، یہ بے کار بات ہے، حقیقی مراد تو یہ ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے کافر اپنی سزا پائے گا لیکن وَجَدَ کی ضمیر کافر کی طرف راجع نہیں ہے؟

ازالہ

میرے نزدیک اس شبہ کے دو جواب ہیں۔

(۱) قیامت کے روز کافر سخت پیاسا ہوگا، آگ، پانی کی صورت میں اس کے سامنے آئے گی، وہ آگ کو پانی سمجھے گا اور اس کی طرف دوڑے گا لیکن وہاں اس کو اللہ کا عذاب آتشِ دوزخ کی صورت میں ملے گا اور اپنی خیالی مراد نہیں ملے گی۔

(۲) عذاب سے مراد آخرت کا عذاب نہیں ہے بلکہ وہ دکھ اور نامرادی مراد ہے جو سخت پیاسے آدمی کو سراب پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہے اور اس سارے دکھ کی بنیاد اس کی بد اعمالیاں ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے بہت سے جرائم سے درگزر فرماتا ہے۔ (ورنہ پوری بداعمالیوں کی سزا تو دنیا ہی میں اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیئے) بہتر یہ ہے کہ ''حَتّٰی'' کو ابتدائیہ قرار دیا جائے اور اس کا تعلق اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ سے مانا جائے، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کافر جب قیامت کے روز اپنے اعمال پر پہنچے گا اور اس کا کیا کرایا سامنے آئے گا تو وہاں اللہ کے عذاب کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، اس صورت میں ''جَآءَهٗ کی ضمیر کافر کی طرف راجع ہوگی۔ ظَمْاٰن''کی طرف راجع نہ ہوگی۔ اور ''هٗ''،ضمیر مفعول، عمل کی طرف راجع ہوگی، سراب کی طرف نہیں لوٹے گی۔

وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ" اور اللہ تیزی کے ساتھ حساب کتاب لینے والا ہے، ایک کے حساب میں مشغولیت اس کو دوسرے کے حساب سے نہیں روکتی، اس دنیا کے آدھے دن کے بقدر وقت میں وہ سب بندوں کا حساب لے لے گا۔

"اَوْ کَظُلُمٰتٍ" اس کا عطف "کَسَرَابٍ" پر ہے اور "اَوْ" تخییر کے لیے ہے، مطلب یہ ہے کہ مخاطب کو اختیار ہے کہ ان کفار کی بداعمالیوں کو سراب کی طرح سمجھے یا تاریکیوں کی طرح، ان کے اعمال قیامت کے روز موجب حسرت اور غیر مفید ثابت ہوں گے، اس لیے ان کو سراب کی مانند کہا جاسکتا ہے اور حق کی روشنی سے بالکل خالی ہیں۔ اس لیے ان کو تہہ بہ تہہ تاریکیاں قرار دیا جاسکتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ "اَوْ" تنویع کے لیے ہے، کیونکہ کافروں کے اعمال دو نوعیتوں کے ہیں، کچھ اچھے ہیں جیسے صدقہ خیرات، عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ اور کچھ برے ہیں، اول کو سراب سے تشبیہ دی اور دوسری قسم کے اعمال کو تاریکیوں سے تشبیہ دی۔ یا پھر کہا جائے کہ "اَوْ" تقسیم کے لیے ہے اور اختلاف زمان کی وجہ سے ان کے اعمال کی تشبیہ بھی مختلف طور پر ہے۔ دنیا میں ان کے اعمال کو اندھیروں کی مثل قرار دیا اور آخرت میں سراب کی طرح فرمایا۔

"فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ" گہرا سمندر جہاں پانی بہت ہوتا ہے، یہ لفظ لج کی طرف منسوب ہے۔ (لج کا معانی ہے کنڈ، جہاں پانی اکٹھا ہوتا ہے)۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "لُجِّیّ" کا معنی معظم الماء بیان کیا گیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "لجی" کا معنی ہے موجزن لہریں مارتا ہوا سمندر۔ "یَغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ" موج وہ لہر جو ہواؤں کے تلاطم سے پانی پر نمودار ہوتی ہے، موج پر موج چڑھنے سے مراد ہے پے درپے لہریں چڑھنا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ کافر کی بداعمالیوں کی تاریکیاں اس کے دل پر تہہ بہ تہہ چڑھی ہوئی ہیں جو اس کو ادراک حق اور ہدایت کو قبول کرنے سے روکتی ہیں، قلبی انکار حق ایک تاریک موجزن سمندر ہے جس پر گناہوں کی تہہ بہ تہہ تاریکیاں سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کی طرح چھائی ہوئی ہیں۔ پھر دل پر گمراہی کی مہر اور چھاپ اس (کالے) بادل کی طرح ہے جو سمندر کی موجوں کے اوپر

چھایا ہوا ہے۔ کافر جب واضح ترین حقیقت یعنی ایمان و اسلام پر غور کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو (دل کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں) دیکھ نہیں پاتا، تمام انبیاء کا انکار کرتا ہے، اس کے باوجود کہ ان کے معجزات واضح طور پر ان کی نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور پتھروں کو جو ساری کائنات عنصری میں پست ترین درجہ رکھتے ہیں، معبود قرار دیتا ہے۔

"وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ" مطلب یہ ہے کہ ہدایت، خداداد چیز ہے، بلکہ اہل حق کے ساتھ منطقی لوگ جو صغریٰ کبریٰ کو ترتیب دے کر نتیجہ نکالتے ہیں وہ بھی بتوفیق الٰہی اور امر وہبی ضروری نہیں کہ مقدمات کے بعد بھی نتیجہ نکل آئے۔ (یعنی فکر و نظر اور استدلال عقلی بھی عطیہ خداوندی ہے، خود عقل اللہ کی رہنمائی کے بغیر صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی) بہت سے وہ لوگ جو دنیوی معاملات میں بڑے بھولے اور نادان ہوتے ہیں مگر آخرت کے معاملات میں بہت تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں اور بکثرت آدمی دنیوی امور میں روشن خیال ہوتے ہیں مگر آخرت کی طرف سے یکسر غافل اور دینی امور میں بے سمجھ جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا، پھر اپنا کچھ نور اس پر ڈال دیا پس جس پر اس کے نور کا کوئی چھینٹا پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس پر نہ پڑا وہ گمراہ ہو گیا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ علم خداوندی پر قلم (لکھ کر) خشک ہو گیا۔" (یعنی آئندہ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول عقبہ بن ربیعہ کے حق میں ہوا۔ دور جاہلیت میں دین حق کا متلاشی تھا ٹاٹ کا لباس پہن رکھا تھا (اور حق کی جستجو میں سرگردان تھا) لیکن جب اسلام آیا تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔"

[تفسیر مظهری، ج۸، ص۲۵۸ تا ص ۲۶۰]

اسرار و نکات

جاننا چاہیئے کہ آیت کی ابتداء میں نور ہدایت اور نور توفیق کا ذکر فرمایا، اس کے بعد یہ بتایا کہ وہ نور ہدایت، اتباع شریعت اور التزام مساجد میں منحصر ہے اور "فِیْ بُیُوْتٍ

اَذِ نَ اللّٰہُ'' سے یہی مساجد مراد ہیں جن کی تعظیم واجب ہے اس کے بعد یہ بتایا کہ نور ہدایت کے لیے دوام ذکر اور دوام تسبیح اور رجال آخرت کی صحبت اور ہمنشینی ضروری ہے۔

''یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ'' میں دوام ذکر اور دوام تسبیح کی طرف اشارہ ہے اور ''رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ'' سے رجال آخرت کی صحبت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی ہے: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ'' اس کے بعد ''لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَاعَمِلُوْا سے تاجرانِ آخرت کی طرف اشارہ ہے اور ''وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ'' سے محبین، مخلصین اور اولیاء عاشقین کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا کہ نور ہدایت اور نور توفیق سے محروم رہے۔

''وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ'' سے ان ہی لوگوں کا ذکر ہے جن کو نور ہدایت میں سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ اس کے بعد کافروں کے اعمال کی دو مثالیں بیان کیں، اس لیے کہ کافروں کے اعمال دو طرح کے ہیں، ایک وہ ہیں جو بظاہر پسندیدہ ہیں جیسے صدقہ، صلہ رحمی، صدقہ خیرات اور عدل و انصاف اور ظلم و ایذا رسانی سے اجتناب، اس قسم کے اعمال ظاہراً اچھے ہیں مگر ان کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے اس لیے ایسے اعمال کو سراب سے تشبیہ کہ دور سے تشنہ لب اور پیاسا شخص اس سے امیدیں وابستہ کرتا ہے اور جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو حسرت و یاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور دوسری قسم کے اعمال وہ ہیں جو ظاہر میں بھی قبیح اور برے ہیں جیسے بت پرستی، ظلم وغیرہ اس قسم کے اعمال کو تاریکیوں سے تشبیہ دی گئی۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج۵، ص ۱۳۵، ۱۳۶]

☆☆☆

(۴۲)

﴿بت پرستوں کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۱-۴۴]

ترجمہ

”جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز بنا رکھا ہے ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی مکڑی نے کوئی جالا بنایا ہو اور سب سے زیادہ کمزور گھر بلاشبہ مکڑی کا ہوتا ہے، اگر وہ جانتے، وہ جس چیز کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں اللہ کو اس کا علم ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے، اور ہم لوگوں (کی ہدایت اور ان کو سمجھانے) کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور صرف اہل علم ہی ان کو سمجھتے ہیں، اللہ نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا، اس تخلیق میں اہل ایمان کے لیے نشانی ہے۔“

تشریح

گزشتہ آیات میں یہ بتایا تھا کہ ان لوگوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا اور کفر وشرک میں مبتلا ہوئے اور مورد عذاب بنے، اب ان آیات کریمہ میں ان کے ظلم کی توضیح کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی مثال جو بت پرستی کرتے ہیں مکڑی کی سی ہے جس کا گھر نہایت بودا اور کمزور ہوتا ہے، مکڑی کی طرح یہ لوگ بھی اپنے عقیدوں کا تانا بانا بنتے ہیں جو محض لغو اور فضول ہے۔

بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ ان ظالموں نے جس دین کو اپنا مضبوط قلعہ سمجھ رکھا ہے اس کی حقیقت مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کی مثال جنہوں نے خدا کے سوا اپنے کارساز اور حمایتی ٹھہرا رکھے ہیں اور ان کو اپنی مرادیں پوری کرنے والا سمجھتے ہیں، مکڑی کے مثل ہے کہ جو ایک گھر بنالیتی ہے اور وہ اس کو اپنا گھر سمجھتی ہے جس کی حقیقت ایک تنا ہوا جالا ہوتی ہے اور بلاشبہ تمام گھروں میں سب سے کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ اسی طرح جو لوگ بتوں کو اپنی پناہ گاہ اور محافظ ونگہبان جانے ہوئے ہیں، یہ پناہ مکڑی کے گھر کے مشابہ ہے کہ جو ذرا ہوا لگنے سے ہوا ہو جائے اور ظاہر ہے کہ مکڑی کا گھر نہایت کمزور اور بودا ہوتا ہے اور بے کار اور بے فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے یہ بت نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی پناہ اور سہارا دے سکتے ہیں۔ مکڑی کا گھر نہ سردی سے بچاتا ہے اور نہ گرمی سے، اسی طرح ان بتوں کا سہارا ڈھونڈنا ایسا ہے جیسے مکڑی کے گھر کا سہارا ڈھونڈنا۔ پس جس شخص نے بتوں پر بھروسہ کیا اس کا حال اس مکڑی کے مشابہ ہے کہ جس نے اپنے تانے ہوئے جالے کے گھر پر اعتماد اور بھروسہ کرلیا۔

حکماء کا قول ہے کہ مکڑی کے آٹھ پاؤں اور چھ آنکھیں ہوتی ہیں اور اس کے اندر ایک زہریلا مادہ بھی ہوتا ہے جو (زہر) آدمی کو ہلاک کرڈالتا ہے۔ اسی طرح مشرکین ہر جانب دوڑتے ہیں اور ان کی نگاہیں چکا چوند رہتی ہیں اور ان کے اندر شرک کا زہریلا مادہ ہوتا ہے جو ان کی ہلاکت اور تباہی کا باعث ہے۔ (آگے فرمایا) کاش یہ کافر جانتے

کہ ان کا دین مکڑی کے جالے کے مشابہ ناپائیدار اور ذلیل و خوار اور بے حقیقت اور بے مقدار ہے۔ اگر مشرکین کو ذرا بھی سوجھ بوجھ ہوتی اور جانتے کہ ہمارا دین مکڑی کے گھر کی طرح بے بنیاد ہے تو کبھی اس دین کو اختیار نہ کرتے، مطلب اور مقصد یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ بے شک اللہ ہی خوب جانتا ہے ان چیزوں کی حقیقت کو، جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں اور اللہ ہی غالب حکمت والے ہیں اور وہ ذات کمال حکمت اور کمال عزت کے ساتھ موصوف ہے۔ عزیز و حکیم ذات کو چھوڑ کر ناتواں اور کمزور کو اپنا سہارا بنانا کمال ابلہی ہے۔

اور یہ مثالیں ہم ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو نہیں سمجھتے مگر علم والے اور سمجھ والے۔ ان بت پرستوں کو چاہیے کہ ایک طرف تو ایسے بتوں کی کمزوری، عاجزی اور لاچاری کو دیکھیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قوت کو دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان نہایت حکمت کے ساتھ بنائے جو اس کی کمال قدرت اور کمال حکمت کی بیّن دلیل ہے۔

بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے بڑی نشانی (دلیل) ہے۔ اس لیے کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں خدا کا کوئی شریک نہیں، لہٰذا وہی ذات لائق عبادت و بندگی ہے جو زمین و آسمان کی خالق ہے، پس تم کو جو حاجتیں اور مرادیں مانگنی ہوں اور مصائب و مشکلات میں پکارنا ہو تو زمین و آسمان کے خالق سے ہی مانگو اور اس کو پکارو۔

[تفسیر معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج۵، ۳۷۰ تا ص ۳۷۱]

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

"جو کافر بتوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور انہوں نے بتوں کو اپنا محلِ اعتماد بنا رکھا ہے ان کی مثال ضعف اور کمزوری کے لحاظ سے ایسی ہے جیسے کسی مکڑی نے اپنا جالا بنایا ہو، بلکہ ان کا محل اعتماد مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہے، مکڑی کا جالا پھر بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے اور اس کا کچھ فائدہ مکڑی کو پہنچتا ہے، بت پرستوں کی حالت اس سے بھی گئی گزری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بت پرستوں کے مذہب کی مثال مکڑی کے جالے کی

طرح ہے یا مطلب یہ ہے کہ جن کافروں نے اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز اور حمایتی سمجھ رکھا ہے۔ اہل توحید کے مقابلہ میں ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی مکڑی نے اپنا گھر کسی آدمی کے گھر کے مقابلہ میں بنایا ہو۔ لفظ عنکبوت کا اطلاق واحد، جمع، مذکر اور مؤنث سب پر ہوتا ہے، اس کی جمع عناکیب، عکاب اور اعکب آتی ہے۔ عنکبوت کی ت، طاغوت کی ت کی طرح ہے۔

وَاِنَّ اَوۡهَنَ الۡبُيُوۡتِ لَبَيۡتُ الۡعَنۡكَبُوۡتِ "یعنی مکڑی کے گھر سے زیادہ کمزور اور کوئی گھر نہیں ہوتا، نہ سردی سے بچاتا ہے نہ گرمی سے۔ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ "یعنی اگر وہ لوگ علم کی طرف رجوع کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ ہی ان کی مثال ہے اور ان کا مذہب اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَايَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَيۡءٍ اگر کلمہ ما کو موصولہ قرار دیا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ جس چیز کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں اللہ کو اس کا علم ہے۔ اگر لفظ ما کو مصدریہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کی عبادتِ غیر اللہ کو جانتے ہیں۔ اور اگر لفظِ ماؔ کو نافیہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ واقف ہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی چیز کو نہیں پکارتے۔ اس صورت میں کافروں کی عبادت کو جو مذکورہ بالا عبارت میں "بیت عنکبوت" سے تشبیہ دی اس کی تاکید اس جملہ سے ہو جائے گی اور اس کام میں کافروں کی جہالت کا اظہار ہوگا۔ "وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ" یہ کلام سابق کی علت وغایت ہے کہ ایک غالب وحکیم ہستی کے ساتھ ایسی چیز کو عبادت میں شریک کرنا جو بالکل ہیچ اور بے حقیقت و بے مقدار ہیں، انتہائی حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، ہر چیز پر اس کو قدرت کاملہ حاصل ہے، عالمِ کل بھی ہے۔ اس کے مقابلہ میں بے جان جماد کوئی ہستی نہیں رکھتی، بالکل معدوم کی طرح ہے، ایسا علم محیط رکھنے والا قادر مطلق یقیناً منکروں کو سزا دینے پر قدرت تامہ رکھتا ہے۔

"وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ ج وَمَا يَعۡقِلُهَا اِلَّا الۡعَالِمُوۡنَ "یعنی ہم لوگوں کی ہدایت وتعلیم کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں اور اشیاء کے حقائق وکیفیات کو جانتے ہیں۔

امام بغویؒ نے حضرت عطاءؒ اور ابوالزبیرؒ کی روایت بیان کی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آیت مبارکہ :وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُھَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' تلاوت فرمائی، پھر فرمایا کہ عالم وہ ہے جس کو اللہ کی طرف سے سمجھ ملی ہو اور سمجھنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کرے اور نافرمانی سے پرہیز کرے۔ امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ اور واحدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب العقل میں حارث بن اسامہ کے طریق سے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔

ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ذکر موضوعات میں کیا ہے۔

''اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ'' یعنی اس تخلیق ارض وسماء میں ایمان والوں کے لیے نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور توحید کی، اس کے ہمہ گیر علم محیط، قدرت کاملہ اور تمام عیوب و نقائص سے منزہ اور پاک ہونے کی اور چونکہ ایمان والے ہی اس سے نفع اندوز اور ہدایت یاب ہوتے ہیں اس لیے ان ہی کے لیے یہ تخلیق رہنما ہے۔''

[تفسیر مظہری ج۹، ص ۱۲۱، تا ص ۱۲۲]

تفسیر و حدیث اور تاریخ کے امام حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جو لوگ، اللہ رب العالمین کے سوا دوسروں کی پوجا پاٹ کرتے ہیں ان کی کمزوری اور بے علمی بیان ہو رہی ہے، یہ لوگ ان سے مدد، رزق اور مشکلات میں کام آنے کے امیدوار ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مکڑی کے جالے میں بارش، دھوپ اور سردی سے پناہ ڈھونڈے، اگر ان میں علم موجود ہوتا تو یہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق سے امیدیں وابستہ نہ کرتے، پس ان کی حالت اہلِ ایمان کی حالت کے بالکل برعکس ہے کہ وہ ایک مضبوط کڑے کو تھامے ہوئے ہیں اور یہ لوگ مکڑی کے جالے میں اپنا سر چھپائے ہوئے ہیں، اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور جسم، اعمالِ صالحہ میں مشغول ہے اور ان کا دل مخلوق کی طرف متوجہ ہے اور جسم اس کی پرستش کی طرف مائل ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ، مشرکین کو تنبیہ فرما رہے ہیں کہ وہ ان سے اور ان کے کفر و شرک اور معبودوں سے خوب آگاہ ہیں، انہیں ان کی شرارتوں اور بداعمالیوں کا ایسا مزہ چکھائے گا

کہ یہ یاد کریں گے، اُنہیں ڈھیل دینے میں اس کی مصلحت اور حکمت پنہاں ہے۔ یہ بات نہیں کہ وہ ان سے بے خبر ہے۔ ہم نے تو مثالوں سے بھی سمجھا دیا لیکن اس کے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی توفیق صرف باعمل علماء کو ملتی ہے جو اپنے علم میں کامل ہیں۔ اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ مثالوں کو سمجھ لینا علم صادق کی دلیل ہے۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار مثالیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سیکھیں اور سمجھیں'' [مسند احمد]

اس سے آپ کی فضیلت اور علمیت آشکار ہوتی ہے۔ حضرت عمرو بن مرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ کی جو آیت میں تلاوت کرتا ہوں اور اس کا تفصیلی معنی و مطلب میری سمجھ میں نہ آئے تو میرا دل بہت دکھتا ہے، مجھے سخت کوفت ہوتی ہے اور میں ڈرنے لگتا ہوں کہ کہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا شمار جاہلوں میں تو نہیں ہو گیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہی ہے کہ ہم یہ مثالیں لوگوں کے سمجھنے کے لیے بیان کرتے ہیں، لیکن اہلِ علم کے سوا انہیں دوسرے لوگ نہیں سمجھتے۔'' [تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۱۵۰]

☆☆☆

(۴۴)

﴿کفر اور شرک ہلاکت کا باعث ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِىْ بِهِ الرِّيْحُ فِىْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ [الحج: ۳۱]

ترجمہ

''اللہ کے لیے دین کو خالص رکھنے والے (دین میں کسی مخلوق یہاں تک کہ اپنی نفسانیت کو دخل نہ دینے والے) ساجھی قرار دینے والے نہ ہوں اس کے ساتھ، اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑتا ہے پھر پرندے اس کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں یا طوفان اس کو کسی دور جگہ لے جا کر پھینک دیتا ہے۔''

تشریح

''حنیف'' کا لفظ حنف سے نکلا ہے اور حنف کا معنی ہے استقامت (قاموس) اور حق پر قائم رہنے اور استقامت رکھنے کا معنی ہے اللہ کے لیے عبادت کو خالص کرنا اور دوسروں کی پرستش سے منہ موڑنا۔ مطلب یہ ہوگا کہ تمام باطل دینوں سے بیزار ہو کر دینِ حق کی طرف مائل ہونے والا اور خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔

''روح المعانی'' کے الفاظ یہ ہیں: ''مائلین عن کل دین فرائغ الی الدین الحق مخلصین له تعالٰی'' یعنی ہر مذہب سے اعراض کرنے والا اور دینِ حق کی طرف مائل ہونے والا اور خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔ ''غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ

بِہٖ" یعنی اللہ کے ساتھ نہ عبادت میں، نہ واجب الوجود ہونے اور نہ ہی الوہیت میں شریک کرنے والے ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ شرک میں مبتلا شخص نہ حنیف ہوسکتا ہے اور نہ دینِ ابراہیمی پر ہوسکتا ہے۔ "وَ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ الخ" یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتا ہے وہ گویا آسمان سے گر پڑتا ہے، پھر پرندے اس کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں یا طوفان اس کو کسی دوجگہ لے جا کر پھینک دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، کمالِ رفعت و بلندی ہے، اس سے اعلیٰ اور بالا کوئی چیز نہیں ہے، جیسے کوئی شخص آسمان پر چڑھا ہوا ہو اور سب سے اونچا دکھائی دیتا ہو، اس سے اونچا بلکہ اس کے برابر کوئی اور نہ ہو لیکن جب اللہ کی عبادت کے ساتھ کسی مخلوق کی عبادت کو کوئی شریک کر دیتا ہے تو وہ کمالِ رفعت کی چوٹی سے نیچے گر پڑتا ہے، جیسے آسمان پر چڑھا ہوا آدمی پستی کے غار میں گر پڑے، اس سے زیادہ پستی اور کیا ہوگی کہ آدمی اپنی ہی جیسی مخلوق کی پوجا کرنے لگے، ایسا آدمی تو پتھروں سے بھی زیادہ پست درجہ اور ذلیل ہے۔ پرندوں کے اچک لے جانے میں استعار بالکنایہ ہے، پرندوں سے مراد ہیں تباہ کن خواہشاتِ نفس، جو انسان کی یکسوئی اور اطمینانِ خاطر کو چھین لیتی ہیں، اور خیالات کو پریشان کر دیتی ہیں: "تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ" میں استعارہ بالکنایہ ہے، ریح (طوفان باد) سے مراد ہے شیطان۔ شیطان ہی انسان کو پرلے درجہ کی گمراہی کے مقام پر جا پھینکتا ہے۔ "مَکَان" سے مراد ہے گمراہی کا مقام اور "سَحِیْق" کا معنی ہے دور یعنی حق سے دور۔ مطلب یہ ہے کہ مشرک پر نفس و شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور شیطان انسان کو ایمان کی بلندی سے گمراہی کی پستی میں پھینک دیتا ہے۔ لفظ "اَوْ" منع خلو کے لیے ہے، منع جمع کے لیے نہیں ہے، (یعنی یہ ممکن ہے کہ ہوائی طوفان اس کو کہیں دور جا پھینکے اور پرندے بھی اچک لیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہو)

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس مقام پر "اَوْ" کا لفظ تقسیم کے لیے ہے، کیونکہ مشرک دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) جو کبھی بھی شرک سے نہ نکلیں، شرک چھوڑنا ان کے لیے ناممکن ہو، گویا وہ ایسے ہیں کہ جن کو پرندے اُچک لیں اور چیر پھاڑ کر کے برابر کر

دیں۔ (۲) کبھی مشرک توبہ کر لیتے ہیں اور شرک سے رہائی ممکن ہوتی ہے، وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے طوفان کسی کو دور جا پھینکے۔ ممکن ہے کہ وہ نہ مرے اور صحیح و سالم گھر لوٹ آئے۔

صحیح قول یہ ہے کہ یہ تشبیہ مرکب بمرکب ہے، شرک کرنے والے کی حالت اس شخص کی حالت کی طرح ظاہر کی گئی ہے جو آسمان سے گر پڑے اور کسی تدبیر سے وہ اپنے آپ کو بچا نہ سکے، اس کا ہلاک ہونا یقینی ہے، خواہ اس طرح ہو کہ پرندے راستہ میں اس کو اُچک لیں یا کوئی طوفان اس کو کہیں دور لے جا کر پٹخ دے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کافروں کے اعمال کو آسمان سے گرنے والے کے حال سے تشبیہ دی ہے، کفار کے اعمال بھی اکارت اور ضائع ہو جائیں گے اور کوئی عمل سودمند نہ ہوگا (اور آسمان سے گرنے والے کی ہر بچاؤ کی تدبیر بھی اکارت جائے گی کسی طرح اس کو ہلاکت سے بچا نہ سکے گی)۔

سورۂ اعراف کی آیتِ کریمہ: "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ" کی تفسیر کے ذیل میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ طویل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کافر بندے کے مرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "فرشتے اس کی روح کو چڑھا لے جاتے ہیں، جب آسمانِ دنیا تک پہنچتے ہیں اور (دروازہ) کھلوانے کی خواہش کرتے ہیں تو کافر کی روح کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیتِ مبارکہ: "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الخ" تلاوت فرمائی۔ (اور فرمایا کہ) پھر اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس کی کتاب نچلی زمین کے اندر سجین میں لکھ لو، حسب الحکم اس کی روح پھینک دی جاتی ہے، اس کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیتِ ہذا: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ الخ تلاوت فرمائی"

[دیکھیے: تفسیر مظہری ج ۸، ص ۷۷، ۷۸]

حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے خود کو ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں جھونک دیا، اور اپنی جان ضائع کر دی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص آسمان سے گر پڑے اور شکاری پرندے اس کی بوٹیاں نوچ لیں یا ہوا اڑا کر اسے

کسی بہت گہرے کھڈ میں جا پھینکے۔[مدارک التنزیل ج ۳، ص ۷۸]

یا یہ تشبیہ تفصیلی ہے، یعنی ایمان اور توحید کو آسمان سے اور شرک کرنے کو آسمان سے گرنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اور شکاری پرندوں سے افکار باطلہ اور اھواءِ نفسانیہ مراد ہیں اور ہوا سے مراد شیطان ہے، یعنی جو شخص شرک کر کے ایمان وتوحید کے بلند ترین مقام سے خود کو گراتا ہے وہ کسی صورت بچ نہیں سکتا یا تو امانیِ باطلہ اور خیالاتِ فاسدہ کے خون خوار پرندے اس کی بوٹیاں نوچ لیں گے اور اس کی عقل وفکر کو اس طرح معطل کر دیں گے کہ وہ سوچنے اور سمجھنے کی توفیق سے محروم ہو جائے گا، یا پھر شیطان، تیز ہوا کے جھکڑ کی طرح اسے اڑا کر صراطِ مستقیم سے کہیں دور لے جا کر پھینک دے گا۔

[روح المعانی، تفسیر کبیر ج ۶، ص ۱۸۲]

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دھلوی فرماتے ہیں: ''اور جو کوئی شریک کرے اس کی مثال فرمائی اس واسطے کہ جس کی نیت ایک اللہ پر ہے وہ قائم ہے اور جہاں نیت بہت طرف گئی وہ سب اس کو راہ میں سے اُچک لے گئے یا سب سے منکر ہو کر دہری ہو گیا۔'' [موضح القرآن]

☆☆☆

(۴۴)

﴿ضلالت اور ہدایت برابر نہیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ﴾

[القصص: ٦١]

ترجمہ

''کیا وہ شخص جس سے ہم نے پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے اور وہ اس کو (یعنی وعدہ کیے ہوئے ثواب کو) پائے گا، بھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو دنیوی فوائد سے تو ہم نے بہرہ اندوز کر دیا ہے، پھر قیامت کے دن وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو گرفتار کر کے حاضر کیے جائیں گے۔''

شانِ نزول:

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ حضرت علیؓ و حمزہؓ اور ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ امام سدیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور ولید بن المغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض کے نزدیک حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۳۵۵]

تشریح

گزشتہ آیات میں ایمان و ہدایت کی ترغیب اور کفر و ضلالت سے ترہیب کا ذکر تھا، اب اس آیتِ کریمہ میں یہ بتاتے ہیں کہ ایمان و ہدایت کے ثمرات اور کفر و ضلالت

کے نتائج کا ظہور قیامت کے روز ہوگا، زیرِ تفسیر آیت میں اجمالی طور پر اہلِ دنیا اور اہلِ آخرت کے فرق کو بیان کیا گیا، اس کے بعد اس کی تفصیل ذکر فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بے عقلو! تم جو کفر و ضلالت کو ایمان و ہدایت پر اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو، کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں، سو جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا، جس میں نہ ضرر کا احتمال ہے اور نہ غلط بیانی کا امکان ہے، پس جس مومن سے ہم نے ایمان لانے اور ہدایت قبول کرنے پر دنیا و آخرت کا جو وعدہ کیا ہے وہ اس کو ضرور پالے گا تو کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دنیوی زندگی کا چند روزہ سامان دیا، پھر وہ ختم ہوا، اور پھر قیامت کے دن وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو عذاب کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔ ذرا عقل سے کام لو اور بتاؤ کہ کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ چند روز خوب مزے اڑائے اور حکومتی قانون کی کوئی پرواہ نہ کی، بالآخر گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا، کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ ان دونوں میں کون اچھا رہا اور تمہیں کسی زمرہ میں شامل ہونا چاہیے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ملخصاً ج ۵، ص ۳۳۱ تا ص ۳۳۲]

حاصل یہ کہ (" اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ الخ" میں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے کہ) ایک مومن وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے جنت اور نعیمِ دائم کا وعدہ فرمایا ہے اور لامحالہ وعدے کے مطابق اسے سب کچھ ملنے والا ہے اور ایک وہ مشرک ہے جو دولتِ ایمان سے محروم ہے لیکن دنیوی ساز و سامان اور دولت و ثروت سے مالا مال ہے اور بالآخر قیامت کے دن عذابِ جہنم میں مبتلا ہونے والا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

☆☆☆

(۴۵)

﴿اللہ کا علم اور قدرت غیر محدود ہے﴾

آیت کریمہ:

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ [لقمان: ۲۷]

ترجمہ

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم ہو جائیں اور سمندر کو اس کے پیچھے سے مزید سات سمندر مدد پہنچائیں (یعنی سب سیاہی بن جائیں) اللہ کے کلمات (معلومات) ختم نہیں ہوں گے۔''

شانِ نزول:

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہود نے رسولِ کریم ﷺ سے روح کے متعلق دریافت کیا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی: ''وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ'' [الاسراء: ۸۵] پھر جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو علماءِ یہود، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے محمد ﷺ! ہمیں آپ کی طرف سے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ ﷺ کہتے ہیں کہ ''وَ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا'' یعنی تم لوگوں کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے'' اس سے ہم لوگ مراد ہیں یا آپ ﷺ کی قوم؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سب مراد ہیں''۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ وہ آیت تلاوت نہیں کرتے جس میں یہ ہے کہ ہمیں تورات دی گئی ہے جس میں ہر چیز کا علم موجود ہے؟

رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں سب کچھ قلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں صرف اتنا علم دیا ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہیں فائدہ حاصل ہو''۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ اے محمد ﷺ! یہ آپ ﷺ کیسے کہتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا'' [البقرہ: ۲۶۹] یعنی جو شخص حکمت و دانائی سے نوازا گیا، وہ خیرِ کثیر سے نوازا گیا، اب یہ دونوں باتیں کیونکر جمع ہوسکتی ہیں؟ ایک موقع پر فرمایا گیا کہ تمہیں علم قلیل دیا گیا ہے اور ایک جگہ فرمایا کہ تم کو خیرِ کثیر عطا کیا گیا ہے؟ اس پر مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔ [آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۳۶۳]

تشریح

اس آیتِ مبارکہ میں یہ بتاتے ہیں کہ آسمان و زمین اگرچہ متناہی اور محدود ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت غیر متناہی اور غیر محدود ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض زمین کے درخت قلم بن جائیں اور بحرِ محیط سیاہی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر اور اس کی مدد کریں اور وہ بھی سیاہی بن جائیں اور پھر ان سے اللہ تعالیٰ کی باتیں لکھی جائیں تو یہ تمام قلمیں اور روشنائی سب ختم ہو جائیں اور اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ اس آیتِ مبارکہ میں سات سمندروں کا ذکر حصر کے طور پر نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ علمِ الٰہی کے مقابلہ میں سات سمندر بلکہ سات ہزار سمندر بھی ایک قطرۂ آب کی مانند ہیں، کسی مخلوق کی مجال نہیں کہ وہ کلماتِ الٰہی کا اندازہ لگا سکے۔ دنیا کے تمام درخت اور تمام سمندر محدود اور متناہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کلمات (علم و حکمت) یا اس کے عجائبِ صفت و قدرت یا اس کی معلومات غیر محدود اور غیر متناہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معلومات اور مقدورات کی کوئی حد نہیں ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ''کلمات اللّٰہ'' سے وہ کلماتِ قدسیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ قائم ہیں وہ حصر اور شمار سے باہر ہیں اور قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔

فائدہ:

مفسرین لکھتے ہیں کہ سات سمندر یہ ہیں: (۱) دریائے حبشہ (۲) دریائے روم (۳) دریائے ہند (۴) دریائے قلزم، جس کے کنارے پر جدہ واقع ہے۔ (۵) دریائے چین (۶) دریائے فارس تا بہ بصرہ (۷) بحیرۂ طبریہ۔ (آگے فرمایا) بے شک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵ ص ۴۳۷]

تاریخ وتفسیر کے امام ابوالفداء حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیتِ کریمہ کی تشریح میں رقمطراز ہیں: ''اللہ رب العالمین اپنی عزت وکبریائی، جلالت وبزرگی بیان فرمارہے ہیں، اپنی مقدس صفات اور اپنے بلند ترین نام اور اپنے بے شمار کلمات کا ذکر فرمارہے ہیں، جنہیں نہ کوئی شمار کرسکتا ہے، نہ ان پر کسی کا احاطہ ہوسکے اور نہ ان کی حقیقت کا کوئی ادراک کرسکے۔ سید البشر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ''لا احصی ثناء علیک کما اثنیت علی نفسک'' ''اے اللہ! میں آپ کی تعریفوں کو اتنی بھی شمار نہیں کرسکتا جتنی تعریف آپ نے خود اپنی فرمائی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلمیں بن جائیں اور تمام سمندر کے پانی سیاہی بن جائیں اور ان کے ساتھ سات سمندر اور بھی ملا لیے جائیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت وصفات اور جلالتِ شان اور بزرگی کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو یہ تمام قلمیں گھس جائیں، ختم ہو جائیں اور سب سیاہیاں ختم ہو جائیں لیکن اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی تعریفیں ختم نہ ہوں گی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اگر سات سے زیادہ سمندر ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ کے تمام کلمات لکھنے کے لیے کافی ہو جائیں گے، ایسا ہرگز نہیں، یہ تعداد تو محض زیادتی بتانے کے لیے ہے، نیز یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ سات سمندر موجود ہیں اور وہ پورے عالَم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ البتہ ان سات سمندروں کی بابت بنی اسرائیل کی ایسی روایات موجود ہیں جن کی نہ تصدیق کی جاسکتی ہے اور نہ تکذیب۔ جو تفسیر ہم نے کی ہے اس کی تائید اس آیتِ کریمہ سے بھی ہوتی ہے: ''قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا الخ'' یعنی اگر سمندر سیاہی

بن جائے اور رب کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو کلمات اللہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ایسا ہی اور سمندر اس کی مدد کے لیے لائیں۔ لہٰذا یہاں بھی مراد صرف اس جیسا ایک ہی سمندر لانا نہیں ہے بلکہ اس جیسے کئی سمندر ہوں، خواہ کتنے ہی سمندر ہوں لیکن اللہ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ لکھوانا شروع کریں کہ میرا یہ امر اور یہ امر لکھو تو تمام قلمیں ٹوٹ جائیں اور تمام سمندر کے پانی ختم ہو جائیں۔ مشرکین کہتے تھے کہ یہ کلام اب ختم ہو جائے گا، جس کی تردید اس آیتِ کریمہ میں ہو رہی ہے کہ نہ رب تعالیٰ کے عجائبات ختم ہوں گے، نہ اس کی حکمت کی انتہاء ہے اور نہ ہی اس کے علم اور صفت کا اختتام۔ تمام مخلوق کے علم، اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر کے مقابلہ میں پانی کا ایک قطرہ۔ اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہوتیں، نہ اس کا کوئی ادراک کر سکتا ہے، اور جو کچھ ہم اس کی تعریف کریں وہ اس کے ماسوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے، یعنی تمام چیزیں اس کے سامنے عاجز و پست ہیں، کوئی اس کے ارادہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا، اس کا کوئی حکم ٹالا نہیں جا سکتا اور اس کی منشاء کو کوئی بدل نہیں سکتا، وہ اپنے افعال و اقوال اور صفات میں سب سے اعلیٰ غالب اور قہار ہے۔" [تفسیر ابنِ کثیر ج ۴، ص ۲۰۱ تا ۲۰۲ ملخصاً]

سوال:

آیتِ کریمہ میں "مِنْ شَجَرَةٍ" (جتنے درخت) کا لفظ کیوں استعمال فرمایا: "مِنْ شَجَرٍ" کا لفظ کیوں نہیں استعمال فرمایا، اس میں کیا حکمت پنہاں ہے؟

جواب:

"مِنْ شَجَرَةٍ" کا لفظ اس لیے استعمال کیا، تا کہ اس امر پر دلالت ہو سکے کہ جنسِ شجر میں سے کوئی بھی شجرہ باقی نہ رہے جس کی اقلام نہ بنائی گئی ہوں۔

سوال:

"اَلْكَلِمٰتِ" تو جمع قلت ہے، جب اس سے مقصود تعظیم بتلانا ہے تو پھر جمع

کثرت یعنی ''اَلْکَلِم'' کا لفظ بظاہر زیادہ مناسب تھا؟

جواب:

جمع قلت کا استعمال مقصود کے زیادہ قریب ہے، وہ اس طرح کہ جب لفظ جمع قلت بھی ان اقلام اور سیاہی سے ختم نہیں ہو سکتے تو جمع کثرت کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔

[نکات القرآن ص ۳۰۹]

☆☆☆

(۴۶)

﴿اللہ کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ [لقمان: ۲۸]

ترجمہ

''تم سب کو پیدا کرنا اور سب کو (قیامت کے دن زندہ کر کے) اٹھانا (اللہ تعالیٰ کے لیے) بس ایک شخص (کے پیدا کرنے اور اٹھانے) کی طرح ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تم سب کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ اٹھانا ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کو پیدا کرنا اور اٹھانا، اس کی ذاتی قدرت سے جب اس کے ارادہ کا تعلق ہو جائے تو سب کو پیدا کرنے اور اٹھانے کے لیے بس یہی کافی ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک کام میں مشغول ہونے کے وقت دوسرے کام سے غافل ہو جائے، آن کی آن میں جس طرح ایک کی تخلیق اس کے ارادے سے ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک پل میں سب کی تخلیق بھی اس کے ارادے سے ہو سکتی ہے، وہ ہر سنی جانے والی آواز کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے، ایک چیز کی شنوائی اور بینائی اس کو دوسری چیزوں کی شنوائی اور بینائی سے مانع نہیں ہو سکتی۔ یا ''سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ'' کا مطلب یہ ہے کہ شرک جو قیامت کا انکار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اس قولی انکار کو سننے والا اور ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

[تفسیر مظھری ج ۹، ص ۱۷۸]

(۴۷)

﴿نمونے موجود ہوتے ہوئے دوبارہ زندگی کا انکار کیسے؟﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ﴾

[السجدة: ۲۷]

ترجمہ

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سوکھی زمین کی طرف پانی کو چلاتے ہیں، پھر پانی سے ہم کھیتی پیدا کرتے ہیں جس کو ان کے چوپائے کھاتے ہیں اور یہ خود کھاتے ہیں، کیا ان کو نہیں سوجھتی۔''

تشریح

اس آیتِ کریمہ میں منکرینِ قیامت کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ کیا حشر ونشر کے یہ منکرین دیکھتے نہیں کہ ہم پانی کو یعنی بادل کو بنجر اور خشک زمین کی طرف ہانکتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعہ کھیتی نکالتے ہیں جس سے ان کے چوپائے اور وہ خود کھاتے ہیں، سو کیا یہ لوگ اس نشانِ قدرت کو نہیں دیکھتے۔ پس جو خدا خشک زمین سے گھاس اگانے پر قادر ہے وہ انسانوں کو مٹی ہو جانے کے بعد بھی دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ زراعت کے وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ دانہ زمین میں دفن ہو گیا مگر اس کی باطنی کیفیت نہیں معلوم کہ وہ دانہ کس طرح غلہ اور پھل کی صورت میں نمودار ہوا اور انسان خود اپنی پیدائش میں اصل کیفیت کو نہیں جانتا کہ غذا جسم میں متحیل ہو کر کس طرح خون بنی اور کس طرح منی کا قطرہ پیدا ہوا اور رحمِ مادر میں پہنچ کر نو ماہ میں ولادت کی منزلیں کس طرح طے

ہوئیں اور پھر ولادت سے لے کر لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کی منزلیں کس طرح طے ہوئیں اور یہ سب باتیں نظروں کے سامنے ہیں مگر باطنی کیفیت اور اندرونی حقیقت کسی فلسفی کو بھی معلوم نہیں ہے، پس اگر کسی کو دوبارہ زندہ ہونے کی کیفیت اور حقیقت معلوم نہ ہوسکے تو اس سے دوبارہ زندہ ہونے کا محال ہونا لازم نہیں آتا۔ دُنیا کی ہزارہا چیزیں محسوس ہیں مگر انسانی عقل ان کی حقیقت اور کیفیت کے ادراک سے قاصر ہے تو صرف اتنی بات سے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی، کسی چیز کا محال ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ خلاصہء کلام یہ کہ جب مُردوں کے زندہ کرنے کے نمونے تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں تو پھر دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کیوں کرتے ہو۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلوی ج ۵، ص ۴۵۵ تا ۴۵۶]

علامہ قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ: ''کیا ان کو اپنے سامنے کی بات بھی نہیں سوجھتی کہ زمین کو زندہ کرنا، پھر اس سے جانوروں اور انسانوں کا رزق پیدا کرنا دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے، اس کا فضل وسیع ہے اور قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کرنے پر وہ قادر ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے جس کو امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشرکین سے کہا تھا کہ عنقریب ہم راحت و چین پائیں گے، مزے اڑائیں گے، اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ میں (مصنف) کہتا ہوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندوں کا فیصلہ کر دے گا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ''عنقریب فیصلہ کر دینے'' سے مراد تھی فتح مکہ۔ سدّی نے کہا کہ ان کی مراد بدر کی لڑائی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ ہمارا مددگار ہے، وہ ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا، کافر بطورِ مذاق کہتے تھے کہ ایسا کب ہوگا؟! اس کے متعلق آیت نازل ہوئی: ''وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ''

[تفسیر مظہری ج ۹، ص ۱۹۵]

امام المفسرین حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم اور احسان و انعام کو بیان فرماتے ہیں کہ آسمان سے پانی اتارتا

ہے، پہاڑوں سے اونچی جگہوں سے سمٹ کر ندی نالوں اور دریاؤں کے ذریعہ وہ اِدھر اُدھر پھیل جاتا ہے، بنجر غیر آباد زمین میں اس سے ہریالی ہی ہریالی ہو جاتی ہے، خشکی، تری سے اور موت، زندگی سے بدل جاتی ہے، مفسرینِ کرام کا اگرچہ یہ قول بھی ہے کہ ''الجرز'' سے مصر کی زمین مراد ہے، یہ درست ہے، مصر میں بھی ایسی زمین ہو تو ہو، آیتِ مبارکہ میں مراد تمام وہ حصے ہیں جو سوکھ گئے ہوں جن کو پانی کی ضرورت ہو اور سخت ہو چکے ہوں اور زمین یبوست کی وجہ سے پھٹنے لگی ہو، بلاشبہ مصر کی زمین بھی ایسی ہے، دریائے نیل سے وہ سیراب کی جاتی ہے، حبش کی بارشوں کا پانی اپنے ساتھ سرخ رنگ کی مٹی کو بھی گھسیٹتا جاتا ہے اور مصر کی زمین میں جو شور والی اور ریتلی ہے، وہ اس پانی اور مٹی سے کھیتی کے قابل ہو جاتی ہے، اور ہر سال ہر فصل کا غلہ، تازہ پانی سے انہیں میسر آتا ہے جو اِدھر اُدھر کا ہوتا ہے، اس حکیم و کریم اور منّان و رحیم کی یہ سب مہربانیاں ہیں۔ اسی کی ذات قابلِ تعریف ہے۔

مروی ہے کہ جب مصر فتح ہوا تو مصر کے لوگ بوائی کے مہینہ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہماری قدیم عادت ہے کہ اس مہینہ میں کسی کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اگر نہ چڑھائیں تو دریا میں پانی نہیں آتا، ہم ایسا کرتے ہیں کہ اس مہینہ کی بارہویں تاریخ کو ایک کنواری لڑکی کو جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہو، اس کے والدین کو دے دلا کر رضامند کر لیتے ہیں اور اسے بہت عمدہ کپڑے اور قیمتی زیور پہنا کر بنا سنوار کر اس دریائے نیل میں ڈال دیتے ہیں تو اس کا بہاؤ چڑھتا ہے ورنہ پانی چڑھتا ہی نہیں۔ (ہم کیا کریں؟) فاتحِ مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ ایک جاہلانہ اور احمقانہ رسم ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، اسلام تو ایسی رسموں کو مٹانے کے لیے آیا ہے، تم اب ایسا نہیں کر سکتے، لوگ باز رہے، لیکن دریائے نیل کا پانی نہ چڑھا، مہینہ پورا گزر گیا، لیکن دریا خشک رہا، لوگ تنگ آ گئے اور مصر چھوڑ دینے کا ارادہ کرنے لگے، فاتحِ مصر کو خیال آیا اور انہوں نے دربارِ خلافت کو اس سے مطلع کیا، اسی وقت خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے جواب آیا کہ آپ نے جو کچھ

کیا اچھا کیا، اب میں اپنے اس خط میں ایک رقعہ دریائے نیل کے نام بھیج رہا ہوں، تم اسے لے کر دریائے نیل میں ڈال دو۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس رقعہ کو نکال کر پڑھا تو اس میں یہ تحریر تھا: ''یہ خط ہے اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اہلِ مصر کے دریائے نیل کے نام، حمد وصلوٰۃ کے بعد! مقصد یہ ہے کہ اگر تو اپنی مرضی سے چل رہا ہے تب تو خیر نہ چل، اگر اللہ واحد وقہار تجھے جاری رکھتا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کر دے'' یہ رقعہ لے کر امیرِ لشکر نے دریائے نیل میں ڈال دیا، ابھی ایک رات بھی نہیں گزری تھی کہ دریائے نیل میں سولہ ہاتھ گہرا پانی چلنے لگا اور اسی وقت مصر کی خشک سالی، تر سالی اور گرانی، ارزانی سے بدل گئی اور خطہ کا خطہ سرسبز وشاداب ہوگیا اور دریا پوری روانی کے ساتھ بہنے لگا، اس کے بعد سے ہر سال جو انسانی جان قربان کی جاتی تھی وہ بھی بچ گئی اور مصر سے اس ناپاک رسم کا ہمیشہ کے لیے خاتم ہوگیا۔

[کتاب السنة للحافظ ابی القاسم]

اسی مضمون کی آیت یہ بھی ہے: ''فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ الخ'' یعنی انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کو دیکھے کہ ہم نے بارش اتاری اور زمین پھاڑ کر اناج اور پھل پیدا کیے، اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ کیا یہ لوگ اسے دیکھتے نہیں؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''الْجُرُز'' وہ زمین ہے جس پر بارش ناکافی برستی ہے، پھر نالوں اور نہروں کے پانی سے وہ سیراب ہوتی ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ زمین یمن میں ہے۔ حضرت حسنِ بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی بستیاں یمن اور شام میں واقع ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا قول ہے کہ یہ وہ زمین ہے جس میں پیداوار نہ ہو اور وہ غبار آلود ہو۔ اسی بات کو اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے: ''وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ'' یعنی ان کے لیے مردہ زمین بھی ایک نشانی ہے جسے ہم زندہ کرتے ہیں۔'' [تفسیر ابنِ کثیر ج ۴، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ، توحیدِ باری تعالیٰ اور حشر ونشر کی دلیل ہے، کیا یہ لوگ مشاہدہ نہیں کرتے کہ ہم بے آب وگیاہ زمین پر بارش برسا کر اس میں

لہلہاتے کھیت پیدا کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کے اور ان کے مویشیوں کے لیے روزی مہیا کرتے ہیں، بارش برسانا اور کھیتیاں اُگانا جس خدائے قادر و قیوم کے اختیار و تصرف میں ہے وہی ساری کائنات کا کارساز ہے اور جو زمین سے انواع و اقسام نباتات پیدا کر سکتا ہے وہ مُردوں کو بھی دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

☆☆☆

(۴۸)

﴿حق و باطل کا امتیاز﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ٘ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ [فاطر:۸]

ترجمہ

''کیا ایسا شخص جس کو اس کا عملِ بد اچھا کر کے دکھلایا گیا ہو پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا ہو سو اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے، سو ان پر افسوس کر کے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے بلاشبہ اللہ کو ان کے سب کاموں کی خبر ہے''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ شیطان نے جس کی نگاہ میں برے کام کو بھلا کر دکھایا، کیا وہ شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا کے فضل و کرم سے بھلے برے کی تمیز رکھتا ہے، نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی سمجھتا ہے، جب دونوں برابر نہیں ہو سکتے تو انجام دونوں کا یکساں کیونکر ہو سکتا ہے اور یہ خیال نہ کرو کہ کوئی آدمی دیکھتی آنکھوں برائی کو بھلائی کیونکر سمجھ لے گا، اللہ تعالیٰ جس کو سوءِ اختیار اور سوءِ استعداد کی بناء پر بھٹکانا چاہے اس کی عقل اسی طرح اوندھی ہو جاتی ہے اور جس کو حسنِ استعداد اور حسنِ اختیار کی وجہ سے ہدایت پر لانا چاہے تب کسی شیطان کی طاقت نہیں جو اُسے غلط راستے پر ڈال سکے یا اُلٹی بات سجھا دے۔

بہر حال! جو شخص شیطانی اغواء سے برائی کو بھلائی اور بدی کو نیکی اور زہر کو تریاق

سمجھ لے کیا اس کے سیدھے راستہ پر آنے کی کچھ توقع ہو سکتی ہے؟ جب نہیں ہو سکتی اور سلسلہ ہدایت وضلالت کا سب اللہ کی مشیت وحکمت کے تابع ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان معاندین کے غم میں اپنے کو کیوں گھلاتے ہیں، اس حسرت میں یہ بدبخت اپنے فائدہ کی بات کو کیوں قبول نہیں کرتے، کیا آپ اپنی جان دے بیٹھیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا قصہ ایک طرف کیجیے، اللہ تعالیٰ ان کی سب کرتوت جانتا ہے، وہ خود ان کا بھگتان کر دے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دل گیر اور غمگین نہ ہوں۔[فوائد عثمانی ص ۵۶۴]

علامہ قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں رقمطراز ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو بے مدد چھوڑ دیا اس کا وہم، فہم پر اور جذباتِ نفسانی، عقل پر غالب آگئے ہوں اور فکر ورائے میں اختلال پیدا ہو گیا ہو، شیطان نے اس کا ذہن اغواء کر لیا ہو، وہ اچھے کو برا اور باطل کو حق سمجھنے لگا ہو، کیا ایسا آدمی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو شیطان فریب اور دھوکہ نہ دے سکا ہو، شیطان کو اس کے پاس آنے کا راستہ ہی نہ ملا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت یاب کر دیا ہو، وہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو، اچھے اعمال کو اچھا اور برے اعمال کو برا جانتا ہو۔

''فَاِنَّ اللّٰہ'' میں فَ عطف کے لیے ہے اور کچھ کلام محذوف ہے جس پر اس کا عطف ہے، محذوف کلام اس طرح تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ خیال نہ کریں کہ ہر شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہدایت کر سکیں گے اور جس کی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کی گئی ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی ہو، دونوں برابر ہو جائیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے: ''فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرٰتٍ'' اس آیتِ کریمہ میں لفظ ''حسرات'' ترکیب میں مفعول لہٗ ہے، مطلب یہ ہوگا کہ افسوس اور حسرت کرنے کی وجہ سے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان نہ جاتی رہے۔ حَسَرٰتٍ، حَسْرت کی جمع ہے۔ جمع کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا کہ گمراہ کافروں کے احوال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بکثرت افسوس ہوا کرتا تھا یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بداعمالیاں بہت کثرت سے تھیں جو حسرت و افسوس کی الگ الگ

متقاضی تھیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیتِ کریمہ، ابوجہل اور دیگر مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیتِ کریمہ کا نزول اس وقت ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُعا کی تھی کہ اے اللہ! اپنے دِین کو عمر بن خطاب یا ابوجہل بن ھشام (کے ایمان) سے غلبہ عطا فرما، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایمان کی توفیق عنایت فرمادی اور ابوجہل کو گمراہ چھوڑ دیا، ان ہی دونوں کے متعلق مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ، اہلِ بدعت اور پرستارانِ ہوا وہوس کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان ہی میں سے خارجیوں کا گروہ تھا جو مسلمانوں کا خون بہانا اور مال لوٹنا حلال سمجھتے تھے، دوسرے اہلِ کبائر ان میں شامل نہیں ہیں، کیونکہ وہ کبیرہ گناہوں کو حلال نہیں سمجھتے بلکہ ان کو کبیرہ گناہ ہی جانتے ہیں، اگرچہ عملاً کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

[تفسیر مظھری ج ۹، ص ۳۳۵ تا ص ۳۳۶]

جب آدمی ضد اور عناد میں آکر حق کا انکار کرتا ہے تو اس کا دل قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، اس کی فطرت ایسی مسخ ہو جاتی ہے کہ اسے اپنی تمام بد اعمالیاں نیکیاں دکھائی دیتی ہیں اور مشرکانہ اعمال کو برا سمجھنے کی بجائے اچھا سمجھنے لگتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ قہار کا اثر ہے، لہٰذا جو لوگ ضد و عناد سے حق کا انکار کریں ان کو توفیق ہدایت نصیب نہیں ہوتی، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: "وَ مَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ" [سورۃ البقرۃ] اور جو لوگ انابت اور رجوع کرتے ہیں اور سچے دل سے حق کے طالب ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے، اس لیے جو ضدی اور معاند لوگ گمراہی پر قائم ہیں اور راہِ راست پر نہیں آتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی وجہ سے اپنی جان کو غم و ایذاء میں نہ ڈالیں۔ "ذھاب" کے تین معنی ہیں، رفتن (جانا)، گزشتن (گزرنا) اور بردن (لے جانا)۔ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں، اول متعدی، یعنی نہ لے جائے تیرا نفس ان

کے پیچھے حسرتوں کو، اس صورت میں "حَسَرَاتٍ" ترکیب میں مفعول لہٗ ہوگا، دوئم لَا تَذْهَبْ، لا تغتم کے معنی میں ہے کہ غمناک نہ ہو جان آپ کی ان کے کفر کی وجہ سے درانحالیکہ آپ افسوس کرنے والے ہوں۔[تفسیرِ خازن ج ۵، ص ۲۴۴]

اس آیتِ کریمہ کا مفہوم دوسری جگہ اس طرح مذکور ہے: لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا" [سورة الكهف] اس کے بعد "اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ" یہ ماقبل عبارت کے لیے بمنزلہ علت ہے اور معاندین کے لیے اخروی عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

☆☆☆

(۴۹)

﴿حشر ونشر پر دلیلِ قدرت﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ﴾

[فاطر: ۹]

ترجمہ

’’اور اللہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پھر ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں، پھر ہم بادل کو مردہ قطعہء زمین کی طرف چلاتے ہیں، پھر اس سے مردہ زمین کو مرے پیچھے زندہ کر دیتے ہیں، اس طرح ہوگا مُردوں کا قبروں سے اٹھنا۔‘‘

تشریح

قرآنِ حکیم میں موت کے بعد کی زندگی پر عموماً خشک زمین کے سرسبز ہونے سے استدلال کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ الحج میں ہے، بندوں کے لیے اس میں کامل عبرت کا سامان اور مُردوں کے زندہ ہونے کی پوری دلیل موجود ہے کہ زمین بالکل سوکھی پڑی ہے، کوئی تر وتازگی اس میں دکھائی نہیں دیتی، لیکن بادل اٹھتے ہیں، پانی برستا ہے کہ اس کی خشکی، تازگی سے اور اس کی موت، زندگی سے بدل جاتی ہے، پہلے تو ایک تنکا بھی نظر نہ آتا تھا اب کوسوں دور تک ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے، اسی طرح انسانوں کے اجزاء قبروں میں بکھرے پڑے ہوں گے، ایک سے ایک الگ ہوگا، لیکن عرش کے نیچے سے پانی برستے ہی تمام اجسام، قبروں میں سے (گویا) اُگنے لگیں گے، جیسے زمین سے دانے اُگ آتے

ہیں۔ چنانچہ حدیثِ صحیح میں ہے کہ ابنِ آدم تمام کا تمام گل سڑ جاتا ہے لیکن ریڑھ کی ہڈی نہیں سڑتی، اسی سے پیدا کیا گیا ہے اور اس سے بنایا جائے گا۔" یہاں بھی نشانی بتا کر فرمایا کہ اسی طرح موت کے بعد کی زندگی ہے۔ سورۃ الحج کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ، مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ اور اس کی مخلوق میں اس کی کیا دلیل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابورزین! کیا تم اپنی بستی کے آس پاس کی زمین کے قریب سے اس حالت میں نہیں گزرے کہ وہ خشک بنجر پڑی ہوئی ہوتی ہے، پھر دوبارہ تم گزرتے ہو تو تم دیکھتے ہو کہ وہ سبزہ زار بنی ہوئی ہے اور تروتازگی اور شادابی کے ساتھ لہلہا رہی ہے"، ابورزین نے کہا کہ ہاں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایسا تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بس اسی طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کردے گا۔ [دیکھیے: تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۱۵ تا ۳۱۶]

قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس آیتِ کریمہ کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہواؤں کے ذریعہ سے بادلوں کو اُٹھا کر اور پھر پانی برسا کر اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح قیامت کے روز تم کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔" "فَتُثِيرُ سَحَابًا" یہ گزشتہ حال کی حکایت ہے، تاکہ وہ قدرت آگیں صورت جو اللہ کی حکمت پر دلالت کرتی ہے دماغوں میں مستحضر ہو جائے۔ "فَاَحْيَيْنَا بِهٖ" پھر بارش سے ہم نے زندہ کر دیا۔ "بِهٖ" کی ضمیر پانی کی طرف راجع ہے، کیونکہ سحاب سے بارش کا مفہوم سمجھا جاتا ہے یا لفظ سحاب کی طرف ضمیر راجع ہے، کیونکہ زمین کی زندگی کا سبب پانی ہے اور پانی کا سبب بادل ہے، زمین کو زندہ کرنے سے مراد ہے اسے سرسبز کر دینا اور زمین کی موت سے مراد ہے زمین پر خاک اڑنا اور ہریالی کا سوکھ جانا۔ "كَذٰلِكَ" یعنی جس طرح سبزی کے سوکھ جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح تمہاری دوبارہ زندگی ہوگی اور قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ کیونکہ دائرۂ قدرت سے دونوں میں سے کوئی بھی خارج نہیں ہے، سبزہ کی روئیدگی کا مادہ ضرور مختلف ہے لیکن مادہ کے اختلاف کو زندگی میں کوئی دخل نہیں ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں عطائے زندگی کی کیفیت میں تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں بعث بعد الموت کی کیفیت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے: ''پھر اللہ تعالیٰ ایک بارش شبنم کی طرح بھیجے گا جس کی وجہ سے اجسام اُگیں گے'' (الحدیث)

ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ''العظمة'' میں وھب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ''بَحرِ مَسْجُور'' (آتشیں سمندر) کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوگی اور اس کا آخر (کنارہ) اللہ کے ارادہ میں ہوگا، اس کے اندر مادۂ منویہ کی طرح گاڑھا پانی ہوگا جس کو راجفه اور رادفه (زمین کے دو زلزلوں) کے درمیان اللہ تعالیٰ برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اُگیں گے جس طرح سیلابی مٹی میں سبزہ اُگتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ مومنوں کی روح کو جنت سے لاکر اور کافروں کی روح کو دوزخ سے لاکر یکجا کرے گا، تاکہ ان کو صورتیں عطا فرمائے، چنانچہ اسرافیل علیہ السلام بحکمِ خداوندی (صور) پھونکیں گے جس سے ہر روح اپنے اپنے بدن اور جسم میں داخل ہو جائے گی۔'' (الحدیث)

شیخین (امام بخاریؒ و امام مسلمؒ) نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دونوں بار صور پھونکنے کے درمیان چالیس (کا فاصلہ) ہوگا، حاضرین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا چالیس دن کا فاصلہ ہوگا؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس سے انکار ہے، لوگوں نے کہا کہ تو کیا چالیس ماہ کا فاصلہ ہوگا؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس کو ماننے سے بھی انکار ہے، لوگوں نے کہا کہ تو کیا چالیس سال کا فاصلہ ہوگا؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں یہ بھی نہیں مانتا۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چالیس کا لفظ فرمایا تھا، تعیین نہیں فرمائی، اس لیے میں بھی کوئی تعیین نہیں کرسکتا) پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اُگیں گے جیسے سبزی اُگتی ہے، سوائے ایک ہڈی کے انسان کے

جسم کا ہر حصہ گل جاتا ہے وہ ہڈی دم گزے کی ہے، اس سے قیامت کے دن سارا جسم جوڑا جائے گا۔"

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت سلیمان رحمۃ اللہ علیہ بیان کیا ہے کہ قبروں سے اٹھائے جانے سے پہلے چالیس دن تک گاڑھے پانی کی بارش ہوگی۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں صوروں کے درمیان عرش کی جڑ سے پانی کی ایک وادی جاری ہو جائے گی، دونوں صوروں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا، اس پانی سے انسانوں، جانوروں اور پرندوں کا گلا ہوا جسم اُگ جائے گا، دنیا میں اگر ان کو کوئی پہچانتا ہوگا اور اس وقت وہ اس کے پاس سے گزرے گا تو فوراً اس کو پہچان لے گا، پھر روحوں کو جوڑا جائے گا اور وہ آ کر اپنے اپنے جسموں میں جڑ جائیں گی۔"

[تفسیر مظہری ج ۹، ص ۳۳۵ تا ۳۳۷]

☆☆☆

(۵۰)

﴿کافروں کی مشابہت اختیار کرنے کی ممانعت﴾

آیتِ کریمہ:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَ مَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ط وَاللّٰهُ يُحْيِي وَ يُمِيتُ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ [آل عمران: ۱۵۶]

ترجمہ

''اے ایمان والو! تم ان کی طرح نہ بنو جو منکر ہوئے اور اپنے بھائیوں کو کہتے ہیں کہ جب ملک میں سفر کو نکلیں یا ہوں جہاد میں کہ اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تا کہ اللہ اس سے ان کے دل میں افسوس ڈالے اور اللہؐ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کام دیکھتا ہے۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ ان آیات میں مسلمانوں کو اقوال واحوال میں کافروں کی مشابہت اور موافقت اختیار کرنے سے منع فرماتے ہیں، تاکہ کہیں کافروں اور منافقوں کی ایسی باتوں کے سننے سے اہلِ ایمان کے قدم نہ پھسل جائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم ان کافر منافقوں کی طرح ایسے لغو خیالات کو زنہارِ دل میں جگہ نہ دینا کہ گھر میں بیٹھے رہتے تو نہ موت آتی اور نہ مارے جاتے، چونکہ منافقین ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے تھے اس لیے

مسلمانوں کو اپنا بھائی کہا یا اس لیے کہ نسبی طور پر وہ انصارِ مدینہ برادری کے بھائی بند تھے اور چونکہ یہ بات خیر خواہی اور ہمدردی کے پیرایہ میں کہتے تھے اس لیے لفظِ اخوان سے تعبیر کیا گیا، منافقین کا یہ کہنا کہ مسلمان خواہ مخواہ باہر نکل کر مرے، ہمارے پاس اپنے گھر پڑے رہتے تو کیوں مرتے یا کیوں مارے جاتے، اس غرض سے تھا کہ سننے والے مسلمانوں کے دل میں حسرت وافسوس پیدا ہو کہ واقعی بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہوئے اور لڑائی کی آگ میں کود پڑنے کا یہ نتیجہ ہوا، گھر رہتے تو یہ مصیبت کیوں دیکھنی پڑتی، مگر مسلمان ایسے کچے نہ تھے جو ان چکموں میں آجاتے ان باتوں سے الٹا منافقین کا بھرم کھل گیا۔ بعض مفسرین نے "لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ" میں لامِ عاقبت لے کر یوں معنی کیے ہیں کہ منافقین کی زبان و دل پر یہ باتیں اس لیے جاری کی گئیں کہ خدا ان کو ہمیشہ اسی حسرت وافسوس کی آگ میں جلتا چھوڑ دے اور دوسری حسرت ان کو یہ رہی کہ مسلمان ہماری طرح نہ ہوئے اور ہماری باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا، گویا اس طرح، "لِيَجْعَلَ" کا تعلق "لَا تَكُوْنُوْا" سے بھی ہوسکتا ہے۔ (آگے فرمایا کہ) مارنا اور زندہ کرنا اللہ کا کام ہے، بہت سے لوگ عمر بھر سفر کرتے اور لڑائیوں میں جاتے ہیں مگر موت گھر پر بستر پر آتی ہے اور کتنے ہی آدمی گھر کے کونے میں پڑے رہنے کے خوگر ہیں، لیکن اخیر میں خدا کوئی سبب کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ باہر نکلیں اور وہیں مریں یا مارے جائیں، بندہ کی روک تھام سے یہ چیز ٹلنے اور بدلنے والی نہیں۔ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت فرمایا کہ میرے بدن پر ایک بالشت جگہ تلوار یا نیزہ کے زخم سے خالی نہیں مگر آج میں ایک اونٹ کی طرح (گھر میں) مر رہا ہوں۔

(آگے فرمایا کہ) اللہ تمہارے سب کام دیکھتا ہے کہ منافقین و کفار کس راستہ پر جا رہے ہیں اور مسلمان کہاں تک ان کی مشابہت اور پیروی سے علیحدہ رہتے ہیں، ہر ایک کو اس کی حالت کے مناسب جزا اور بدلہ دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے

منع فرمایا ہے کہ اخلاق و عادات اور لباس و معاشرت میں ان کی طرح نہ بنیں، اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں یہ نہیں فرمایا کہ تم کافر نہ بنو بلکہ یہ فرمایا کہ تم کافروں کے مشابہ نہ بنو۔ کافر ہونا اور چیز ہے اور کافروں کے مشابہ بننا اور چیز ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ "من تشبّہ بقوم فھو منھم" [رواہ ابوداود عن ابن عمرؓ و الطبرانی عن حذیفۃؓ] یعنی جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو وہ ان ہی میں سے شمار ہوگا۔ جیسے پاکستان کا کوئی فوجی، سپاہی، بھارت کے فوجی، سپاہی کی وردی پہن لے تو اگر مسلمان سپاہی اسے گولی مار دے تو جرم نہ ہوگا یا کوئی افسر سرکاری دفتر سے پاکستانی جھنڈا اتار کر اس پر بھارتی جھنڈا لہرا دے تو اسی وقت وہ معزولی کے قابل ہوگا اور اگر وہ افسر یہ تقریر کرنے لگے کہ میں نے صرف ایک کپڑے کا ٹکڑا اور لکڑی کا ایک ڈنڈا ہی تو بدلا ہے، اس میں کیا مضائقہ ہے، اس سے میرا پاکستانی حکومت کے مخالف ہونا کیسے ثابت ہوا تو کیا ارکانِ حکومت کے نزدیک اس افسر کی یہ تقریرِ دلپذیر اسے معزولی سے بچا سکے گی۔

اسی طرح سمجھو کہ احکم الحاکمین یہ حکم دیتا ہے کہ جن کو ہم نے قرآن میں مغضوب، ملعون اور گمراہ قرار دیا ہے، تم ان کی مشابہت اختیار نہ کرو، حیرت کا مقام ہے کہ مجازی اور فانی حکومت تو دشمن حکومت کی مشابہت بالاتفاق ممنوع اور قبیح ہو اور احکم الحاکمین کے دشمنوں سے مشابہت کا جب ذکر آئے تو اس کو تنگ نظری سمجھا جائے۔ بلکہ دشمنوں کے ساتھ مشابہت کی ممانعت اور قباحت کا مسئلہ تو کافروں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ بھارت کے کسی فوجی یا سپاہی کی مجال نہیں کہ وہ مسلمانوں والا لباس اختیار کرے، اسی طرح کسی یورپین حکومت کے افسر یا وزیر کی یہ مجال نہیں کہ وہ جبہ اور دستار پہن کر اجلاس کر سکے۔ نامعلوم ان مغرب زدہ ذہنیتوں کی غیرت کہاں گئی۔ خوب سمجھ لو کہ اپنے مذہبی اور قومی شعار اور امتیاز کو چھوڑ کر غیر قوم کے شعار اور امتیاز کو اختیار کرنا غیرت کے بھی خلاف ہے اور عملی طور پر اپنی کمتری اور دوسروں کی برتری کے اعتراف کے مترادف ہے۔ دنیا کا دستور ہے کہ ادنیٰ، اعلیٰ کی اتباع کو اپنے لیے فخر و اعزاز کی بات سمجھتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے

مذہبی اور قومی لباس کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ مذہب اور اہلِ مذہب سے ہی بیزار اور متنفر ہو جاتا ہے۔ یہ فرنگی کے ہمرنگ ہونے کی آخری منزل ہے، اس منزل پر پہنچ کر دین اور اہلِ دین سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ دعویٰ تو ہے اسلام کا اور دلدادہ ہیں مغربی تہذیب وتمدن کے۔

زاھدا تسبیح میں زنار کا ڈورا نہ ڈال
با برھمن کی طرف ہو یا مسلمان کی طرف

☆☆☆

(۵۱)

﴿مومن اور کافر کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ مَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ o وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ o وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ج وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ط اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ج وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ o اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ﴾

[فاطر: ۱۹-۲۳]

ترجمہ

''اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور نہ تاریکیاں اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ اور زندے اور مُردے برابر نہیں ہو سکتے، اللہ بلاشبہ جس کو چاہتا ہے اس کو سناتا ہے اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنانے والے جو قبروں میں مدفون ہیں، آپ تو محض ڈرانے والے ہیں۔''

تشریح

یہ مومن و کافر اور توحید و شرک کی تمثیلات ہیں، جس طرح اندھا، ظاہری روشنی سے محروم ہے اسی طرح کافر و مشرک نورِ ایمان و ہدایت سے محروم ہے، علیٰ ہذا جس طرح آنکھوں والا ظاہری بینائی رکھتا ہے اسی طرح مومن کا دل نورِ توحید سے روشن ہوتا ہے۔ ''الظلمات'' سے کفر و شرک کے اندھیرے اور ''النور'' سے ایمان و توحید کی روشنی، اور ''الظل'' سے ثواب یا جنت مراد ہے۔ ''الحرور'' شدتِ گرما، لیکن بقرینہ تقابل یہاں

دھوپ کے معنی میں ہے اوراس سے مراد عذاب یا جہنم ہے۔ [قرطبی، روح، خازن]

اور "احیاء" (زندے) سے مراد مومنین اور "اموات" (مردے) سے مراد کفار ہیں، دل کی زندگی اور موت، ایمان اور کفر ہے، اس لیے مومنوں کو زندوں سے اور کافروں کو مُردوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ضد اور عناد کی وجہ سے ان کافروں کے دلوں پر مہر ثبت ہو چکی ہے اور ان کے دلوں سے قبولِ حق کی صلاحیت اور استعداد سلب کر لی گئی ہے، اس لیے تبلیغ وانذار سے اُنہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: **کما لا تسمع من مات کذٰلک لاتسمع من مات قلبه**" یعنی جس طرح اس شخص کو جو مر گیا ہو آپ نہیں سنا سکتے اسی طرح جس کا دل مردہ ہو گیا ہو اس کو بھی نہیں سنا سکتے۔" [تفسیر قرطبی ج ۱۴، ص ۳۴۰]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم نے دینِ حق اور پیغامِ توحید دے کر اور بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، آپ کا کام پیغامِ حق پہنچانا ہے، ماننے والوں کو خوشخبری دینا اور منکرین کو عذاب سے ڈرانا ہے۔ ایمان کی روح کسی کے دل میں ڈال کر اس کو زندہ کرنا اور اس کو سنا دینا اور منوا لینا یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اگر یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرنے سے انکار کریں تو فکر وغم کی کوئی بات نہیں ہے۔ باقی احادیث مبارکہ میں مُردوں کو سلام اور کلام کا خطاب آیا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مُردے کی روح سنتی ہے اور قبر میں جو (جسم) پڑا ہوا ہے وہ اس کا دھڑ ہے وہ نہیں سنتا۔

ابتدائے کلام میں مومن اور کافر کو اندھا اور بینا کے ساتھ تشبیہ دی گئی، اور آیت کے اخیر میں زندہ اور مُردہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور یہ دوسری تشبیہ پہلی تشبیہ سے زیادہ بلیغ ہے، اس تمام کلام سے اصل مقصود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی اور تسکین دینا ہے کہ آپ کا کام کلامِ حق کو ان کے کانوں تک پہنچانا ہے باقی ان کے دلوں میں اتارنا، یہ ہمارا کام ہے۔

سورۂ نمل میں بھی اسی طرح کا ارشادِ عالی ہے: "**اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِھٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ ط اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ**" [النحل: ۸۰،۸۱]

یعنی اے نبی ﷺ! آپ ﷺ مُردوں کو نہیں سنا سکتے، مُردوں کو سنانا آپ ﷺ کی قدرت میں نہیں ہے اور اگر بالفرض یہ لوگ مُردہ بھی نہ ہوں تو بہرے تو ضرور ہیں۔ اور آپ بہروں کو بھی اپنی پکار نہیں سنا سکتے، بالخصوص جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں۔ بہرا سنتا تو نہیں مگر اشارہ سے سمجھ سکتا ہے لیکن جب وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے تو اشارہ سے بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو ان کے دلوں کے کان بہرے ہیں اس لیے ان کو سنانا مشکل ہے اور جب بہرا پکارنے والے کی طرف سے منہ بھی پھیر لے اور منہ کی بجائے اس کی طرف پشت کرے تو پھر اس کو سنانا بہت مشکل ہے، اس لیے کہ جب وہ اشارہ اور کنایہ کو بھی نہیں دیکھے گا تو سمجھے گا کس طرح؟! اور اگر بالفرض وہ پشت بھی نہ پھیریں تو تب بھی ان کو سمجھانا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے، اس لیے کہ یہ اندھے ہو چکے ہیں اور آپ ﷺ میں یہ قدرت اور طاقت نہیں کہ آپ ﷺ ان اندھوں کو راستہ دکھائیں اور وہ گمراہی سے باز آجائیں۔ کفر سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے، بینائی تو ایمان سے آتی ہے، لٰہذا آپ ﷺ صرف ان ہی لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں پھر وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار بن گئے ہیں۔ اور ایمان و اسلام لانے کی برکت سے وہ بینا، شنوا اور زندہ ہو گئے ہیں۔

خلاصہء کلام یہ کہ آپ ﷺ جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ بلاشبہ واضح حق ہے، لیکن اس کے قبول کے لیے چند شرائط ہیں، صرف حق کا واضح اور روشن ہونا کافی نہیں، جب تک کہ قبول کرنے والے میں شرائطِ قبول نہ پائی جائیں۔ مثلاً یہ کہ وہ زندہ ہو، مُردہ نہ ہو، بینا ہو، نابینا نہ ہو، شنوا ہو بہرا نہ ہو۔ ایمان کی برکت سے انسان زندہ ہو جاتا ہے اور اس کی دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

ان آیات سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا کہ مُردے نہیں سنتے، اس لیے کہ "مَوْتٰی" سے کفار مراد ہیں اور ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں مگر کفار کو "مَوْتٰی" کے ساتھ تشبیہ دینا اس وقت ہی درست ہو سکتا ہے کہ جب مُردے نہ سنتے ہوں، لیکن احادیثِ صحیحہ سے مُردوں کا سننا اور قبر پر حاضر ہونے والے کے سلام کو سننا ثابت ہے۔ لٰہذا جاننا

چاہیے کہ یہ آیت (اور اس قسم کی دیگر آیات) احادیث کے معارض نہیں ہے، اس لیے کہ آیت میں سماعِ موتی کی نفی نہیں کی گئی بلکہ اسماعِ موتٰی کی نفی کی گئی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! یہ کفار، مُردوں کی طرح ہیں اور عالمِ اسباب میں مُردوں کو سنانا انسانی قدرت وطاقت سے باہر ہے، اور باقی اللہ تعالیٰ اگر اپنی قدرت سے کسی مُردہ کو سنانا چاہیں، تو یہ ممکن ہے، جیسا کہ "وَ مَا اَنْتَ بِهَادِ الْعُمْيِ" کا معنی یہ ہے کہ ہدایت بمعنی توفیق نبی ﷺ کی قدرت اور اس کے اختیار سے باہر ہے، نیز جیسا کہ ایک اور جگہ آیا ہے، "اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ". نبی ﷺ کا کام صرف حق بات کا سنا دینا اور بتلا دینا ہوتا ہے۔ باقی حق کا دل میں اتار دینا، یہ اللہ جل جلالہ کا کام ہے، اسی طرح اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! یہ کفار، دل کے مُردہ ہیں، ان کو حق بات سنانا آپ ﷺ کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہے۔ نیز احادیثِ مبارکہ میں زیارتِ قبور کی تاکید اور مُردوں کو خطاب کے صیغہ "السلام علیکم" کے ساتھ سلام کرنے کا حکم آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مُردے بحکمِ الٰہی سنتے ہیں اور قبر پر حاضر ہونے والے کو اگر زندگی میں پہچانتے تھے تو مرنے کے بعد بھی پہچانتے ہیں۔ [دیکھیے: معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵، ص ۲۸۷ تا ص ۲۸۸]

☆☆☆

(۵۲)

﴿ہٹ دھرمی، ہدایت سے محرومی کا سبب ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ [یٰسٓ: ۸،۹]

ترجمہ

''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں، پھر وہ ٹھوڑیوں تک اڑ گئے ہیں سوان کے سر اوپر کو اچکے ہوئے ہیں اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ ان کے پیچھے سے پھر ہم نے ان کو (ہر طرف سے پردوں سے) گھیر دیا جس کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔''

تشریح

ان آیاتِ کریمہ میں اس بات کا سبب بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائیں گے، چنانچہ عالمِ اسباب میں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ضد اور عناد کی بناء پر توفیقِ خداوندی سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی کسی حکمت اور مصلحت سے ان بدبختوں کی گردنوں میں بڑے بھری طوق ڈال دیئے ہیں اور ایسے چمٹا دیئے ہیں کہ وہ ان کی گردنوں سے نہیں نکل سکیں گے، پس وہ طوق ان کی گردنوں سے لپٹ گئے ہیں اور ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں جو خوب اچھی طرح ان کی گردنوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہ ان میں بہت سخت جکڑے ہوئے ہیں، پس ان کی

کیفیت اور حالت یہ ہے کہ ان کے سر اوپر کو اُٹھ گئے ہیں، لہٰذا اب وہ اپنا سر نیچے نہیں جھکا سکتے اور ایسے سخت جکڑے ہوئے ہیں کہ اب وہ اپنا سر ہلا بھی نہیں سکتے، جیسے کسی جانور کو جب پانی یا چارہ دینا منظور نہیں ہوتا تو اس کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اور سر باندھ دیتے ہیں تاکہ وہ جانور نہ سر ہلا سکے اور نہ ہاتھ ہلا سکے، یہی حال ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کا ہے کہ جو عناد اور نفسانیت کے طوقوں میں ایسے جکڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ حق کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ ان آیات میں جو مثال ذکر کی گئی ہے وہ اس کافر کی ہے جس نے حق کو خوب پہچانا، پھر اس کو قبول کرنے کی بجائے اس کی عداوت اور دشمنی پر تُل گیا۔

(آگے فرمایا) اور علاوہ ازیں ہم نے ایک آڑ اور بڑی دیوار ان کے سامنے کھڑی کر دی ہے اور ایک آڑ اور بڑی دیوار ان کے پیچھے کھڑی کر دی ہے اور پھر اس کے علاوہ ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، تاکہ آنکھ، پس پردہ کی چیز کو نہ دیکھ سکے، لہٰذا ایسی حالت میں یہ لوگ حق کو نہیں دیکھ سکتے، یعنی جب آگے اور پیچھے سے دیوار حائل ہو اور اوپر سے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا تو پھر راستہ کیسے نظر آئے گا!۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ازلی شقاوت و بدبختی کی مثال بیان فرمائی ہے کہ فرض کرو کہ کسی کے گلے میں اتنا بڑا طوق ہے کہ وہ ٹھوڑیوں تک اس میں جکڑا ہوا ہے تو یقینی بات ہے کہ اس کا منہ اوپر کو اُٹھ جائے گا اور وہ اپنے پاؤں کے نیچے اور آس پاس کے راستہ کو بلکہ کسی چیز کو بھی دیکھ نہ سکے گا، مزید برآں یہ کہ جب آگے پیچھے بڑی بڑی دیواریں بھی کھڑی کر دی جائیں اور اوپر سے آنکھوں پر پردہ بھی ڈال دیا جائے تو پھر دور اور نزدیک کی کسی کے نظر آنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

کفار کی اس کیفیت و حالت کو بیان کرنے سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی و تسکین ہے کہ آپ ان کے ایمان لانے کی امید اور توقع نہ رکھیں، ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے، اپنی ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس حالت کو پہنچ چکے ہیں۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵ ص ۶۲۴]

علماء لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیتِ کریمہ "لَا یُبْصِرُوْنَ" تک ابوجہل کے بارے

میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ لوگ، ابوجہل سے کہتے تھے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجود ہیں اب تم جو کہتے تھے کر دکھاؤ، ابوجہل کہتا تھا کہ وہ کہاں ہیں، مجھے تو نظر نہیں آتے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ کا نزول، ابوجہل اور اس کے ایک مخزومی ساتھی کے بارے میں ہوا ہے، ابوجہل نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں نے جہاں بھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا، پتھر سے ان کا سر کچل دوں گا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالتِ نماز میں اس نے دیکھا اس کے پاس ہی پتھر بھی پڑا ہوا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر پر مارنے کے لیے پتھر اٹھانا چاہا تو فوراً ہاتھ گردن سے چمٹ گیا اور پتھر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، ابوجہل فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر آیا اور جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا اور بیان کرتے ہی گر پڑا، اس کا مخزومی ساتھی بولا: اب میں جا کر اسی پتھر سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کروں گا، چنانچہ پتھر مارنے کے لیے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب چلا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بھی نماز ادا کر رہے تھے، اللہ نے اس کو اندھا کر دیا، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز تو اس کو سنائی دیتی تھی مگر آنکھوں سے کچھ نہیں دِکھتا تھا، وہ بھی اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا لیکن ساتھیوں میں سے بھی وہ کسی کو نہ دیکھ سکا، لوگوں نے اس کو آواز دی اور کہا تو نے یہ کیا کیا؟ مخزومی نے کہا کہ مجھے تو وہ نظر ہی نہیں آئے، ہاں ان کی آواز میں نے ضرور سنی مگر میرے اور ان کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل تھی جیسے کوئی نر اونٹ ہو، جو (حملہ کرنے کے لیے) دُم ہلا رہا ہو، اگر میں ان کے قریب جاتا تو وہ اونٹ مجھے کھا جاتا۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ: اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا" نازل ہوئی۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "اغلال" سے بطورِ کنایہ ہاتھ مراد ہیں، اگرچہ ہاتھوں کا ذکر پہلے نہیں آیا، کیونکہ "غل" کا معنی ہے ہاتھوں کو گردن سے باندھ دینا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں کو گردن سے ملا کر ہم نے ٹھوڑیوں تک طوق کو کس دیا ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ قبیلہء بنی مخزوم کے کچھ لوگوں نے باہم مشورہ کر کے یہ بات طے کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر

دیں، ان مشورہ کرنے والوں میں ابوجہل اور ولید بن مغیرہ بھی شامل تھے، ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور یہ لوگ آپ کی قرأت کی آواز سن رہے تھے، ساتھیوں کے مشورہ کے مطابق ولید بن مغیرہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دینے کے ارادہ سے چل دیا، جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، وہاں تک پہنچ گیا، لیکن آواز سننے کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو نظر نہیں آئے، واپس آکر اپنے ساتھیوں کو یہ بات بتائی، یہ سنتے ہی دوسرے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے وہاں تک پہنچ گئے اور قرأت کی آواز بھی سنتے رہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظر نہ آئے، آواز کی طرف بڑھتے تھے تو آواز پیچھے سے آنے لگتی تھی پیچھے کی طرف آواز کی جانب آتے تھے تو آواز پیچھے سے آنے لگتی تھی، آخر ناکام لوٹ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملا، یہی مطلب ہے "وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ الخ" کا، کہ ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے اور ایک آڑ ان کے پیچھے سے کر دی، پھر ہم نے ان کو گھیر دیا جس وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔ "فَاَغْشَيْنٰهُمْ" کا معنی ہے کہ ہم نے ان کو اندھا کر دیا۔ "تغشية" کا معنی ہوتا ہے پردہ سے ڈھانک دینا۔

اہلِ معانی کہتے ہیں کہ یہ ایک تشبیہ ہے، حقیقت میں نہ طوق تھا اور نہ آڑ، بلکہ مطلب اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے چند موانع پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے محروم ہیں، موانع پیدا کرنے کو طوق اور آڑ پیدا کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان کو کفر پر اتنا پختہ کر دیا اور ان کے دلوں پر ایسی مُہر اور چھاپ لگ گئی کہ کوئی آیت اور نصیحت ان کے لیے سودمند نہیں ہوتی۔ پس ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کی گردن میں طوق ڈال دیا گیا ہو اور طوق ٹھوڑی تک پہنچ گیا ہو اور ایسا جکڑا ہوا ہو کہ وہ گردن نہ جھکا سکتا ہو اور سر اوپر کو اچکا ہوا ہو اور ان کافروں کی مثال اس طرح بھی ہے جیسے آنکھوں کے سامنے ہر طرف سے کوئی چیز حائل ہو جائے اور آدمی کو آڑ ہونے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے، کافروں کی بھی یہی حالت ہے کہ حق کی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتے، حق کی جانب گردن موڑ ہی نہیں سکتے، موانع کی وجہ سے سر جھکا کر حق کی تصویر دیکھ ہی نہیں سکتے، اگر

بالفرض سر جھکا کر تصویرِ حق دیکھنا بھی چاہیں تو نگاہ کے سامنے بندش کی دیوار حائل ہے، اوپر سے بھی پردہ ہے، اور آگے پیچھے سے بھی رکاوٹیں موجود ہیں، اس لیے راہِ ہدایت ان کو سوجھائی نہیں دے سکتی۔ یا مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو جسمانی دکھ پہنچانے کا ارادہ کیا ہم نے رسول اللہ ﷺ کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کو روک دیا، موانع کھڑے کر دیئے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں لیا جائے (یعنی جَعَلْنَا کو نَجْعَلُ کے معنی میں لیا جائے) یعنی قیامت کے روز جہنم کے اندر ہم ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے اور آگ کے صندوقوں میں بند کر دیں گے کہ ان کے ہر طرف آگ کی دیوار ہوگی۔ آئندہ ایسا ہونا چونکہ قطعی اور یقینی تھا اس لیے مستقبل کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ [دیکھئے: تفسیر مظہری ج ۹، ص ۳۵۸ تا ۳۵۹]

☆☆☆

(۵۳)

چاند، قدرت کی ایک نشانی

آیتِ کریمہ:

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یٰس: ۳۹، ۴۰]

ترجمہ

"اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کیں یہاں تک کہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔"

تشریح

اس آیت میں چاند کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ سورج کی طرح ایک حال پر نہیں رہتا بلکہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ چاند کی سیر اور رفتار کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کی ہیں جن کو وہ برابر طے کرتا رہتا ہے، چاند کی منازل اٹھائیس ہیں، ہر رات ایک منزل میں نزول کرتا ہے، نہ اس سے آگے بڑھتا ہے اور نہ اس سے پیچھے رہتا ہے۔ آغاز میں چاند کی روشنی شب بہ شب زیادہ ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ چودھویں رات میں اس کی روشنی مکمل ہو جاتی ہے، پھر اس میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر ماہ میں چاند، کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح باریک اور پتلا ہو جاتا ہے، ہر ماہ کے آخر میں اور ہر ماہ کے شروع میں چاند کمان کی طرح باریک ہو جاتا ہے، اخیر مہینہ میں جب چاند باریک اور پتلا ہو جاتا ہے تو دو راتوں کے لیے پوشیدہ ہو جاتا ہے، پھر شروع مہینہ میں ہلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، چاند کا اس طرح گھٹنا اور بڑھنا بھی اللہ کی قدرت کی نشانی

ہے۔

مقصد یہ ہے کہ سورج اور چاند دونوں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، ہر ایک کی رفتار اور طلوع وغروب کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک حد مقرر کر دی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے، لہٰذا نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور اس کی منزل میں نزول کر جائے اور اس کی حد میں داخل ہو جائے اور نہ چاند کی یہ مجال ہے کہ وہ سورج کو پکڑ لے، حالانکہ چاند تیز رفتار ہے اور سورج سست رفتار ہے، کیونکہ سورج سال بھر میں اپنی منزلیں طے کرتا ہے اور چاند ایک مہینہ میں اپنی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ دونوں کی رفتار اللہ تعالیٰ کی تسخیر اور تقدیر کے تابع ہے، دونوں کا ایک منزل میں جمع ہونا ناممکن اور محال ہے اور ایک کا دوسرے کے وقت میں ظہور اور طلوع ناممکن ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین کے جس خطہ میں طلوع وغروب کا جو نظام مقرر کر دیا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس میں تبدیلی کر سکے۔ اور نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ دن سے آگے نکل جائے یعنی یہ ممکن نہیں کہ دن پورا ہونے سے پہلے ہی رات آ جائے، دن اور رات دونوں اپنے مقررہ وقت سے پہلے نہیں آ سکتے۔ (آگے فرمایا) چاند اور سورج سب کے سب اپنے اپنے آسمان اور دائرہ میں تیرتے، گھومتے اور چلتے رہتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنے مدار سے باہر قدم رکھ سکے اور کسی سیارے سے جا ٹکرائے، سب ستارے اور چاند وسورج وغیرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتے رہتے ہیں جیسے مچھلیاں پانی میں تیرتی رہتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ چاند، سورج اور تمام سیارات، تسخیرِ خداوندی کے مطابق اپنے اپنے چرخے اور دائرہ میں تیرتے رہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے کوئی سیارہ دوسرے سیارہ سے مزاحم نہیں ہو سکتا۔

[دیکھیے: معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵ ص ۶۳۷، ۶۳۸]

عرب میں چاند کی روشنی کے اعتبار سے مہینہ کی راتوں کے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً پہلی تین راتوں کا نام "غرر" ہے، اس کے بعد کی تین راتوں کا نام "نفل" ہے، اس کے بعد کی تین راتوں کا نام "تسع" ہے، اس لیے کہ ان کی آخری رات نویں ہوتی ہے، اس کے بعد کی تین راتوں کا نام "عشر" ہے، اس لیے کہ اس کی ابتداء دسویں

رات سے ہوتی ہے، اس کے بعد کی تین راتوں کا نام "بیض" ہے، اس لیے کہ ان راتوں میں چاندنی آخر تک رہتی ہے، اس کے بعد کی تین راتوں کا نام ان کے ہاں "دُرع" ہے، یہ درعاء کی جمع ہے، اس نام کی وجہ یہ ہے کہ سولھویں کو چاند ذرا دیر سے طلوع ہوتا ہے، تو تھوڑی دیر تک اندھیرا یعنی سیاہی رہتی ہے، اور عرب میں اس بکری کو جس کا سر سیاہ ہو "شاۃٌ درعاءُ" کہتے ہیں، اس کے بعد کی تین راتوں کو "ظلم" کہتے ہیں، پھر اس کے بعد کی تین راتوں کو "ضاوس" پھر تین کو "دراری" اور اس کے بعد کی تین راتوں کو "محاق" کہتے ہیں کہ اس میں چاند ختم ہو جاتا ہے اور مہینہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

امام ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے "تسع" اور "عشر" کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب غریب المصنف۔ [تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۳۴۷]

قرآن کریم میں سورۂ یونس کی ابتداء میں بھی فرمایا گیا ہے: "هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ" یعنی وہی وہ ذات ہے جس نے سورج کو چمکیلا اور چاند کو روشن بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں اور دنوں) کے حساب پہچانو" سورۂ یونس کی اس آیت میں اور سورہ یٰس کی زیر تفسیر آیت میں "منازل القمر" سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے وہ مختلف احوال مراد ہیں جن سے وہ مہینوں کے مختلف دنوں میں گزرتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "وقدر القمر منازل فاول ما یبدؤ صغیرا ثم یتزاید نورہ و جرمہ الخ" یعنی اور چاند کی منزلیں مقرر کیں کہ پہلے وہ چھوٹا ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کا جسم اور روشنی بڑھتی رہتی ہے، حتیٰ کہ آخر بدرِ کامل بن جاتا ہے، پھر گھٹنا شروع ہوتا ہے، حتیٰ کہ آخر مہینہ میں اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ [ابن کثیر ج ۲، ص ۴۰۷]

مگر علامہ عبدہٗ اور بعض دیگر مفسرین نے اس سے چاند کی گردش کی وہ اٹھائیس منزلیں مراد لی ہیں جن میں سے ہر منزل میں وہ اپنے فلک کی گردش میں دورا کرتے ہوئے ہر روز گزرتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے۔ مہینہ کے باقی ماندہ ایک یا دو دن نظروں سے

اوجھل رہتا ہے، اہلِ عرب نے ان منزلوں کے نام ان ستاروں کے نام پر جو ان کے محاذات میں ہیں، یہ رکھے تھے: الشرطان، البطین، الثریّا، الدَّبَران، الهقعه، الهنعه، الذراع، النَّثره، الطّرف، الجبهة، الزّبْرَه، الصّرفَه، العَوَّاء، السِمَّاک، الاَعْزل، الغفُر، الزّبانی، الاکلیل، القَلْب، الشَّوْله، النعائم، البلدة، سَعْد الذّابح، سعد بُلع، سعد السعود، سَعْد الاخبیة، فرغ الدلو المقدم، فرغ الدلو المؤخر الرّشَاء۔ علامہ موصوف کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانہ میں اہلِ ہند اور اہلِ چین کی طرح اہل عرب بھی چاند کی مصطلحہ منازل سے اچھی طرح واقف تھے، بہر حال سورۂ یونس کی آیت میں سالوں اور مہینوں کی حساب فہمی میں ذریعہ، منازلِ قمر کو قرار دے کر ان منازل کی تقدیر و تعیین کو اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم قرار دیا گیا ہے، یوں تو دورۂ شمسی اور دورۂ قمر دونوں ہی سے مہینوں اور سالوں کا حساب لگایا جاسکتا ہے، مگر حسابِ شمسی ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا سمجھنا بغیر تعلیم و تعلم کے ممکن نہیں اور حساب قمری ایک سیدھا سادا حساب ہے جسے علوم وفنون سے بے بہرہ لوگ بھی صرف مشاہدہ سے جان سکتے ہیں اور اپنی اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں میں اس سے مدد لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اسلام کے احکام جو شہری و دیہاتی، متمدن و غیر متمدن ساری دنیا کے لیے ہیں۔ حساب قمری پر مبنی قرار دیئے گئے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے اس آیت میں محل احسان منازل قمر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔[قاموس القرآن ص ۵۵۱ تا ۵۵۲]

سوال:

اللہ تعالیٰ نے سورج کے متعلق فرمایا کہ وہ چاند کو نہیں پاسکتا، چاند کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ وہ سورج کو نہیں پاسکتا، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کی رفتار تیز ہے، وہ اپنا ایک چکر مہینہ میں مکمل کر لیتا ہے، جب کہ سورج اپنا ایک چکر سال میں مکمل کرتا ہے، لہٰذا سورج کی نفی کر دی گئی، کیونکہ

اس کی رفتار سست ہے لہٰذا اس کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ چاند کو نہیں پا سکتا، یہ جواب امام زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے، لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کی رفتار چونکہ تیز ہے اس لیے مناسب یہی تھا کہ اس کی نفی کی جاتی، سورج کی رفتار تو چاند سے کم ہے، لہٰذا اس کا تو چاند کو پالینا ممکن ہی نہیں ہے، احتمال یہی تھا کہ چاند، سورج کو پالیتا اس لیے مناسب یہی تھا کہ چاند کے پانے کی نفی کی جاتی۔ [نکات القرآن ص ۳۲۵]

☆☆☆

(۵۴)

﴿حق و باطل کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ o قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ﴾

[الزمر: ۲۷، ۲۸]

ترجمہ

''اور ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین بیان کیے ہیں تا کہ لوگ نصیحت پکڑیں، عربی قرآن نازل کیا جس میں ذرا بھی کجی نہیں تا کہ لوگ ڈریں۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا نہ سمجھنا اپنی غفلت اور حماقت کی وجہ سے ہے، قرآن کے سمجھانے میں کوئی کمی نہیں، قرآن تو بات بات کو مثالوں اور دلیلوں سے سمجھاتا ہے، تا کہ لوگ ان میں غور و فکر کریں اور اپنی عاقبت کو سنواریں، قرآن ایک صاف عربی زبان کی کتاب ہے جو اس کے مخاطبین اولین کی مادری زبان تھی، اس میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں ہے، سیدھی اور صاف باتیں ہیں جن کو عقلِ سلیم قبول کرتی ہے، کسی طرح کا خلل اس کے مضامین یا عبارت میں نہیں ہے، جن باتوں کو منوانا چاہتا ہے نہ ان باتوں کا ماننا مشکل ہے اور جن چیزوں پر عمل کرانا چاہتا ہے نہ ان پر عمل کرنا محال ہے۔ غرض یہ ہے کہ لوگ بہ سہولت اس سے مستفید ہوں، اعتقادی اور عملی غلطیوں سے بچ کر چلیں اور صاف صاف نصیحتیں سن کر اللہ سے ڈرتے رہیں۔ [فوائد عثمانی ص ۵۹۸]

یہ آیتِ کریمہ آئندہ کی تمثیل کے لیے تمہید ہے، اس میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں ہر نوع کی مثالیں بیان کی ہیں جن کی موقع ومحل کے مطابق ضرورت تھی تاکہ لوگ خوب سمجھیں اور نصیحت حاصل کریں جیسا کہ مومن اور مشرک کی ایک مثال آگے آرہی ہے اور یہ قرآن خالص عربی زبان میں ہے، فصاحت و بلاغت، مضامین کی سنجیدگی، دلائل کی پختگی، واقعات کی صحت اور دیگر ہر پہلو سے وہ کامل و مکمل ہے، اس میں کسی قسم کی کمی، کجی اور کوتاہی نہیں ہے، یہ بلندِ پایہ کتاب اس لیے نازل کی گئی تاکہ لوگ اس کی تعلیمات کو تسلیم کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے احتراز کریں۔

"مِنْ كُلِّ مَثَلٍ" کا معنی ہے ہر طرح کا عمدہ مضمون جو دینی امور پر غور کرنے والوں کے لیے ضروری ہے، اور "غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ" کا معنی ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلال نہیں ہے، مستقیم کی بہ نسبت غیر ذی عوج کا لفظ زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ یہ ہر قسم کی کجی کی نفی کر رہا ہے اور معانی میں اختلال نہ ہونے کے لیے یہ لفظ مخصوص ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف بیان نہیں۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی اشتباہ اور شک وشبہ نہیں۔

امام سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ مخلوق نہیں (کیونکہ اختلال و اختلاف اور اشتباہ و شک تو مخلوق کے کلام میں ہوتا ہے اور یہ مخلوق ہی نہیں ہے)۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی اس لفظ کی تفسیر میں یہی منقول ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے ستر تابعین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن نہ خالق ہے نہ مخلوق۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی صفت (کلامیہ) ہے، عینِ ذاتِ خداوندی نہیں کہ خالق ہو جائے اور غیر ذات بھی نہیں کہ ذات سے جدا ہو اور حادث و مخلوق ہو جائے۔ یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تابعین کے نزدیک اللہ کا کلام لفظی بھی قدیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، کیونکہ کلامِ نفسی عربی نہیں ہوسکتا، کیونکہ عربی اور عجمی ہونا تو الفاظ کی صفت ہے، الفاظ کے معانی تو نہ عربی ہوتے ہیں نہ عجمی۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کلام لفظی میں ایک حرف کے بعد دوسرا حرف بولا

جاتا ہے (اور اس طرح پورا کلام بن جاتا ہے) اور ترتیب حروف حادث ہونے کی علامت ہے، کیونکہ یہ ترتیب حروف تو مخلوق کے کلام کے لیے ضروری ہے، محلِ کلام تنگ ہے اس لیے ایک حرف کے بعد دوسرا حرف آتا ہے اور پورا کلام حادث ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کلام تو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، اس کے کلام میں تعاقبِ حروف کا تصور بھی غلط ہے، یہ تو ایسا ہے جیسے حاضر پر غائب کو قیاس کرلیا جائے۔ رؤیتِ الٰہی کا انکار کرنے والے اسی وہم میں مبتلا ہو گئے کہ انہوں نے دیدارِ مخلوق پر دیدارِ خالق کو قیاس کرلیا، مخلوق کو دیکھنے کے لیے تو رخ اور مسافت وغیرہ ضروری ہے لیکن خالق کا دیدار ان سب چیزوں سے پاک ہے۔ اس کی مثل کوئی چیز نہیں، نہ اس کی ذات میں اس کا کوئی مماثل ہے، نہ کسی صفت میں، شانِ اعلیٰ اسی کی ہے۔[تفسیر مظہری ج ۱۰، ص ۱۱۱، ۱۱۲]

☆☆☆

(۵۵)

﴿مومن اور مشرک کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشَاكِسُوْنَ وَ رَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلاً ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۲۹]

ترجمہ

''اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ ایک شخص (غلام) ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضدا ضدی بھی ہے اور ایک اور شخص (غلام) ہے جو (صرف) ایک ہی شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہوسکتی ہے، الحمد للہ (قبول تو کرلیا) بلکہ ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں۔''

تشریح

اس آیت میں مومن و مشرک کے فرق کو ایک حسّی مثال میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ ہر شخص ایمان و کفر اور توحید و شرک کی حقیقت کو بخوبی سمجھ سکے اور یہ کہ شرک اور نافرمانی کا انجام کیسا برا ہوتا ہے، معلوم ہوجائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال موحد اور مشرک کی بیان کی ہے کہ ایک شخص ہے غلام جس میں متعدد شرکاء ہیں جو آپس میں کھینچا تانی اور مزاحمت کررہے ہیں، ہر مالک یہ چاہتا ہے کہ یہ میرا کام انجام دے جو دوسرے مالک کی مرضی اور مقصد کے خلاف ہے تو ظاہر ہے کہ اس طرح مشترک غلام میں اس کے سارے مالکان ضدا ضدی کریں گے اور ہر ایک اپنی خدمت کے لیے

اس کو کھینچے گا جس کا انجام ظاہر ہے کہ وہ کسی کی بھی اطاعت نہ کر سکے گا اور اس کے آقاؤں میں سے کوئی بھی اس سے راضی نہ ہو سکے گا اور اس کے برعکس دوسرا شخص وہ غلام ہے جو پورے طور پر ایک ہی کے لیے ہے اور صرف ایک ہی کا غلام ہے جو پوری طرح اپنے آقا کی اطاعت بجا لا سکتا ہے اور اس کا آقا اس کی فرمانبرداری کی وجہ سے اس سے راضی بھی ہو سکتا ہے تو کیا یہ دونوں اپنی حالت کے لحاظ سے برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ پہلا غلام متحیر اور بدحواس رہے گا کہ کس کی مانوں اور کس کی نہ مانوں اور نہ ہی اس کا کوئی آقا تحیر کے بعد اس سے راضی ہوگا اور اس کے برعکس دوسرا غلام بڑے اطمینان وسکون سے اپنے آقا کی فرماں برداری میں لگا رہے گا، اس کا آقا اس سے راضی اور خوش ہوگا، انعامات سے ہی نوازے گا اور اپنے غلام کی حاجت وضرورت بھی پوری کرتا رہے گا، یہ دیکھ کر یہ تو بس میرا ہی ہے، میں اس کی حاجت پوری نہ کروں تو پھر کون کرے گا؟ اور اس کا کوئی آقا میرے سوا بھی نہیں ہے تو یہ کس کے در پہ جائے گا، الحمد للہ حق واضح ہو گیا اور ثابت بھی ہو گیا، مگر افسوس، پھر بھی یہ لوگ حق کو قبول نہیں کرتے، قبول تو کیا کرتے بلکہ اکثر تو ان میں سے یہ باتیں جانتے ہی نہیں۔ جاننا تو درکنار سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ وہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، بہر حال یہ ایک فیصلہ ہے جس میں کسی کو سرتابی کی مجال نہیں ہو سکتی۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ایک غلام جو کئی ایک کا غلام ہو، کوئی اس کو اپنا نہ سمجھے تو اس کی پوری خبر نہ لے اور ایک غلام جو سارا ایک کا ہو وہ اس کو اپنا سمجھے اور پوری خبر لے، یہ مثال ہے ان کی جو ایک رب کے بندے ہیں اور جو کئی رب کے بندے ہیں۔'' [موضح القرآن]

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لفظ ''مُتَشَاكِسُوْنَ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: یعنی کئی حصہ دار ایک غلام یا نوکر میں شریک ہوں اور ہر حصہ دار اتفاق سے کج خلق اور بے مروت اور سخت ضدی واقع ہوا ہو، چاہتا ہو کہ یہ غلام دوسرے سے سروکار نہ رکھے تو اس کھینچ تان میں ظاہر ہے کہ غلام سخت پریشان اور پراگندہ دل ہوگا،

برخلاف اس کے کہ جو غلام پورا ایک کا ہو تو اسے ایک طرح کی یکسوئی اور طمانیت حاصل ہوگی۔ اور کئی آقاؤں کو خوش رکھنے کی کشمکش میں گرفتار نہ ہوگا، اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں غلام برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح موحد و مشرک کو سمجھ لو، مشرک کا دل کئی طرف بٹا ہوا ہے اور کتنے ہی جھوٹے معبودوں کو خوش رکھنے کی فکر میں رہتا ہے، اس کے برخلاف موحد کی کل توجہات و خیالات اور داد و دہش کا (صرف) ایک مرکز ہے اور وہ پوری دل جمعی کے ساتھ اس کو خوش رکھنے کی فکر میں ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی خوشنودی کے بعد کسی اور کی خوشنودی کی ضرورت نہیں۔ [فوائد عثمانی ص ۵۹۸]

☆☆☆

(۵۶)

﴿بے ضرورت آواز بلند کرنا، گدھے کے مشابہ ہے﴾

آیت کریمہ:

﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ ط اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ﴾ [لقمان: ۱۹]

ترجمہ

''اور اپنی چال درمیانی رکھو اور اپنی آواز نیچی رکھو، بلاشبہ بڑی ناگوار آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔''

تشریح

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹے! تواضع، متانت اور میانہ روی کی چال اختیار کر، بے ضرورت مت بول، کلام کرتے وقت حد سے زیادہ نہ چلا، اگر اونچی آواز سے بولنا ہی کوئی کمال ہوتا تو گدھے کی آواز پر خیال کرو، وہ بہت زور سے آواز نکالتا ہے، مگر کس قدر کریہہ اور کرخت ہوتی ہے، بہت زور سے بولنے میں بسا اوقات آدمی کی آواز بھی ایسی ہی بے ڈھنگی اور بے سُری ہو جاتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیوانات میں گدھے کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ہر حیوان کی آواز (درحقیقت) اللہ کی تسبیح ہے، مگر گدھے کی آواز شیطان کے دیکھنے کے سبب سے ہوتی ہے، اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ جب گدھے کی آواز سنو تو **اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم** پڑھو یا اس لیے کہ گدھے نے شیطان کو دیکھا ہے (اس لیے چیخ رہا ہے)۔ بعض بزرگانِ دین یہ کہتے ہیں کہ گدھے کا چیخنا اور چلانا، گھاس اور پانی کے لیے ہوتا ہے یا شہوت جھاڑنے کے لیے ہوتا ہے، یا دوسرے گدھے سے

لڑنے کے لیے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو آواز بہیمیت اور سبعیت (درندگی) کی وجہ سے پیدا ہوگی وہ سب آوازوں سے بدتر ہوگی، یہی وجہ ہے کہ حدیث میں گدھے کے نماز کے سامنے سے گزرنے کو قاطعِ صلوٰۃ قرار دیا گیا ہے۔ نیز قرآنِ مجید میں دوزخیوں کے چیخنے اور چلانے کے متعلق یہ آیا ہے: "لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّ شَهِيقٌ". زفیر اور شہیق لغت میں گدھے کی باریک آواز اور بلند آواز کو کہتے ہیں۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵، ص ۴۳۰، فوائد عثمانی ص ۵۳۵]

سوال:

اس آیتِ مبارکہ میں اصوات کو جمع اور حمیر کو واحد کیوں ذکر کیا گیا ہے؟

جواب:

اس سے اس جنس کے ہر ہر فرد کا ذکر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ حیوان ناطق وغیرہ ہر جنس کی ایک آواز ہے اور ان اجناس میں سے سب سے بری آواز گدھے کی جنس کی ہے، لہٰذا اسے مفرد ذکر کرنا ضروری تھا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ اس میں گدھوں کا جمع ہونا شرط ہے۔

☆☆☆

(۵۷)

﴿حورانِ جنّت کی صفات﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ عِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِیۡنٌ o كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ﴾ [الصافات: ۴۸، ۴۹]

ترجمہ

''اوران کے پاس نیچی نگاہوں والی بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی، گویا کہ وہ چھپائے ہوئے انڈے ہیں۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ سامانِ خوردونوش کے علاوہ جنت میں جنسی جذبات کی تسکین کا سامان بھی موجود ہوگا، اہلِ جنت کو جنت میں جو بیویاں (حوریں) ملیں گی وہ اپنی نگاہیں اپنے خاوندوں پر ہی مرکوز رکھیں گی، ان خاوندوں کو ایسا حسن و جمال عطا ہوگا کہ حوریں ان میں محو ہوں گی، اوران کے سوا کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں گی، یہ ان کی عفت اور پاکدامنی کی علامت ہے۔[جامع البیان ص ۳۸۴]

''عِیۡنٌ'' یہ عَیۡنَاء کی جمع ہے یعنی موٹی آنکھوں والی، موٹی آنکھیں حسن و جمال کی علامت ہیں۔ اس لیے بعض مفسرین نے اس کا معنی ہی خوبصورت آنکھوں والی کیا ہے۔[قاله السدی و مجاهد. قرطبی ج ۱۵، ص ۸۰]

''كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ'' میں حورانِ جنت کے رنگ و روپ کا ذکر ہے۔

''بَيۡضٌ'' بیضة کی جمع ہے اوراس سے شتر مرغ کا انڈہ مراد ہے جس کا رنگ سفید زردی مائل ہوتا ہے، مادہ شتر مرغ اپنے انڈوں کو بال و پَر سے ڈھانک کر رکھتی ہے، تاکہ وہ گردو

غبار سے محفوظ رہیں، حورانِ جنت کا رنگ بیضِ نعام (شتر مرغ) کی مانند سفید زردی مائل ہوگا اوران کے چہروں کا رنگ نکھرا ہوا صاف شفاف ہوگا، عورتوں کا یہی رنگ مرغوب اور پسندیدہ شمار ہوتا ہے۔[دیکھئے بیضاوی، روح المعانی ج ۲۳، ص ۸۹]

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "عِینٌ" موٹی آنکھوں والیاں جن کی پلکیں (آنکھوں کو چھپالیں گی اس طرح) جیسے گدھ کے پَر" (یعنی حوروں کی آنکھیں غلافی ہوں گی) یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان اسی آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ حوروں کی کھال اتنی باریک ہوگی جیسے انڈے کے بیرونی چھلکے کے اندر چمٹا ہوا ایک باریک غلاف ہوتا ہے۔

تاریخ وتفسیر کے امام حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"جنتیوں کے پاس نیچی نگاہوں والی، شرمیلی نظروں والی، پاک دامن حوریں ہوں گی جن کی نگاہ اپنے خاوندوں کے چہروں کے سوا کسی اور کے چہرے پر نہیں پڑے گی، بڑی بڑی موٹی موٹی رسیلی آنکھیں ہیں، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں چیزیں ان میں موجود ہیں، جس طرح زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام میں یہ دونوں صفات دیکھیں، عورتوں نے جب انہیں طعنے دینا شروع کیے تو ایک دن سب کو بلا کر بٹھایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بناؤ سنگھار کرا کر بلوایا، عورتوں کی نگاہیں ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر خیرہ ہوگئیں اوران کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ یہ تو فرشتہ ہے، اسی طرح یہ حوریں میں حسنِ ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی بھی اپنے اندر رکھتی ہیں، پھران کا مزید حسن بیان فرمایا کہ ان کا گورا گورا بدن اور بھبوکا سا رنگ ایسا چمکدار، دلکش اور جاذبِ نظر ہے کہ جیسے محفوظ کیا ہوا موتی، جس تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچا ہو، جو سیپ سے نہ نکلا ہو جسے زمانہ کی ہوا نہ لگی ہو، جو اپنی آبداری میں بے مثال ہو، ان کے جسم بھی ایسے ہی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ گویا وہ انڈے کی طرح ہیں، انڈے کے اوپر کے چھلکے کے نیچے باریک چھلکے جیسے ان کے بدن ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دریافت کرنے پر آنحضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حورعین سے مراد بڑی آنکھوں والی سیاہ پلکوں والی حوریں ہیں، پھر عرض کیا گیا کہ "بَیْضٌ مَّکْنُوْن" سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انڈے کے اندر کی سفید جھلی کی طرح۔"

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلے میں اٹھایا جاؤں گا اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے تو میں ان کا خطیب ہوں گا اور جب وہ غمگین ہو رہے ہوں گے تو میں انہیں خوشخبریاں سناؤں گا، اور ان کا سفارشی ہوں گا جب کہ وہ رو کے ہوئے ہوں گے، حمد کا جھنڈا اس دن میرے ہاتھ ہوگا۔ اولادِ آدم میں سب سے زیادہ اللہ کے ہاں اکرام و عزت والا میں ہوں گا، یہ میں فخر کے طور پر نہیں کہتا، میرے آگے پیچھے ایک ہزار خادم گھوم رہے ہوں گے جو چھپے ہوئے انڈوں کے مثل چھپے ہوئے موتیوں کی طرح ہوں گے۔" [تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۳۶۷ تا ۳۶۸]

تعارض:

سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت: "کَاَنَّھُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ" اور سورۃ الرحمٰن کی آیت: "کَاَنَّھُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ" کے درمیان بظاہر تعارض ہے۔ آیتِ اولیٰ میں جنت کی حوروں کو رنگت اور صفائی نیز شفافیت میں چھپے ہوئے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح انڈوں کا رنگ سفید مائل بزردی و چمکدار اور پرندے کے پروں میں چھپے ہوئے ہونے کی وجہ سے صاف شفاف ہوتا ہے کہ نہ تو گرد و غبار ان تک پہنچتا ہے اور نہ کسی کا ہاتھ ان پر لگتا ہے جس سے کچھ میلا پن آجائے، ایسے ہی جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی چمکدار اور صاف و شفاف ہے، بہت زیادہ خالص سفید رنگ جیسا کہ دودھ یا چونے کا رنگ ہوتا ہے مرغوب اور جاذبِ نظر نہیں ہوتا بلکہ سفید رنگ کے ساتھ ہلکے زرد رنگ کی ملاوٹ والا رنگ عورتوں میں بڑا مرغوب اور پسندیدہ نظر ہوتا ہے۔ بہر حال اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی ہے اور آیت ثانیہ میں

حوروں کو یاقوت اور مرجان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یاقوت سرخ رنگ کا قیمتی موتی ہوتا ہے اور مرجان سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے موتیوں کو کہا جاتا ہے۔ یاقوت و مرجان دونوں کے ساتھ تشبیہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوروں کا رنگ سرخ وسفید ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں حوروں کا رنگ سفید و زرد اور دوسری آیت میں سرخ وسفید بتایا گیا ہے؟

دفعِ تعارض:

اس تعارض کے پانچ جوابات ہیں:

(۱) آیتِ اولیٰ میں انڈوں کے ساتھ تشبیہ رنگ میں نہیں ہے بلکہ نعومت وطراوت یعنی ملائم اور تروتازہ ہونے میں ہے اور انڈے سے مراد پکایا ہوا اور ابالا ہوا انڈا ہے، اُبالے جانے کے بعد چھلکے کے اندر جو چھپا ہوا انڈہ ہوتا ہے وہ بڑا نرم و نازک، ملائم اور تروتازہ ہوتا ہے جس کا مشاہدہ چھلکا اُتارنے کے بعد ہوتا ہے، اسی لیے عوام الناس عورت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ فلاں عورت تو چھلے ہوئے انڈے کی مانند ہے، ایسے ہی جنت کی حوروں کے ابدان و اجسام نہایت ہی نرم و نازک، ملائم اور شاداب ہوں گے۔ اس کی تائید حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہوتی ہے: ”**عن ابن عباسؓ قال ان البيض المكنون ما تحت القشر الصلب بينه و بين اللباب الاصفر**“ کہ بیضِ مکنون سے مراد انڈے کا وہ حصہ ہے جو سخت چھلکے کے نیچے اور زردی کے درمیان ہے۔ اب کوئی تعارض نہیں، کیونکہ آیتِ اولیٰ میں تشبیہ نعومت وطروات میں ہے نہ کہ رنگت میں اور آیتِ ثانیہ میں تشبیہ رنگت میں ہے، جس سے معلوم ہوا کہ حوریں جسم اور بدن کے اعتبار سے تو نہایت نرم و نازک اور تروتازہ اور شاداب ہوں گی اور رنگ کے اعتبار سے سفید مائل بہ سرخی ہوں گی یعنی گلابی رنگ ہوگا، عورتوں میں گلابی رنگ بھی بڑا مرغوب اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ [رواه ابن المنذر عن ابن عباس و ابن ابی حاتم و ابن جریر عن الامام

السدی، روح المعانی ج ۲۳، ص ۹۰]

(۲) پہلی آیت میں انڈوں کے ساتھ تشبیہ تناسبِ اعضاء میں ہے نہ کہ رنگت میں، انڈا تناسبِ اجزاء میں مشہور اور ضرب المثل ہے۔ تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انڈا متناسب الاجزاء ہوتا ہے اسی طرح جنت کی حوریں بھی متناسب الاعضاء ہیں، اور تناسبِ اعضاء نہایت مرغوب اور پسندیدہ چیز ہے، حتیٰ کہ حسن کا مدار ہی تناسبِ اعضاء پر ہے، پس جب آیتِ اولیٰ میں تشبیہ رنگت کے اعتبار سے ہے ہی نہیں تو اس کا دوسری آیت سے کوئی تعارض نہ ہوگا، کیونکہ دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حوروں کا جسم متناسب الاعضاء اور رنگ سفید مائل بسرخی ہے۔ مگر تناسبِ اعضاء والی اس تشبیہ کی صورت میں "مکنون" کی قید بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہے، اس قید کو تشبیہ میں کوئی دخل نہیں رہتا، کیونکہ انڈا ہر حال میں متناسب الاجزاء ہوتا ہے خواہ مکنون ہو یا غیر مکنون، اس لیے یہ توجیہ کمزور معلوم ہوتی ہے۔ [روح المعانی ج ۲۳، ص ۹۰]

(۳) یا یوں کہا جائے کہ آیتِ ثانیہ میں یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ رنگت میں نہیں ہے بلکہ یاقوت کے ساتھ تو تشبیہ صفائی کے اعتبار سے ہے اور مرجان کے ساتھ چکناہٹ اور خوبصورتی کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح یاقوت موتی صاف وشفاف اور مرجان موتی چکنا اور خوبصورت ہوتا ہے اسی طرح جنت کی حوریں صاف وشفاف چکنی اور خوبصورت ہیں، پس کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ آیتِ اولیٰ میں تشبیہ بیض مکنون کے ساتھ رنگت میں ہوئی اور دوسری آیت میں یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ صفائی و شفافیت اور ملاسَت و جمال میں ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ جنت کی حوریں سفید مائل بزردی صاف و شفاف چکنی اور خوبصورت ہیں۔ [روح المعانی ج ۲۳ ص ۹۰]

(۴) تشبیہ تو دونوں آیتوں میں رنگ ہی میں ہے مگر یہ اختلافِ اشخاص پر محمول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کہ بعض حوروں کا رنگ تو سفید مائل بزردی ہے ان کو بیضِ

مکنون کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور بعض کا رنگ سفید مائل بسرخی ہے ان کو یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور عورتوں کے دونوں قسم کے رنگ ہی مرغوب اور حسین شمار ہوتے ہیں، یہ کہنا کہ سب سے اچھا رنگ سفید مائل بزردی ہی ہوتا ہے، درست نہیں، کیونکہ احسنیت تو لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، کسی کو سفید مائل بزردی رنگ پسند ہوتا ہے اور کسی کو سفید مائل بسرخی۔ غرض کہ جنت میں اہلِ جنت کو ان کی پسند اور خواہش کے مطابق حوریں ملیں گی، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ" بہر حال جب دونوں آیتوں میں حوروں کا مصداق جُدا جُدا ہے تو تعارض نہیں ہے۔

[روح المعانی ج ۲۳، ص ۹۰]

(۵) یا یوں کہا جائے کہ چہروں کا رنگ تو یاقوت و مرجان کی طرح سفید مائل بسرخی یعنی گلابی ہے اور باقی بدن اور جسم کا رنگ بیضِ مکنون کی طرح سفید مائل بزردی ہے، پس دوسری آیت تو چہرے کی رنگت کے بیان پر محمول ہے اور پہلی آیت میں باقی بدن کی رنگت کا بیان ہے۔ فلا تعارض بینهما [روح المعانی ج ۲۳، ص ۹۰]

☆☆☆

(۵۸)

دوزخیوں کی مہمان نوازی

آیتِ کریمہ:

﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ o اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ o اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ o اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ o طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ o فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ o ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ o ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ﴾ [الصافات: ۶۱۔۶۸]

ترجمہ

''ایسے ہی (مقام یا راحت ونعمت) کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے، کیا یہ بہتر ہے یا زقوم کا درخت، ہم نے اس درخت کو کافروں کے لیے آزمائش بنایا ہے، وہ بلاشبہ ایک درخت ہوگا جو قعرِ جہنم سے برآمد ہوگا اس کے پھل ایسے ہوں گے جیسے شیاطین کے سر، سو دوزخی اس کو کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر ان کو کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا، پھر ان کی واپسی جہنم کی طرف ہوگی۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی ہی چیزوں کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے، اہلِ جنت کو مہمانی کے لحاظ جو نعمتیں اور راحتیں حاصل ہیں بھلا وہ بہتر ہیں یا زقوم کا

درخت، جس کو سینڈ کا درخت کہتے ہیں جو نہایت زہریلا، بدبودار اور بدشکل ہوتا ہے، ایسا زہریلا ہے کہ اگر جسم کو مَس ہو جائے تو جسم میں ورم ہو جاتا ہے اور انسان مر جاتا ہے۔ دوزخ کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک درخت اُگایا ہے جو دوزخ ہی کی آگ سے نشو ونما پا رہا ہے جو درحقیقت ظالموں اور کافروں کے لیے عذابِ جہنم کی ایک خاص مصیبت کے درجہ میں ان کے لیے رکھا گیا ہے، جب دوزخی بھوک میں مبتلا ہوں گے تو یہ کھانے کے لیے دیا جائے گا جس کی بدبو اور بدمزگی کی تلخی سے یہ ممکن نہ ہوگا کہ اس کو حلق سے نیچے اتارا جا سکے، یہ آزمائش اور عذاب ہے جس میں ان کو مبتلا کیا گیا۔

کفارِ مکہ نے جب یہ سنا تو مذاق اڑانے لگے اور اعتراض کرنے لگے کہ کوئی درخت آگ میں بھلا کیسے اُگ سکتا ہے؟ اور اس میں کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اس احمقانہ بات اور اعتراض کا جواب "فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ" سے دیا گیا ہے کہ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے ایک فتنہ بنا دیا ہے، تاکہ دیکھیں کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں؟ کافروں کو یقین نہیں آتا کہ آگ میں بھی درخت ہوسکتا ہے کہ جو ان کی مزید گمراہی کا سبب بن گیا، اس لیے کہ وہ ایسا درخت ہے جو جہنم کی جڑ سے اُگتا ہے، کافر یہ سن کر کہنے لگے کہ بھلا آگ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے؟ ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ آگ میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جس کا نام سمندر ہے اور آگ ہی میں وہ زندہ رہتا ہے اور آگ ہی سے وہ لذت حاصل کرتا ہے اور اس کی نشو ونما آگ سے ہی ہوتی ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ، آگ میں ایک جاندار کو پیدا کرسکتا ہے اور آگ ہی کو اس کی غذا اور خوراک بنا سکتا ہے تو کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ کافروں کے کھانے کے لیے، جو حیوانات کے مثل ہیں (اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ) بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں، آگ میں ایک درخت پیدا کر دے اور اس درخت کو آگ سے محفوظ رکھے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زقوم ایک خاص درخت ہے جس کی شاخیں تمام جہنم میں پھیلی ہوئی ہیں، جیسے طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں تمام جنت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس درخت کے خوشے خبیث اور بدشکل ہونے میں

شیطانوں کے سر کے مشابہ ہیں، شیطانوں کے سر سے اس لیے تشبیہ دی گئی کہ اگر چہ لوگوں نے شیطان کو دیکھا نہیں مگر عام طبیعتوں میں شیطانوں کے سروں کا بدشکل اور بدرنگ اور قبیح المنظر ہونا، راسخ اور جاگزیں ہے اور تشبیہ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ چیز نظر بھی آئے، صرف علم کافی ہے خواہ وہ حسّی ہو یا خیالی۔ جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ''مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ''. عرب کا محاورہ ہے کہ جب کسی کا حسن و جمال بے مثال ہو تو اس کو فرشتہ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور جو چیز بدشکل اور بدصورت ہوتی ہے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جیسے شیطان کا سر ہو۔

اردو زبان میں بھی ہر لمبی بات کے بارے میں کہتے ہیں کہ بات کیا ہے شیطان کی آنت ہے۔ کیا شیطان کی آنت بھلا کسی نے دیکھی ہے؟ غرض یہ کہ یہ تشبیہ، عرب کے محاورہ اور عرف و استعمال کے مطابق ہے۔ عرب و عجم میں یہ محاورہ ہے کہ جب کسی کی بدصورتی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیطان کی صورت ہے اور جب کسی کی خوبصورتی بیان کرنا ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ فرشتہ کی شکل ہے۔

(آگے فرمایا) کفار، جبری طور پر اس بدبودار اور بدمزہ درخت سے کھائیں گے اور ایسا نہ ہوگا کہ زبردستی کی وجہ سے اس میں سے کچھ چکھ کر پھر اسے چھوڑ دیں بلکہ اس سے اپنے پیٹوں کو بھرنے والے ہوں گے یعنی ان پر زبردستی کی جائے گی کہ وہ اس کو کھائیں اور اتنا کھائیں کہ ان کے پیٹ اس سے بھر جائیں۔ جنتیوں کا رزق، کریم تھا تو اس کے بالمقابل دوزخیوں کا رزق، زقوم اور حمیم ہوگا۔ اس درخت زقوم سے کھا کر جب پیاس سے بے تاب اور بے قرار ہوں گے تو پانی مانگیں گے تو اس کھانے کے بعد ان کے لیے پیپ سے ملا جلا کھولتا ہوا پانی ہوگا، جو ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور کھانے کی طرح یہ پانی بھی ان کو زبردستی پلایا جائے گا، پھر ان کی واپسی اور لوٹنا دوزخ کی طرف ہوگا، جو ایک دہکتی ہوئی آگ ہے اور ان کا اصل ٹھکانہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زقوم کا درخت اور کھولتا ہوا پانی، مہمانی اور ناشتہ کے طور پر ان کو دخولِ جہنم سے پہلے کھلایا اور پلایا جائے گا۔ اس کے بعد ان کو دوزخ میں پہنچا دیا جائے گا، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ

ان کو زقوم کھلانے اور کھولتا ہوا گرم پانی پلانے کے لیے دوزخ سے نکالا جائے گا اور زقوم اور حمیم کھلا پلا کر دوبارہ جہنم کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس جگہ کافروں کو زقوم اور حمیم کھلایا پلایا جائے گا وہ جگہ دوزخ سے باہر ہوگی یا جہنم کے کنارے پر ہوگی، کھلانے اور پلانے کے بعد دوبارہ ان کو دوزخ کی طرف لوٹا دیا جائے گا جو ان کے عذاب کا اصل مقام اور ٹھکانہ ہے۔[تفسیر کبیر ج ۷، ص ۱۴۲، تفسیر قرطبی ج ۷ ص ۸۸، حاشیہ صاوی علی الجلالین ج ۳، ص ۲۳۹]

حضرت شاہ عبدالقادر محدثِ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''یہ لوگ بھوکے (اور پیاسے) ہوں گے تو آگ سے ہٹا کر ان کو یہ کھانا اور پانی کھلا پلا کر پھر آگ میں ڈال دیں گے'' [موضح القرآن]

پس یہ لوگ کبھی جحیم (دوزخ) میں ہوں گے اور کبھی حمیم (کھولتا ہوا گرم پانی) میں۔ جیسا کہ فرمایا: ''هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ'' [تفسیر معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۵، ص ۶۷۰، ۶۷۱]

علامہ قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''درختِ زقوم دوزخیوں کا کھانا ہے، زقوم ایک نہایت بدبودار، بدمزہ اور مکروہ شکل کا درخت ہوگا، دوزخیوں کو مجبور کر کے کھلایا جائے گا، انتہائی کراہتِ طبع کے باوجود زقوم کھانے پر مجبور ہوں گے۔ عربی محاورہ ہے: تزقم الطعام، یعنی بڑی ناگواری اور دشواری کے ساتھ اس نے کھانا کھایا۔ اور ''نُزُل'' وہ چیز جو مہمان کے آتے ہی اس کے سامنے لائی جاتی ہے، اس لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ بالا نعمتیں اہلِ جنت کو ابتدائی پیش کش کے طور پر دی جائیں گی، اس کے بعد کیا کیا عطا کیا جائے گا اس کو سمجھنے سے انسانی عقل قاصر ہے، اسی طرح دوزخیوں کو ابتدائی پیش کش کے طور پر زقوم دیا جائے گا اور اس کے بعد کیسا کیسا عذاب ہوگا اس کو سمجھنا عقل کی رسائی سے خارج ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر زقوم کا ایک قطرہ دنیا کے سمندروں میں ٹپکا دیا جائے تو تمام روئے زمین کے

رہنے والوں کی زندگی بگڑ جائے اس سے اندازہ کرلو کہ جس کا کھانا ہی زقوم ہو اس کی بدمزگی، کراہتِ طبعی اور ناگواری کی کیا حالت ہوگی" [ترمذی، نسائی، ابن ماجه، ابن ابی حاتم، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم، سنن بیهقی]

ابو عمران خولانی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے اور زوائد الزہد میں عبداللہ بن احمد نے بیان کیا ہے کہ زقوم میں سے آدمی جتنا نوچے گا زقوم اس آدمی کا بھی اتنا ہی گوشت نوچ لے گا۔"

آیتِ مذکورہ میں "فتنہ" سے مراد دنیا میں آزمائش و تکلیف اور آخرت میں عذاب اور سزا ہے۔ اور "ظالمین" سے مراد کفار۔ کفار کہا کرتے تھے کہ آگ تو درخت کو جلا ڈالتی ہے پھر آگ میں درخت کیسے ہوگا۔ ابن زبعری نے سردارانِ قریش سے کہا تھا کہ حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو زقوم سے ڈراتے ہیں، حالانکہ عبرانی زبان میں زقوم کا معنی ہے مکھن اور کھجور۔

ابو جہل، ابن زبعری کو اپنے گھر میں لایا اور باندی سے کہا کہ ہمارے لیے زقوم لاؤ، وہ مکھن اور کھجوریں لے آئی، ابو جہل نے کہا کہ زقوم کھاؤ اور یہ وہی زقوم ہے جس سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم کو ڈراتے ہیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ کی روایت نقل کی ہے کہ ابو جہل نے کہا کہ تمہارا ساتھی کہتا ہے کہ آگ کے اندر ایک درخت ہوگا حالانکہ آگ، درخت کو کھالیتی ہے، پھر آگ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے! ہم تو خدا کی قسم! زقوم، کھجوروں اور مکھن ہی کو جانتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

امام سدّی کہتے ہیں کہ "اَصْلِ الْجَحِيْمِ" کا معنی ہے قعرِ جہنم۔

اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس درخت کی جڑ قعرِ جہنم میں ہوگی اور شاخیں دوزخ کے مختلف طبقات میں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ "طلعها" یعنی اس کے پھل۔ پھل کو "طلع" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا طلوع یعنی خروج درخت سے ہوتا ہے۔ "الشياطين" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شیاطین سے مراد، شیاطین جن ہی ہیں، بدصورتی میں زقوم کے پھلوں کو شیاطین کے سروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کسی چیز کی

انتہائی برائی ظاہر کرنے کے لیے اس کو شیطان کہا جاتا ہے، شیاطین (اصل شکل میں) اگر چہ نظر نہیں آتے لیکن ذہن میں ان کی مفروضہ صورتوں کا تصور بری ہی شکلوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک شیاطین سے مراد وہ بدصورت اور کریہ المنظر سانپ ہیں جن کے سروں پر بال ہوتے ہیں، شاید اسی کراہت شکل اور ہیبتناک صورت کی وجہ سے ان کو شیاطین کہا جاتا ہے۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ صحراء میں ایک نہایت بدنما، تلخ اور بدبودار درخت ہوتا ہے جس کو اہلِ عرب ''رؤس الشیاطین'' کہتے ہیں۔ [تفسیر مظہری ج ۱۰، ص ۲۳]

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب جہنمی، بھوک کی شکایت کریں گے تو ان کو زقوم کھلایا جائے گا جس سے ان کے چہرے کی کھالیں بالکل الگ ہو کر گر پڑیں گی، اس طرح انہیں پہچاننے والا ان کے منہ کی پوری کھال دیکھ کر پہچان سکتا ہے کہ یہ فلاں شخص کی ہے، پھر پیاس کی شدت سے بے تاب ہو کر ہائے وائے پکاریں گے تو انہیں پگھلے ہوئے تانبے جیسا گرم پانی دیا جائے گا جو چہرے کے سامنے آتے ہی چہرے کے گوشت کو جھلس دے گا اور تمام گوشت گر پڑے گا اور پیٹ میں جا کر آنتوں کو کاٹ دے گا، اوپر سے لوہے کے ہتھوڑے مارے جائیں گے اور ایک ایک عضوِ بدن الگ الگ جھڑ جائے گا، بہت بری طرح چیختے چلاتے ہوں گے، فیصلہ ہوتے ہی ان کا ٹھکانہ دوزخ ہو جائے گا جہاں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ [تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۳۷۲]

☆☆☆
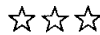
(۵۹)

﴿ کافروں کی ہٹ دھرمی ﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ﴾ [حٰمٓ السجدة: ۴۴]

ترجمہ

''اگر ہم اس کو عجمی (زبان کا) قرآن بناتے تو لوگ یوں کہتے کہ اس کی آیات صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں (یہ بات) کیا ہے کہ (کتاب تو) عجمی اور (رسول) عربی ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے راہنما اور شفاء ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور وہ قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے، یہ لوگ ایسے ہیں کہ (گویا) بڑی دور جگہ سے ان کو پکارا جا رہا ہے (کہ آواز تو سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں)۔''

شانِ نزول:

کافروں نے محض انکار اور سرکشی کے طور پر کہا تھا کہ جس طرح تورات وانجیل عجمی زبانوں میں بھیجی گئیں اسی طرح قرآن بھی کسی عجمی زبان میں اُتارا جاتا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عامر حضرمی کا ایک یہودی عجمی غلام تھا جس

کا نام یسار اور کنیت ابوفکیہ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس آتے جاتے تھے، یہ دیکھ کر مشرکوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یسار، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے، یسار کے آقا نے اس کو مارا پیٹا اور کہا کہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سکھاتا ہے؟ یسار نے کہا کہ وہ تو مجھے تعلیم دیتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ قریش نے کہا تھا کہ یہ قرآن عجمی اور عربی (دونوں زبانوں میں) کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ مبارکہ: ''لَوْلَا فُصِّلَتْ الخ'' نازل فرمائی۔

[تفسیر مظہری ج ۱۰، ص ۲۰۱]

تشریح

قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت، اس کے احکام اور لفظی و معنوی فوائد بیان کرنے کے بعد اس پر ایمان نہ لانے والوں کی سرکشی، عناد اور ضد و عداوت کو بیان فرمایا جا رہا ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: وَ لَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ'' مطلب یہ ہے کہ جن کو نہ ماننا ہو ان کے لیے بہانے ہزار ہوتے ہیں، اگر قرآن کسی عجمی زبان میں نازل ہوتا تو بہانہ یہ کرتے کہ ہم تو اسے صاف صاف سمجھ نہیں سکتے، جب مخاطب عربی زبان کے ہیں تو ان پر جو کتاب اتری ہے وہ غیر عربی زبان میں کیوں نازل کی گئی ہے؟ اور اگر کچھ عربی میں اور کچھ دوسری زبان میں نازل ہوتی تو ان کا اعتراض یہ ہوتا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ قرآن، ایمان والوں کے دل کی ہدایت اور سینوں کی شفاء ہے، اس سے ان کے تمام شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں اور جنہیں اس پر ایمان نہیں ہے وہ تو اسے سمجھ ہی نہیں سکتے جیسے کوئی بہرا ہو، نہ اس کے بیان کی طرف انہیں ہدایت ہو سکتی ہے جیسے کوئی اندھا ہو، جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ''وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'' یعنی ہمارا نازل کردہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے''۔ ان لوگوں کی مثال ایسی

ہے جیسے کوئی دور سے کچھ کہہ رہا ہو کہ نہ تو اس کے کانوں تک صحیح الفاظ پہنچتے ہیں، نہ وہ درست طریقہ سے اس کا مطلب سمجھتا ہے۔

امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ قیامت کے دن انہیں ان کے بدترین ناموں سے پکارا جائے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک مسلمان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جس کا آخری وقت آیا ہوا تھا، اس نے اچانک لبیک کہہ کر پکارا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا کوئی پکار رہا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں، سمندر کے اس کنارے سے کوئی آواز دے رہا ہے تو اس وقت آپ نے یہی جملہ پڑھا کہ ''اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ ۭ بَعِیْدٍ''۔ [ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۴۹۸، ۴۹۹]

خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ یہ قرآن کسی عجمی (غیر عربی) زبان میں کیوں نازل نہیں کیا گیا، یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) خود ہی عربی زبان میں بنا کر ہمیں سنا دیتے ہیں، اس اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر قرآن کو عربی کے علاوہ کسی دوسری عجمی زبان میں نازل کرتے تو پھر ان کا یہ اعتراض ہوتا کہ قرآن ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے ہم سمجھتے ہی نہیں، اسے ہماری زبان میں کیوں نازل نہیں کیا گیا، تاکہ ہم اسے سمجھ لیتے، بھلا یہ کیا تک ہے کہ کلام عجمی ہو اور اس کے مخاطبین عربی ہوں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ معاندین تو قرآن پر طرح طرح کے اعتراض کرتے رہیں گے اور اس کی ہدایت سے محروم رہیں گے، البتہ مؤمنین اس سے مستفید ہوں گے، قرآن کے ذریعہ سے ان کو صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی ہوگی، اور اس کے مطالعہ سے ان کے دل شکوک وشبہات کی بیماری سے شفایاب ہوں گے اور جو لوگ اسے نہ ماننے کا تہیہ کر چکے ہیں، وہ اسے سنتے ہی نہیں اور اگر کبھی سن ہی لیں تو عناد اور سرکشی سے اس کا انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کی گمراہی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، یہ لوگ قریب ہونے کے باوجود قرآن کو نہیں سنتے اور اس سے دور بھاگتے ہیں، ان کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو بہت دور ہو اور اسے خواہ کتنی ہی بلند آواز سے پکاریں، وہ نہ سن سکے گا اور نہ کچھ سمجھے گا، یہی حال ان کا ہے کہ وہ پاس بیٹھے ہوئے بھی کچھ سنتے اور سمجھتے نہیں۔ [دیکھئے تفسیر جلالین]

(٦٠)

﴿آخرت کی کھیتی﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ج وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ [الشوریٰ: ۲۰]

ترجمہ

''جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی بڑھا دیں ہم اس کو اس کی کھیتی اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو ہم اس میں سے دیں اور آخرت میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں۔''

تشریح

گزشتہ مضمون اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ رزّاقیت اور لطیفی پر ختم فرمایا گیا جس سے غرض یہ تھی کہ دنیوی رزق کی تقسیم اللہ ربّ العزت کے محض رزاق ہونے پر ہے، رزق کی کمی اور زیادتی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہونے پر مبنی نہیں ہے، اب ان آیات میں یہ ذکر فرمایا جارہا ہے کہ انسان کی سعادت اسی میں مضمر ہے کہ وہ طالبِ آخرت بنے اور اسی کو اپنی زندگی کا اصل مقصود سمجھے، دنیا کی طلب، انسانی زندگی کا مقصد نہیں، اس لیے جو شخص اپنی فکر طلبِ آخرت بنالے گا، خدا کی مدد، توفیق اور رحمت شامل ہوگی اور اس کی کوشش کو قبول فرمایا جائے گا۔ اور اس میں برکت دی جائے گی، لیکن اس کے برعکس اگر اس کا مقصودِ زندگی دنیا ہی کمانا ہے تو ہم اس کو اگرچہ دنیا تو دے دیں گے مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرتا ہے تو ہم

اس کی کھیتی میں اس کے لیے اضافہ کرتے ہیں کہ طالبِ آخرت کے اعمال قبول کیے جاتے ہیں اور اس کے ثمرات اجر وثواب اور انعام کے اس پر مرتب ہوتے ہیں اور اس پر اضافہ اور برکت سے نوازا جاتا ہے، اعمالِ حسنہ اور عبادات میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے اور اجر و ثواب میں بھی زیادتی ہوتی رہتی ہے، جس طرح ایک تخم اور دانہ زمین میں بو دیئے جانے کے بعد اس کا سلسلہ نشوونما ہوتا ہے تا آنکہ وہ بلندی کے آخری مقام تک پہنچ جائے، اسی طرح اعمالِ صالحہ آخرت کی کھیتی ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" یعنی جو شخص ایک نیکی کا کام کرے اس کے لیے اس سے دس گنا زائد ثواب ہے۔ لیکن جو شخص دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو دنیا میں سے دے دیتے ہیں اور پھر آخرت میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں۔ بہرکیف! اللہ کا یہ شروع کیا ہوا دینِ حق ہے جس کی بنیادی تعلیم اور ہدایت اخلاص ہے، ہر عمل صرف اللہ ہی کے لیے اور آخرت ہی کے لیے ہونا چاہیے، صرف ایسا عمل ہی قابل قبول ہے اور مثمر بھی ہے، اخلاصِ عمل عقیدۂ توحید کے بغیر ممکن نہیں۔ [معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۶، ص ۲۲۱]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی، پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہو، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہی ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی ہوگی۔" [متفق علیه]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اس امت کو خوشخبری دے دو، (نام) روشن ہونے کی، اونچا ہونے کی، فتحیابی کی اور زمین پر اقتدار حاصل ہونے کی، امت میں سے جو شخص آخرت کا کام دنیا کے لیے کرے گا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔" [رواہ البغوی]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "جو آخرت کے اعمال کی طرف توجہ دیتا ہے ہم خود اس کی مدد کرتے ہیں اور اسے قوت طاقت بخشتے ہیں، اس کی نیکیاں بڑھاتے رہتے

ہیں، کسی نیکی کو دس گنا کر دیتے ہیں، کسی کو سات سو گنا اور کسی کو اس سے بھی زیادہ۔

الغرض آخرت کی چاہت جس دل میں ہوتی ہے اس شخص کو نیک اعمال کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ اور جس کی تمام تر محنت و کوشش دنیا حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے، آخرت کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی تو وہ دونوں جہاں سے محروم رہتا ہے، دنیا کا ملنا اللہ تعالیٰ کی مشیت (ارادہ) پر موقوف ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ ہزار نہیں لاکھ کوشش کرے اور دنیا سے بھی محروم رہ جائے، بدنیتی کی وجہ سے آخرت تباہ و برباد کر ہی چکا تھا، دنیا بھی حاصل نہ ہوئی تو دونوں جہان سے گیا گزرا اور اگر تھوڑی سی دنیا مل بھی گئی تو کیا ملا؟ چنانچہ دوسری آیت میں اسی مضمون کو مؤکد طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ''مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ الخ'' یعنی جو شخص دنیا کا طالب ہوگا ایسے شخص کو ہم جو چاہیں اور جتنا چاہیں دے دیں گے، پھر اس کے لیے جہنم تجویز کریں گے، جس میں وہ بدحال اور راندۂ درگاہ ہو کر داخل ہوگا اور جو آخرت کا طالب ہوگا اور اس کے حصول کے لیے کوشش کرے گا اور وہ مومن بھی ہوگا تو ایسا ناممکن ہے کہ اس کی کوشش کی قدردانی نہ کی جائے۔ (اور) دنیوی انعام و بخشش تو عام ہے، اس سے ہم ان سب کی مدد کرتے ہیں اور تیرے رب کی یہ دنیوی عطا کسی پر بند نہیں، خود دیکھ لو کہ ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دے رکھی ہے، یقین جانو کہ درجات کے اعتبار سے بھی اور فضیلت کے لحاظ سے بھی آخرت بہت بڑی ہے۔

[الاسراء: ۱۸۔۲۱] [تفسیر ابن کثیر: ج ۵ ص ۱۵، ۱۶]

☆☆☆

(۶۱)

﴿اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰی ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ یَعْفُ عَنْ كَثِیْرٍ ۝ وَ یَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ﴾[الشوریٰ: ۳۲-۳۵]

ترجمہ

''اور منجملہ اس کی نشانیوں کے وہ جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں، اگر اللہ چاہے تو ہوا کو روک دے اور نتیجہ یہ نکلے کہ جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے رہ جائیں، بلاشبہ اس میں ہر صابر شاکر مومن کے لیے قدرتِ خداوندی کی بڑی نشانیاں ہیں یا اگر خدا چاہے تو جہازوں کو ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے تباہ کر دے اور ان میں بہت سے آدمیوں سے درگزر کر جائے جو لوگ ہماری نشانیوں میں جھگڑتے ہیں وہ جانتے ہیں ان کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی نشانی اپنی مخلوق کے سامنے رکھتا ہے کہ اس نے سمندروں کو مسخر کر رکھا ہے، تا کہ کشتیاں ان میں برابر چلتی رہیں، بڑی بڑی کشتیاں

سمندروں میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے زمین میں بلند پہاڑ، ان کشتیوں کو اِدھر سے اُدھر لے جانے والی ہوائیں اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، اگر وہ چاہے تو ان ہواؤں کو روک لے، پھر تو بادبان بے کار ہو جائیں اور کشتی رک کر کھڑی ہو جائے، جو شخص مصائب و مشکلات میں صبر کا اور راحتوں اور آسائشوں میں شکر کا عادی ہو اس کے لیے تو اس میں بڑا عبرت کا سامان ہے، وہ رب تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت اور اس کی بے پایاں سلطنت کو ان نشانیوں سے سمجھ سکتا ہے اور جس طرح ہوائیں بند کر کے کشتیوں کو کھڑا کر دینا اس کے قبضہ قدرت میں ہے اسی طرح ان پہاڑوں جیسی کشتیوں کو آن ہی آن میں غرق کر دینا بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اگر وہ چاہے تو کشتی میں سوار لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے انہیں غرقاب کر دے، حالانکہ وہ تو بہت سے گناہوں سے درگزر فرما دیتا ہے اور اگر سب گناہوں پر مواخذہ کرنے لگے تو جو بھی کشتی میں سوار ہو سیدھا سمندر میں جا کر غرق ہو، لیکن اس کی بے پایاں رحمت ان کو اس پار لے جاتی ہے۔ علماء مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسی ہوا کو ناموافق بنا دے، تند و تیز آندھی چلا دے جو کشتی کو سیدھی راہ چلنے ہی نہ دے، سنبھالے نہ سنبھل سکے، جہاں جانا منظور ہے اس طرف جا ہی نہ سکے اور یوں ہی حیران و سرگردان ہو کر کشتی میں تمام لوگ غرق ہو جائیں۔

الغرض اگر ہوا کو بند کر دے تو کھڑے کے کھڑے رہ جائیں اور اگر تیز کر دے تو بھی ناکامی اور تباہی سے ہمکنار ہو۔ یہ اس کا لطف و کرم ہے کہ خوشگوار اور موافق ہوائیں چلاتا ہے اور طویل طویل سفر بھی ان کشتیوں کے ذریعہ سے انسان طے کرتا ہے اور اپنی منزلِ مقصود کو پالیتا ہے۔

یہی صورتِ حال پانی کی ہے کہ اگر بالکل نہ برسے تو قحط سالی اور خشک سالی پیدا ہو جائے اور دنیا والے تباہ و ہلاک ہو جائیں اور اگر حد سے زیادہ برسا دے تو اس سے کوئی چیز پیدا ہی نہ ہو اور دنیا ہلاک و برباد ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی بارش کی کثرت طغیانی، مکانات کے گرنے اور پوری تباہی کا سبب بن جائے، یہاں تک کہ اللہ کی مہربانی اور اس

کے فضل و کرم سے جن شہروں اور زمینوں میں زیادہ بارش کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کثرت سے بارش برستی ہے اور جہاں ضرورت کم ہوتی ہے، وہاں کم برستی ہے، پھر فرمایا کہ ہماری نشانیوں میں جھگڑنے والے ایسے موقعوں پر تو مان لیتے ہیں کہ وہ ہماری قدرت سے باہر نہیں، ہم اگر انتقام لینا چاہیں اور عذاب دینا چاہیں تو وہ چھوٹ نہیں سکتے، سب ہماری قدرت اور مشیت کے تحت ہے۔[تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص ۲۳، ۲۴]

☆☆☆

(۶۲)

﴿کافر کی زندگی بے معنیٰ اور بے مقصد ہوتی ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ﴾

[محمد: ۱۲]

ترجمہ

''بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے (درختوں اور محلوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو لوگ کافر ہیں وہ (دنیا میں) عیش کر رہے ہیں اور جانوروں کی طرح کھا رہے ہیں اور دوزخ ان کا ٹھکانہ ہوگی۔''

تشریح

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کے غلبہ اور کامیابی کا ایک راز بیان فرمایا گیا اور وہ ضابطہ جس پر نصرتِ خداوندی ان کے شاملِ حال ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ تاریخی واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے ظاہر کر دیا گیا کہ ہمیشہ سے قانونِ قدرت اسی طرح چلا آرہا ہے کہ حق کو غلبہ ہوتا ہے اور باطل اپنے جملہ وسائل و ذرائع کے ساتھ ناکام اور مغلوب ہوتا ہے تو اب ان آیات میں اہلِ مکہ پر اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہونے والے انعامات کا بیان ہے اور یہ کہ ان کو دنیوی کامیابی، برتری اور عزت کے علاوہ آخرت میں جنت کی بے

پایاں نعمتوں سے نوازا جائے گا اور جو قومیں شقاوت اور بدبختی کا شکار ہوگئیں ان کے لیے سوائے ذلت، ناکامی اور عذابِ آخرت کے اور کچھ نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ کافر کی زندگی بے معنی اور بے مقصد ہوتی ہے، اس لحاظ سے اس دنیوی زندگی کا کوئی مقصدِ حیات نہیں، بس یہی دنیا کی زندگی اس کی زندگی ہے بالکل یہی حال کفار ومشرکین کا ہے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو لوگ کافر ہیں وہ دنیا کے ساز وسامان سے نفع اٹھا رہے ہیں اور ایسے کھا رہے ہیں جیسے کہ چوپائے کھاتے ہوں کہ ان کو اس دنیوی زندگی کے مابعد آخرت کا کوئی تصور ہی نہیں اور سمجھتے ہی نہیں کہ یہ دنیوی زندگی کس مقصد کے لیے انسان کو دی گئی ہے؟ اور نیز مال و دولت کی حرص و ہوس بھی اچھے برے، حرام وحلال اور نفع ونقصان میں ان کو تمیز نہیں کرنے دیتی، جس طرح کہ چوپائے بھی تمیز نہیں کرتے کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری، بس چارہ کی حرص ہے اور ہر چیز پیٹ میں بھرے چلے جا رہے ہیں، تو ٹھیک ہے، چند روز مزے اڑا لیں آخر کار آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے جو ٹھکانہ ان کے لیے گویا اسی طرح تیار کیا ہوا ہے جیسے کسی انسان کے لیے اس کا گھر ٹھکانے کے طور پر تیار کیا جاتا ہے۔

[معارف القرآن مولانا کاندھلویؒ ج ۶، ص ۳۶۸، ۳۶۹ ملخصاً]

☆☆☆

(۶۳)

جنت کی نعمتوں کا تذکرہ

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ [محمد: ۱۵]

ترجمہ

’’جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں کبھی بگاڑ نہ ہوگا اور بہت سی نہریں ایسے دودھ کی ہیں جس کا مزہ ذرہ بھی بدلا ہوا نہ ہوگا اور بہت سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کے لیے سراسر لذت ہی ہوں گی اور بہت سی نہریں نہایت صاف شہد کی ہیں اور ان کے لیے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش ہوگی کیا ایسے لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا سو وہ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔‘‘

تشریح

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ جنت کے اوصاف بیان فرماتے ہیں کہ اس میں

پانی کے چشمے ہیں جو پانی کبھی بگڑتا نہیں ہے، یعنی متغیر نہیں ہوتا، سڑتا نہیں، نہ بدبو پیدا ہوتی ہے، بہت صاف موتی جیسا ہے، اس میں کوئی گدلا پن نہیں، کوڑا کرکٹ نہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنت کی نہریں مشک کے پہاڑوں سے نکلتی ہیں، اس میں پانی کے علاوہ دودھ کی نہریں بھی ہیں جن کا ذائقہ کبھی نہیں بدلتا، بہت سفید، بہت شیریں اور نہایت صاف، شفاف اور خوش ذائقہ ہیں۔

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ دودھ جانوروں کے تھن سے نکلا ہوا نہیں بلکہ قدرتی ہے اور صاف شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کا دل خوش کر دیں، دماغ کشادہ کر دیں، جو شراب نہ تو بدبودار ہے نہ تلخی والی ہے، نہ کریہ المنظر ہے، بلکہ دیکھنے میں بہت اچھی، پینے میں بہت لذیذ، نہایت خوشبودار، جس سے نہ عقل میں فتور آئے، نہ دماغ چکرائیں، نہ منہ سے بدبو آئے، نہ سر میں درد ہو، نہ بہکیں، نہ بھٹکیں، نہ نشہ پیدا ہو، نہ عقل زائل ہو۔

حدیث میں ہے کہ یہ شراب بھی کسی کے ہاتھوں سے کشید کی ہوئی نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے تیار ہوئی ہے، اور خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہے۔ جنت میں شہد کی نہریں بھی ہیں جو بہت صاف، خوشبودار اور بے مثال ذائقہ کی حامل ہیں۔

حدیثِ پاک میں ہے کہ یہ شہد بھی مکھیوں کے پیٹ سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ مسند احمد کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جنت میں دودھ، پانی، شہد اور شراب کے سمندر ہیں جن میں سے ان کی نہریں اور چشمے جاری ہوتے ہیں۔

[سنن ترمذی و قال حدیث حسن صحیح]

ابن مردویہ کی حدیث میں ہے کہ یہ نہریں جنتِ عدن سے نکلتی ہیں، پھر ایک حوض میں آتی ہیں، وہاں سے دوسری نہروں کے ذریعہ تمام جنتوں میں جاتی ہیں۔ ایک اور حدیثِ صحیح میں ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس طلب کرو، وہ سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ جنت ہے، اس سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں اور اس کے پاس رحمان کا عرش ہے۔ طبرانی میں ہے کہ حضرت لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ جب وفد کے ساتھ

آئے تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ جنت میں کیا کچھ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ صاف شہد کی نہریں اور بغیر نشہ کے سر درد نہ کرنے والی شراب کی نہریں اور نہ بگڑنے والے دودھ کی نہریں اور خراب نہ ہونے والے شفاف پانی کی نہریں اور طرح طرح کے میوہ جات عجیب وغریب بے مثل اور بالکل تر وتازہ اور پاک وصاف بیویاں، جو نیک لوگوں کو ملیں گی اور وہ بیویاں خود بھی نیک ہوں گی، دنیا کی لذتوں کی طرح ان سے لذتیں اٹھائیں گے، ہاں البتہ وہاں اولاد نہ ہوگی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ خیال نہ کرنا کہ جنت کی نہریں بھی دنیا کی نہروں کی طرح زمین میں کھدی ہوئی اور گڑھوں میں بہتی ہیں، نہیں، ہرگز نہیں، خدا کی قسم! وہ صاف زمین پر یکساں جاری ہیں، ان کے کنارے کنارے لؤلؤ اور موتیوں کے خیمے ہیں، ان کی مٹی خالص مشک کی ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ وہاں ان کے لیے ہر طرح کے میوے اور پھل پھول ہیں۔

جیسا کہ ایک اور جگہ فرمایا: "وَ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ الخ" یعنی وہاں نہایت امن وامان کے ساتھ وہ ہر قسم کے میوے اور پھل منگوائیں گے اور کھائیں گے۔

ایک دوسری آیت میں ہے: "فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ الخ" یعنی دونوں جنتوں میں ہر قسم کے میووں کے جوڑے ہیں۔ ان تمام نعمتوں کے ساتھ یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ رب تعالیٰ راضی اور خوش ہیں، وہ اپنی مغفرت ان کے لیے لازم کر چکا ہے اور انہیں نواز چکا ہے اور ان سے راضی ہو چکا ہے۔ اب تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔

جنتوں کی یہ دھوم دھام اور نعمتوں کے بیان کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ دوسری طرف دوزخیوں کی یہ حالت ہے کہ وہ جہنم کے طبقات میں جھلس رہے ہیں اور وہاں سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں، اور سخت پیاس کے موقع پر کھولتا ہوا گرم پانی جو حقیقت میں آگ ہی ہے اور بظاہر پانی، انہیں پینے کے لیے ملتا ہے کہ ایک گھونٹ اندر جاتے ہی آنتیں کٹ کٹ کر گرتی ہیں۔ (اعاذنا اللہ منہ) پھر بھلا ان دونوں میں کیا برابری ہوسکتی

ہے؟ کہاں جنتی اور کہاں جہنمی، کہاں نعمت اور کہاں زحمت، یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں!۔[تفسیر ابن کثیر ج ۵، ص ۱۰۸، ۱۰۹]

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں: "مَثَلُ الْجَنَّةِ" یہ جملہ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے، پورا کلام اس طرح ہے کہ جنت موعود کی عجیب کیفیت تمہارے سامنے بیان کی جائے گی۔ بعض کہتے ہیں کہ اگلی آیتِ کریمہ: کَمَنْ هُوَ خَالِدٌ الخ اس کی خبر ہے، پورا کلام اس طرح ہوگا کہ کیا جنت والوں کی حالت ان لوگوں کی حالت کی طرح ہوگی جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، حرفِ استفہام کو غیر ضروری قرار دے کر حذف کر دیا گیا، اس صورت میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو لوگ رب تعالیٰ کے کھلے ہوئے راستہ پر چلنے والوں کو پرستارانِ ہوا و ہوس کی طرح قرار دیتے ہیں وہ گویا جنت اور دوزخ کو برابر سمجھتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں موجود لفظ "غَيْرِ آسِنٍ" سے مراد وہ چیز ہے جس کا نہ مزہ خراب ہو نہ بو۔ دنیا کا پانی اگر کچھ مدت تک ٹھہرا رہے تو اس کا مزہ بھی خراب ہو جاتا ہے اور بدبودار بھی ہو جاتا ہے، مگر جنت کی نہروں کا پانی ایسا نہیں ہوگا، اس طرح دنیا میں جو معمولاً دودھ ہوتا ہے اس کا مختلف اسباب کے زیرِ اثر مزہ خراب ہو جاتا ہے، اس میں ترشی پیدا ہو جاتی ہے مگر جنت کی نہروں کا دودھ ہر قسم کے بگاڑ سے پاک ہوگا۔ اور شراب کی نہریں ہوں گی، نہ اس کی بو ناگوار ہو جیسی دنیوی شراب کی ہوتی ہے نہ نشہ اور خمار ہوگا، "عَسَلٍ مُّصَفًّى" کا معنی ہے نہایت صاف شہد جس کے اندر نہ موم کی آمیزش ہوگی، نہ مکھیوں کے فضلہ کی۔

حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "جنت کے اندر پانی کی نہر ہے اور شہد کی نہر ہے اور دودھ کی نہر ہے، پھر ہر ایک سے نہریں نکالی گئی ہیں۔" [رواہ البیہقی و الترمذی]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جنت کی نہریں مشک کے پہاڑ سے پھوٹ کر نکلتی ہیں۔"

[رواہ ابن حبان و الحاکم و البیہقی و الطبرانی و ابن ابی حاتم]

مسروق رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ''جنت کی نہریں بغیر گڑھے (کے ہموار سطح پر) بہتی ہیں۔'' [رواہ ابن المبارک و البیهقی]

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شاید تم خیال کرتے ہوئے کہ جنت کی نہریں زمین کے گڑھے (میں بہتی) ہوں گی نہیں، خدا کی قسم! وہ روئے زمین پر رواں ہوں گی، اس کے دونوں کنارے موتیوں کے خیمے ہوں گے اوراس کی مٹی خالص مشک کی ہوگی۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سیحون اور جیحون اور فرات اور نیل سب جنت کی نہروں سے ہیں۔'' [رواہ مسلم]

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عوف روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چار نہریں، جنت کی نہریں ہیں: نیل، فرات، سیحون اور جیحون، اور چار پہاڑ، جنت کے پہاڑ ہیں، احد، طور، لبنان اور ورقان۔''

حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنت کے اندر دریائے نیل شہد کا دریا ہے اور دریائے دجلہ دودھ کا دریا ہے اور دریائے فرات شراب کا دریا اور دریاے سیحون پانی کا دریا ہے۔ (یعنی جنت کے اندر جن دریاؤں کے یہ دنیوی نام ہیں، ان کی حقیقت شہد، دودھ، شراب اور پانی ہے)۔ [رواہ البیهقی]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ دریائے دجلہ (جو جنت میں ہے) جنتیوں کے پانی کا دریا ہے اور فرات نام کا دریا ان کے دودھ کا دریا ہے اور مصر کا دریا (دریائے نیل) جنتیوں کی شراب کا دریا ہے اور دریائے سیحون ان کے شہد کا دریا ہے اور یہ چاروں جنتی دریا دریائے کوثر سے نکلتے ہیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''دنیا میں کوئی پھل ایسا نہیں جو جنت میں نہ ہو میٹھا ہو یا کڑوا، یہاں تک کہ حنظل بھی۔''

[رواہ ابن ابی حاتم و ابن المنذر فی تفسیر یهما]

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں ان

کے صرف نام ہیں، (جنت کے پھل کی حقیقت، لذت اور کیفیت دنیا کے پھلوں میں نہیں ہے)۔[رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم و البیھقی]

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جنتی آدمی جوں ہی جنت کا کوئی پھل توڑے گا فوراً اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا پھل لگ جائے گا۔'' ''كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ الخ'' یعنی کیا ایسے لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور کھولتا ہوا گرم پانی ان کو پلایا جائے گا، سو وہ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

''كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ'' یہ جملہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، پورا کلام اس طرح تھا، کیا وہ شخص جو اس جنت میں ہمیشہ رہے گا بھلا اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ ''كَمَنْ هُوَ'' میں لفظی اعتبار سے ''مَنْ'' مفرد ہے اس لیے ''ھو'' ضمیر مفرد راجع کر دی گئی، لیکن معنی کے اعتبار سے ''مَنْ'' جمع ہے اس لیے ''سُقُوا'' کی ضمیر جمع لوٹائی گئی۔ ''فَقَطَّعَ اَمْعَآئَهُمْ'' یعنی کھولتے پانی کی انتہائی حرارت کی وجہ سے انتڑیاں (آنتیں) ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دبر سے نکل جائیں گی۔'' [تفسیر مظھری ج ۱۰: ص ۳۱۹، ۳۲۱]

خلاصہ کلام یہ کہ اس آیتِ مبارکہ میں اخروی بشارت اور نعیم جنت کی صفت کا بیان ہے، متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت اور اس کی نعمتوں کا حال یہ ہے کہ اس میں بہنے والی پانی کی نہروں کا پانی ہمیشہ خوش رنگ اور خوش ذائقہ رہے گا اور اس کے رنگ و بو میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی، اسی طرح ایسے دودھ کی نہریں جاری ہوں گی جس کا مزہ کبھی نہیں بگڑے گا حالانکہ دنیا کا دودھ تھوڑی دیر میں متغیر ہو جاتا ہے، جنت میں شراب کی بھی نہریں جاری ہوں گی لیکن دنیوی شرابوں کے برعکس جنت کی شراب نہایت لذیذ اور پُر لطف ہوگی، بدبو، بدمزگی اور نشہ سے پاک ہوگی اور صاف شفاف شہد کی نہریں بھی ہوں گی جو ہر قسم کے فضلات اور کثافت سے پاک صاف ہوگا، مشروبات کے علاوہ کھانے کے لیے ہر قسم کے پھل اور میوے ہوں گے، اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا جائے گا، ان پر نہ مواخذہ ہوگا اور نہ کبھی ان کا ذکر ہی کیا جائے گا تاکہ وہ شرمسار نہ ہوں اور ان کے عیش وسکون میں فرق نہ آئے۔

"كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ الخ" اس میں کفار کی حالت اور اخروی تخویف کا ذکر ہے مطلب یہ ہے کہ ایک وہ شخص ہے جسے جنت میں مذکورہ بالا نعمتیں نصیب ہوں گی، کیا ایسا سعادت مند شخص، اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور جسے وہاں پینے کے لیے سخت ترین گرم پانی دیا جائے گا جو پیتے ہی اس کی انتڑیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟

☆☆☆

(۶۴)

﴿جہاد کا حکم اور منافقین کی حالت﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد: ۲۰]

ترجمہ

''اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی (نئی) سورت کیوں نہیں نازل ہوئی سو جس وقت کوئی (صاف صاف مضمون کی) کوئی سورت نازل ہوتی ہے اور اس میں جہاد کا بھی ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری (نفاق) ہے آپ ﷺ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو رہی ہو، سو ان کی کم بختی آنے والی ہے۔''

تشریح

اس آیتِ کریمہ میں منافقین کے احوال کا بیان ہے، ایمان والوں کی یہ آرزو اور خواہش تھی کہ قرآن میں جہاد کا حکم نازل ہوتا کہ وہ جہاد کر کے مشرکین سے انتقام لیں، اللہ کے دین کو سر بلند کریں اور اجر و ثواب حاصل کریں تو جب کوئی ایسی سورت نازل ہوتی جس میں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں جہاد و قتال کا حکم ہوتا تو منافقوں پر سکتہ طاری ہو جاتا اور وہ حضورِ اکرم ﷺ کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو اور

اس کے اوسان خطا ہو چکے ہوں، کیونکہ بظاہر مسلمانوں میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو بادلِ نخواستہ جہاد میں شریک ہو، جن مشرکین کے ساتھ ان کی دلی ہمدردیاں ہیں، ان سے لڑیں یا پھر جہاد میں شریک نہ ہوں اور منافقت کا الزام لے کر ذلیل وخوار ہوں۔ [روح المعانی، البحر المحیط، قرطبی]

"فَاَوْلٰی" یہ کلمہ بددعاء کے طور پر استعمال ہوتا ہے، یہ اصل میں ان کے خلاف بددعاء ہے کہ ان کا انجام ہلاکت ہو اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک و برباد کرے۔
[روح المعانی ج ۲٦، ص ٦٧]

بعض اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ "اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ" سے منافق لوگ مراد ہیں اور "مرض" سے شک اور نفاق مراد ہے۔ اور "اَوْلٰی" کا معنی ہے سخت ہلاکت اور خرابی، اَوْلٰی بروز افعل اسم تفضیل کا صیغہ ہے اس کا مادہ ویل (ہلاکت) یا ولی بمعنی قرب ہے یا اس کا وزن فَعْلٰی ہے اس کی ماضی آل بمعنی رجع آتا ہے۔ [تفسیر مظہری ج۱۰ص۴۲۵]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "اس آیت میں اللہ تعالیٰ خبر دے رہے ہیں کہ مومن لوگ تو جہاد کی تمنا کرتے ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ جہاد کو فرض قرار دیتے ہیں تو اس حکم کی اکثر لوک عدولی کرتے ہیں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ الخ﴾ [النسآء: ۷۷]

یعنی "کیا تم نے دیکھا ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو، اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ کا حال یہ ہے کہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ کچھ اس سے بھی

زیادہ، کہتے ہیں کہ خدایا! یہ لڑائی کا حکم ہمیں کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ آپ کہہ دیں کہ دنیا کی متاع بہت ہی کم ہے اور آخرت پرہیز گاروں کے لیے بہت ہی بہتر ہے اور تم پر ذرا سا بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اسی طرح یہاں پر بھی فرماتے ہیں کہ ایمان والے تو جہاد کے احکام کی آیات کے نزول کی تمنا اور آرزو کرتے ہیں لیکن منافق لوگ جب ان آیتوں کو سنتے ہیں تو اپنی بوکھلاہٹ، بزدلی اور گھبراہٹ کی وجہ سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح آپ کو دیکھنے لگتے ہیں جیسے موت کی غشی میں مبتلا آدمی دیکھتا ہے۔" [تفسیر ابن کثیر ج ۵، ص ۱۱۲]

☆☆☆

(۶۵)

﴿غیبت کرنے والے شخص کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ﴾ [الحجرات: ۱۲]

ترجمہ

"اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگے رہا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس کو تم ناگوار سمجھتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

شانِ نزول:

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی جہاد یا سفر میں تشریف لے جاتے تو ایک ایک غریب آدمی کو دو دو مالدار آدمیوں کی خدمت کرنے کے لیے مقرر فرما دیتے اور دو مالداروں کے ساتھ تیسرے غریب آدمی کو ملا دیتے تھے، ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو دو آدمیوں کے کام پر مامور کیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر کسی فرودگاہ پر پہنچے اور وہاں جا کر سو رہے، اپنے دونوں ساتھیوں کے لیے کھانے پینے کا

سامان فراہم نہ کر پائے، جب آپ سے ان دو آدمیوں نے پوچھا کہ تم نے کوئی چیز فراہم نہیں کی تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے ایسی نیند آگئی کہ میں کچھ نہ کر سکا، ان دونوں نے کہا کہ تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں جاؤ اور ہمارے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کھانا عطا فرمانے کی درخواست کرو، ساتھیوں کے کہنے کے مطابق حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کھانا عطا کرنے کی درخواست کی، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے جا کر کہو، اگر کچھ کھانا سالن بچا ہوا ہوگا تو وہ دے دیں گے، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خازن بھی تھے اور پڑاؤ کے مہتمم بھی، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے جا کر درخواست کی تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے واپس جا کر ساتھیوں کو اسامہ رضی اللہ عنہ کے قول کی اطلاع دے دی، ساتھیوں نے کہا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھانا تو تھا، لیکن انہوں نے بخل سے کام لیا، اس کے بعد حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے پاس بھیجا گیا، لیکن وہاں بھی کچھ نہیں ملا، سلمان رضی اللہ عنہ ناکام لوٹ آئے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے کہا کہ اگر تم کو کسی جاری کنوئیں کی طرف پانی لینے کے لیے بھیجیں گے تو وہ بھی سوکھ جائے گا، پھر یہ لوگ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے پاس جستجو کے لیے آئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو کھانا سالن دینے کا حکم دیا تھا کیا واقعی وہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس موجود نہیں تھا، (یا تھا مگر انہوں نے بخل سے کام لیا) جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ گوشت کی خوشبو تمہارے منہ سے آتی مجھے محسوس ہو رہی ہے؟! دونوں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! خدا کی قسم! ہم نے تو آج دن بھر گوشت نہیں کھایا، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم غلط کہہ رہے ہو، تم اسامہ رضی اللہ عنہ اور سلمان رضی اللہ عنہ کا گوشت کھاتے رہے ہو، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

[تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۳۰، ۳۱]

تشریح

یہ آیتِ کریمہ آدابِ معاشرت کے متعلق احکامات پر مشتمل ہے، اس میں تین چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، پہلے ظن، دوسرے تجسس یعنی کسی پوشیدہ عیب کا سراغ لگانا اور تیسرے غیبت۔ یعنی کسی کی عدم موجودگی میں کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سنتا تو اس کو ناگواری ہوتی، پہلی چیز یعنی ظن کے معنی ہیں غالب گمان، اس کے متعلق قرآنِ مجید نے اول تو یہ ارشاد فرمایا کہ ''بہت سے گمانوں سے بچا کرو'' پھر اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ ''بعض گمان گناہ ہوتے ہیں'' اس سے معلوم ہوا کہ ہر گمان گناہ نہیں تو اب اس کی تحقیق ضروری ہوگی کہ کون سے گمان گناہ ہیں تاکہ ان سے بچیں اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہو اس کے پاس نہ جائیں۔ علماء اور فقہاء نے اس کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس جگہ ''ظن'' سے مراد تہمت ہے، یعنی کسی شخص پر بغیر کسی قوی دلیل کے کوئی الزام عیب یا گناہ کا لگانا۔ [قرطبی]

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے ''احکام القرآن'' میں اس کی تفصیل اس طرح ذکر کی ہے کہ ظن کی چار قسمیں ہیں، ایک حرام ہے، دوسری مامور بہ اور واجب، تیسری مندوب اور مستحب ہے اور چوتھی مباح اور جائز ہے۔ حرام ظن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ مجھے عذاب ہی دے گا یا مصیبت ہی میں رکھے گا اس طرح کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت سے گویا مایوس ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**لایموتنّ احدکم الاوھم یحسن الظنّ باللّٰہ**'' یعنی تم میں سے کسی کو اس کے بغیر موت نہ آنی چاہیے کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان ہو۔''

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''انا عند ظن عبدی بی'' یعنی میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا

ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے۔ اب اس کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھنا فرض ہے اور بدگمانی حرام ہے۔ اسی طرح ایسے مسلمان جو ظاہری طور پر نیک دیکھے جاتے ہیں ان کے متعلق بغیر کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایّاکم والظنّ فان الظن اکذب الحدیث'' یعنی گمان سے بچو، کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔''

یہاں ظن سے مراد بالاتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بغیر کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے اور جو کام ایسے ہیں کہ ان کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً لازمی اور ضروری ہے اور اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے، وہاں پر ظنِ غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ جیسے باہمی منازعات و مقدمات کے فیصلہ میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا، کیونکہ حاکم اور قاضی جس کی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اس پر اس کا فیصلہ دینا واجب اور ضروری ہے اور اس خاص معاملہ کے لیے کوئی واضح دلیل قرآن وسنت میں موجود نہیں تو ثقہ گواہوں کی گواہی پر عمل کرنا اس کے لیے واجب ہے، اگر یہ امکان اور احتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اس وقت جھوٹ بولا ہو، اس لیے اس کا سچا ہونا صرف ظنِ غالب ہے اور اسی پر عمل واجب ہے۔ اسی طرح جہاں سمتِ قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کیا جا سکے وہاں اپنے ظنِ غالب پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان د.نا واجب ہو تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظنِ غالب پر ہی عمل کرنا واجب ہے۔ اور ظنِ مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہو جائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظنِ غالب پر عمل کرنا جائز ہے اور اگر وہ ظنِ غالب کو چھوڑ کر امرِ یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دے کر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے اور ظنِ مندوب و مستحب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ [جصاص ملخصاً]

دوسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے وہ تجسس ہے یعنی کسی کے عیب

کی تلاش اور سراغ لگانا۔ اس میں قرأتیں دو ہیں، ایک لَا تَجَسَّسُوا (جیم کے ساتھ)، دوسری "لَا تَحَسَّسُوْا" (حاء کے ساتھ) اور صحیحین کی حدیث جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں یہ دونوں لفظ آئے ہیں۔ ارشاد ہے: لَا تَجَسَّسوا و لاتحسّسوا.
اور ان دونوں لفظوں کے معنی قریب قریب ہیں۔ امام اخفش رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں میں فرق یہ کیا ہے کہ تجسس (جیم کے ساتھ) کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہتے ہیں جن کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو اور تحسس (حاء کے ساتھ) مطلق جستجو اور تلاش کے معنی میں آتا ہے۔

سورۂ یوسف میں "تَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْہِ" اسی معنی کے لیے آیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز تمہارے سامنے آجائے اس کو پکڑ سکتے ہیں اور کسی مسلمان کا جو عیب ظاہر نہ ہو اس کی جستجو اور تلاش کرنا جائز نہیں ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لاتغتابوا المسلمین ولا تتّبعوا عوراتھم فان من اتبع عوراتھم یتبع اللّٰہ عورتہ و من یتبع اللّٰہ عورتہ یفضحہ فی بیتہ" یعنی مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کے عیوب کی جستجو نہ کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیب کی تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اس کو اس کے گھر کے اندر بھی رسوا کر دیتا ہے۔" [قرطبی]

تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے، یعنی کسی کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سنتا تو اس کو ایذاء ہوتی، اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو، کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے، جس کی حرمت الگ قرآن پاک سے ثابت ہے اور غیبت کی تعریف میں "اس شخص کی غیر موجودگی" کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی تکلیف دہ بات کہنا جائز ہے، کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لَمز میں داخل ہے، جس کی حرمت "وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ" کی آیت میں آچکی ہے۔ "اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ" اس آیت میں کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین و تحقیر کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مثل اور مشابہ قرار

دیا گیا ہے، اگر وہ شخص اس کے سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن کریم میں "لَمز" کے لفظ سے تعبیر کر کے حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ آدمی غائب ہو، اس کے پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اس کی آبرو میں خلل واقع ہو اور اس کی تحقیر و توہین ہو، یہ ایسا ہے جیسے کسی مُردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مُردہ کا گوشت کھانے سے مُردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب شخص کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسا کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خِسّت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خسّت و دناءت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہنا کوئی بہادری نہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ظن، تجسس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس کی حرمت اور خسّت و دناءت کو واضح فرمایا، اس کی حکمت یہ ہے کہ کسی کے سامنے اس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگرچہ ایذا رسانی کی وجہ سے حرام ہے مگر اس کی مدافعت وہ آدمی خود بھی کر سکتا ہے اور مدافعت کے ڈر سے ہر ایک جرأت بھی نہیں کرتا اور وہ عام طور پر زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتا، لیکن غیبت کے معاملہ میں کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہوتا، ہر کمتر سے کمتر آدمی بھی بڑے سے بڑے کی غیبت کر سکتا ہے اور چونکہ کوئی مدافعت نہیں ہوتی اس لیے اس کا سلسلہ عموماً طویل ہوتا ہے اور اس میں ابتلاء بھی زیادہ ہے، اس لیے غیبت کی حرمت کو زیادہ مؤکد طور پر بیان فرمایا گیا اور عام مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو غیبت سُنے وہ اپنے غائب بھائی کی طرف سے بشرطِ قدرت و طاقت مدافعت کرے اور اس پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اس کے سننے سے پرہیز کرے، کیونکہ غیبت کا اپنے اختیار اور ارادہ سے سننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

واقعہ:

حضرت میمون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک روز خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک زنگی کا مُردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا ان کو مخاطب کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ، میں

نے کہا کہ اے خدا کے بندے! میں اس کو کیوں کھاؤں تو اس شخص نے کہا کہ اس لیے کہ تو نے فلاں شخص کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے، میں نے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے تو اس کے متعلق کوئی اچھی بری بات کی ہی نہیں، تو اس شخص نے کہا کہ ہاں، لیکن تو نے اس کی غیبت سنی تو ہے اور تو اس پر راضی رہا۔ حضرت میمون رحمۃ اللہ علیہ کا حال اس خواب کے بعد یہ ہو گیا کہ نہ خود کسی کی غبت کرتے اور نہ کسی کو اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔

[معارف القرآن مولانا مفتی محمد شفیعؒ، ج ۸، ص ۱۱۹۔۱۲۲]

غیبت کی قباحت کے متعلق احادیثِ مبارکہ:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ شبِ معراج کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”مجھے لے جایا گیا تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوچ رہے ہیں، میں نے جبریلِ امین علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور ان کی آبروریزی کیا کرتے تھے۔“ [رواہ البغوی]

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”الغیبۃ اشد من الزنا“ یعنی غیبت، زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ کیسے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے، پھر توبہ کر لیتا ہے، تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہے۔“ [رواہ الترمذی و ابوداؤد]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیبت ایسا گناہ ہے جس میں حق اللہ کی بھی مخالفت ہے اور حق العبد بھی ضائع ہوتا ہے، اس لیے جس کی غیبت کی گئی ہے اس سے معاف کرانا ضروری ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ غیبت کی خبر جب تک صاحبِ غیبت کو نہ پہنچے اس وقت تک وہ حق العبد نہیں ہوتی، اس لیے اس سے معافی کی ضرورت نہیں۔ [نقلہ فی الروح عن الحسن و الخیاطی و ابن الصباغ و النووی و ابن الصلاح و الزرکشی و ابن عبدالبر عن ابن المبارک]

لیکن ''بیان القرآن'' میں اس بات کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس صورت میں اگر چہ اس شخص سے معافی مانگنا ضروری نہیں مگر جس شخص کے سامنے یہ غیبت کی تھی اس کے سامنے اپنی تکذیب کرنا یا اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ضروری ہے اور اگر وہ شخص مر گیا ہے یا اس کا پتہ نہیں تو اس کا کفارہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''کفارہ غیبت کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔'' [رواہ البیھقی]

خالد بن معدان رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے بھائی کے کسی گناہ کا، جس سے اس نے توبہ کر لی ہو، ذکر کر کے اس کو عار دلائی تو وہ اپنے مرنے سے پہلے خود اس گناہ کا مرتکب ہوگا۔''

[رواہ الترمذی، ماخوذ از تفسیر مظھری: ج ۱۱، ص ۳۲، ۳۳]

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ صفیہ رضی اللہ عنہا تو ایسی ایسی ہیں (مسدّد راوی کہتے ہیں کہ) یعنی پست قد، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے ایسی بات کہی ہے کہ سمندر کے پانی میں اگر ملا دی جائے تو اسے بھی بگاڑ دے۔''

ایک مرتبہ آپ کے سامنے کسی کی کچھ ایسی ہی باتیں ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اسے پسند نہیں کرتا، خواہ مجھے ایسا کرنے میں کوئی بہت بڑا نفع ہی حاصل ہو۔''

ابن جریر میں ہے کہ ایک عورت، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آئیں، جب وہ جانے لگیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اشارے سے کہا کہ یہ بہت کوتاہ قد ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اس کی غیبت کی ہے۔''

حجۃ الوداع کے خطبہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا خون، مال اور آبرو تم پر ایسے ہی حرام ہے جیسے تمہارے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اور اس شہر میں ہے۔''

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ مسلمان کا مال، اس کی عزت و آبرو اور

اس کا خون مسلمان پر حرام ہے، انسان کی برائی کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر و توہین کرے۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''لوگو! جن کی زبانیں تو ایمان لا چکی ہیں مگر ان کے دل ایماندار نہیں ہوئے، تم مسلمانوں کی غیبت کرنا چھوڑ دو اور ان کے عیبوں کی جستجو نہ کیا کرو، اگر تم ان کے عیوب ڈھونڈو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ عیوب کو ظاہر کر دے گا، یہاں تک کہ تم اپنے گھر میں بھی رسوا ہو جاؤ گے۔''

مسند ابی یعلی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں آپ ﷺ نے پردہ نشیں عورتوں کے کانوں تک بھی اپنی آواز پہنچائی اور اس خطبہ میں مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کعبۃ اللہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''تیری حرمت و عظمت کا کیا کہنا، لیکن تجھ سے زیادہ حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ایمان دار شخص کی ہے۔''

ایک حدیثِ مبارک میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ معراج کی رات میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا، جن میں مرد اور عورت دونوں موجود تھے، کہ فرشتے ان کے پہلوؤں سے گوشت کاٹ رہے ہیں اور پھر اُنہیں اس گوشت کے کھانے پر مجبور کر رہے ہیں اور وہ لوگ اسے چبا رہے ہیں، میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو طعنہ زنی کرتے، غیبت کرتے اور چغل خوری کیا کرتے تھے، انہیں آج زبردستی ان کا گوشت کھلایا جا رہا ہے۔'' [ابن ابی حاتم]

ایک حدیث پاک میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو روزے رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب تک میں نہ کہوں کوئی افطار نہ کرے، شام کے وقت لوگ حاضر ہونے لگے اور آپ ﷺ سے دریافت کرنے لگے، آپ ﷺ انہیں اجازت دیتے اور وہ افطار کرتے جاتے، اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا: حضور ﷺ! دو عورتوں نے روزہ رکھا تھا جو آپ ہی کے متعلقین میں سے ہیں، انہیں بھی آپ ﷺ روزہ افطار

کرنے کی اجازت دے دیں، آپ ﷺ نے اس سے اعراض کرلیا، اس نے دوبارہ عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ روزے سے نہیں ہیں، کیا وہ بھی روزے دار ہوسکتا ہے جو انسانی گوشت کھائے؟ جاؤ! انہیں کہو کہ اگر وہ روزے سے ہیں تو قے کردیں، چنانچہ انہوں نے قے کی تو اس میں جمے ہوئے خون کے لوتھڑے نکلے، اس شخص نے آکر آنحضور ﷺ کو اطلاع دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ اسی حالت میں مرجاتیں تو آگ کا لقمہ بنتیں۔" [مسند ابی داود طیالسی]

دوسری روایت میں ہے کہ اس شخص نے کہا تھا کہ حضور ﷺ! ان دونوں عورتوں کی روزے میں بری حالت ہے، پیاس کے مارے مررہی ہیں اور یہ دوپہر کا وقت تھا، حضور ﷺ خاموش رہے، اس نے دوبارہ عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! وہ تو مرگئی ہوں گی یا تھوڑی دیر میں مرجائیں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ! انہیں بلا لاؤ، جب وہ آئیں تو آپ ﷺ نے دودھ کا مٹکا ایک کے سامنے رکھ کر فرمایا، اس میں قے کرو، اس نے قے کی تو اس میں جما ہوا خون، پیپ وغیرہ نکلی، جس سے آدھا مٹکا بھر گیا، پھر دوسری سے قے کروائی گئی اس میں بھی یہی چیزیں اور گوشت کے ٹکڑے وغیرہ نکلے اور مٹکا بھر گیا، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں دیکھو، حلال روزے رکھے ہوئے تھیں اور حرام کھا رہی تھیں، دونوں بیٹھ کر لوگوں کے گوشت کھانے لگی تھیں (یعنی غیبت کر رہی تھیں)" [مسند احمد]

مسندِ احمد میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ نہایت سڑی ہوئی مردار بو والی ہوا چلی، آپ ﷺ نے فرمایا: جانتے ہو یہ بو کس چیز کی ہے؟ یہ بدبو ان کی ہے جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں" اور ایک روایت میں ہے کہ منافقوں کے ایک گروہ نے مسلمانوں کی غیبت کی ہے یہ اس کی بدبودار ہوا ہے۔

مسند ابی یعلیٰ میں ہے کہ جس نے دنیا میں اپنے بھائی کا گوشت کھایا (یعنی اس کی غیبت کی) قیامت کے دن اس کے سامنے وہ گوشت لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ جیسے اس کی زندگی میں تو نے اس کا گوشت کھایا تھا اب اس مردے کا گوشت بھی کھا، اب

وہ چیخے چلائے گا، ہائے وائے کرے گا اور اسے زبردستی وہ مُردہ گوشت کھانا پڑے گا۔''

مسند احمد میں ہے کہ جو شخص کسی مومن کی مدافعت اور حمایت اس وقت کرے جب کہ کوئی منافق آدمی اس کی مذمت کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو مقرر کر دیتے ہیں جو قیامت کے دن اس کے گوشت کو آتشِ دوزخ سے بچائے گا اور جو شخص کسی مومن کے متعلق کوئی ایسی بات کہے جس سے اس کا مقصد اسے مطعون کرنا ہو تو اسے اللہ تعالیٰ پلِ صراط پر روک لیں گے کہ اس کا بدلہ ہو جائے۔'' [سنن ابی داود]

نیز ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی آبروریزی ایسی جگہ پر کرے جہاں اس کی آبروریزی ہوتی ہو تو اسے بھی اللہ تعالیٰ ایسی جگہ پر رسوا کرے گا جہاں وہ اپنی مدد کا طالب اور خواہش مند ہو اور جو مسلمان ایسی جگہ اپنے بھائی کی حمایت کرے گا اللہ تعالیٰ بھی ایسی جگہ ہی اس کی مدد فرمائیں گے۔'' [سنن ابی داؤد، تفسیر ابن کثیر ج ۵، ص ۱۵۷. ۱۵۹ ملخصاً]

مسئلہ:

بچے اور مجنون اور کافر ذمی کی غیبت بھی حرام ہے، کیونکہ ان کی ایذاء بھی حرام ہے اور جو کافر حربی ہیں اگرچہ ان کی ایذا حرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔

مسئلہ:

غیبت جیسے قول اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارہ سے بھی ہوتی ہے جیسے کسی لنگڑے کی چال بنا کر چلنا جس سے اس کی تحقیر ہوتی ہو۔

مسئلہ:

بعض روایات سے ثابت ہے کہ اس آیت مبارکہ میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے یہ مخصوص البعض ہے۔ یعنی بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کی برائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ ضرورت اور مصلحت شرعاً معتبر ہو، جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو

ظلم کو دفع کرنے پر قدرت رکھتا ہو یا کسی کی اولاد بیوی کی شکایت اس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو ان کی اصلاح کر سکے، یا کسی واقعہ کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے لیے صورتِ واقعہ کا اظہار یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دنیوی شر سے بچانے کے لیے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کے لیے اس کا حال ذکر کرنا، یا جو شخص سب کے سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے، اس کے اعمالِ بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں، مگر بلاضرورت اپنے اوقات ضائع کرنے کی وجہ سے مکروہ ہے۔[دیکھیے بیان القرآن بحوالہ روح المعانی]

ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ کسی کی برائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اس کی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت اور مجبوری سے ذکر کیا گیا ہو۔[معارف القرآن ج ۸، ص ۱۲۳]

☆☆☆

(۶۶)

عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب کا تذکرہ

آیتِ کریمہ:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ ۖ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ۲۹]

ترجمہ

''محمدؐ، اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں، تم ان کو دیکھو گے کہ (کبھی) رکوع کر رہے ہیں، کبھی سجدے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں، ان کے یہ (اعلیٰ اوصاف) توریت میں (مذکور) ہیں اور ان کے یہ حالات انجیل میں (بھی) ہیں، جیسے کھیتی کہ (پہلے) اس نے اپنی سوئی باہر نکالی، پھر اس کو قوی کیا، پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر وہ اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تا کہ ان

سے کافروں کو جلائے۔''

تشریح

پورے قرآن پاک میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام مبارک لینے کی بجائے عموماً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ اوصاف والقاب کے ساتھ کیا گیا ہے، بخلاف دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے کہ ان کے نام کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ پورے قرآن میں صرف چار جگہ آپ کا نامِ مبارک ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)'' ذکر فرمایا ہے، جہاں اس نام کے ذکر ہی میں کوئی مصلحت موجود تھی، اس مقام پر مصلحت یہ تھی کہ حدیبیہ کے صلح نامہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد رسول اللہ لکھا تو کفارِ قریش نے اس کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے پر اصرار کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکمِ الٰہی اس کو منظور کر لینا قبول کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس مقام پر خصوصیت سے آپ کے نامِ مبارک کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ قرآنِ پاک میں لا کر اس کو دائمی بنا دیا جو تا قیامت اسی طرح لکھا پڑھا جائے گا۔

''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ الخ'' یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب کا بیان ہے، اگرچہ اس کے پہلے مخاطب حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شریک تھے، لیکن الفاظ کے عموم میں سبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور معیت کا شرف سب کو حاصل ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا بیان فرما کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف و فضائل اور خاص علامات کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرمایا ہے، اس میں ان کے اس سخت امتحان کا انعام بھی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت لیا گیا تھا کہ ان کے قلبی جذبات و یقین کے خلاف صلح ہو کر دخولِ مکہ وغیرہ کے بغیر ہی ناکام واپسی کے باوجود ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے، اور انہوں نے بے مثال قوتِ ایمانی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ثبوت دیا، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل اور علامت کی تفصیل بیان فرمانے میں یہ حکمت

بھی ہوسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی اور رسول تو مبعوث ہونے والا نہیں تھا، آپ نے اپنے بعد امت کے لیے کتاب اللہ کے ساتھ اپنے اصحاب ہی کو بطورِ نمونہ کے چھوڑا ہے اوران کی اتباع اور پیروی کے احکام دیئے ہیں، اس لیے قرآن نے بھی ان کے کچھ فضائل اور علامات کا بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کے اتباع کی ترغیب اور تاکید فرما دی ہے۔

اس مقام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سب سے پہلا وصف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ کفار کے مقابلہ میں سخت ہونا ان کا ہر موقع پر ثابت ہوتا رہا ہے کہ نسبی رشتے ناطے سب اسلام پر قربان کر دیئے اور حدیبیہ کے موقع پر خصوصیت سے اس کا اظہار ہوا۔ اور آپس میں مہربان اور ایثار پیشہ ہونا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس وقت خصوصیت سے ظاہر ہوا جب کہ مہاجرین وانصار میں مؤاخات کا سلسلہ قائم ہوا، اور انصار نے اپنی تمام چیزوں میں مہاجرین کو شریک کرنے کی دعوت دی۔ قرآن نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس وصف کو پہلے بیان فرمایا، کیونکہ درحقیقت اس کا حاصل یہ ہے کہ اُن کی دوستی اور دشمنی، محبت اور عداوت کوئی چیز اپنے نفس کے لیے نہیں، بلکہ سب اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایمانِ کامل کا اعلیٰ اور ارفع مقام ومرتبہ ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ "**من احبّ للّٰہ وابغض للّٰہ فقد استکمل ایمانہ**" یعنی جو شخص اپنی محبت اور بغض وعداوت دونوں کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔'' اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کفار کے مقابلہ پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہ کرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں ان کو اپنے رشتے ناطے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں ہوتے اور جہاں تک ان کے ساتھ رحم وکرم کے معاملہ کا تعلق ہے وہ تو خود قرآن نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ **لَا یَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ** (سے لے کر) **اَنۡ تَبَرُّوۡا وَ تُقۡسِطُوۡا**

اِلَيۡهِمۡ (تک) یعنی جو کفار، مسلمانوں کے درپے آزار اور مقاتلہ پر نہیں، اُن کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں فرماتے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بے شمار واقعات ہیں جن میں ضعیف اور مجبور یا ضرورت مند کفار کے ساتھ احسان و کرم کے معاملات کیے گئے ہیں اور ان کے معاملہ میں عدل و انصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے۔ عین میدانِ کارزار میں بھی عدل و انصاف کے خلاف کوئی کارروائی جائز نہیں ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کا عام حال یہ ہے کہ وہ رکوع و سجدے اور نماز میں مشغول رہتے ہیں، ان کو دیکھنے والے اکثر ان کو اسی کام میں مشغول پاتے ہیں۔ پہلا وصف کمالِ ایمان کی علامت تھی اور دوسرا وصف کمالِ عمل کا بیان ہے، کیونکہ اعمال میں سب سے افضل نماز ہے۔

"سِيۡمَاهُمۡ فِىۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ" یعنی نماز ان کا وظیفۂ زندگی بن گیا ہے کہ نماز اور سجدے کے خاص آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں، ان آثار سے مراد وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع وخضوع سے ہر متقی، عبادت گزار بندے کے چہرے پر نظر آتے ہیں، پیشانی میں سجدہ کا جو نشان پڑ جاتا ہے وہ مراد نہیں ہے۔ خصوصاً نمازِ تہجد کا یہ اثر بہت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**من كثر صلوته بالليل حسن و جهه بالنهار**" یعنی جو شخص رات میں نماز کی کثرت کرتا ہے دن میں اس کا چہرہ حسین پُر نور نظر آتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد نمازیوں کے چہروں کا وہ نور ہے جو قیامت کے دن نمایاں ہوگا۔

"ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِى التَّوۡرٰىةِ ۛ ۖ وَمَثَلُهُمۡ فِى الۡاِنۡجِيۡلِ ۛ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو علامت اوپر بیان کی گئی ہے کہ کفار کے مقابلہ میں سخت ہیں اور سجدوں اور نمازوں کا نور ان کی پیشانیوں سے نمایاں ہوتا ہے، اس آیت

کریمہ میں فرمایا کہ ان کی یہی مثال تورات میں بیان کی گئی ہے، پھر فرمایا کہ انجیل میں ان کی ایک اور مثال یہ ذکر کی گئی ہے کہ وہ ایسے ہیں جیسے کوئی کاشتکار زمین میں بیج اُگائے تو پہلے وہ ایک کمزور سی سُوئی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، پھر اس میں شاخیں نکلتی ہیں، پھر وہ اور قوی ہوتا ہے، پھر اس کا مضبوط تنا بن جاتا ہے، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شروع میں بہت کم تھے، ایک وقت ایسا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا صرف تین مسلمان تھے، مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، عورتوں میں حضرت خدیجہؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ، پھر رفتہ رفتہ ان کی قوت بڑھتی رہی، یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حج میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب بتلائی گئی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں تین احتمال ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ "فِي التَّوْرَاةِ" پر وقف کیا جائے اور پچھلی مثال یعنی چہروں کا نور، یہ علامت تورات کے حوالہ سے بیان ہوئی۔ آگے "مَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ" پر وقف نہ کریں بلکہ ملا کر پڑھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال انجیل میں اُس کھیتی یا درخت کی ہے جو شروع میں نہایت ضعیف ہوتا ہے، پھر رفتہ رفتہ قوی تناور ہو جاتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ "فِي التَّوْرَاةِ" پر وقف نہ کیا جائے بلکہ "فِي الْإِنْجِيلِ" پر وقف کیا جائے تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ سابقہ نشانی چہروں کے نور کی تورات میں بھی ہے اور انجیل میں بھی۔ اور آگے "كَزَرْعٍ اَخْرَجَ" کی مثال کو ایک الگ مثال قرار دیا جائے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ "فِي التَّوْرَاةِ" پر کلام ختم ہو اور نہ "فِي الْإِنْجِيلِ" پر اور لفظ "ذٰلِكَ" اگلی مثال کی طرف اشارہ ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تورات وانجیل دونوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال کھیتی کی دی گئی ہے۔ اگر اس زمانہ میں تورات وانجیل اپنی اصلی حالت میں ہوتیں تو ان کو دیکھ کر مرادِ قرآنی متعین ہو جاتی، لیکن ان میں تحریفات کا سلسلہ بے شمار رہا ہے، اس لیے کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہو سکتا، مگر اکثر مفسرین کرام پہلے احتمال کو راجح قرار دیتے ہیں جس میں پہلی مثال تورات میں اور دوسری

انجیل میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ مثال انجیل میں ہے کہ شروع میں قلیل تعداد میں ہوں گے، پھر بڑھیں گے اور قوی ہوں گے، جیسا کہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کی یہ مثال انجیل میں لکھی ہوئی ہے کہ ''ایک قوم ایسی نکلے گی جو کھیتی کی طرح بڑھے گی اور وہ نیک کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع کرے گی۔'' [تفسیر مظھری]

موجودہ دور کی تورات وانجیل میں بھی بے شمار تحریفات کے باوجود اس کی پیشین گوئی کے الفاظ موجود ہیں، چنانچہ تورات، باب استثناء ۲۳۔۱ تا ۳ کے یہ الفاظ ہیں:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی، وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں تیری بات مانیں گے۔''

فتحِ مکہ کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد دس ہزار تھی، جو فاران سے طلوع ہونے والے اس نورانی پیکر کے ساتھ شہرِ خلیل میں داخل ہوئے تھے۔ ''اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی'' کے لفظ سے ''اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ'' کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ''وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا'' کے لفظ سے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کا مضمون سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل مع دیگر حوالوں کے اظہار الحق جلد سوئم باب ششم ص ۲۵۶ میں ہے۔

یہ کتاب عیسائیت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پادری فنڈر کے مقابلہ پر تحریر فرمائی۔ اس کتاب میں انجیل کی تمثیل کا اس طرح ذکر ہے۔ انجیل متی باب ۱۳ آیت ۳۱ میں یہ الفاظ ہیں: اس نے ایک اور تمثیل ان کے

سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ اور انجیل مرقس ۴:۲۶ کے الفاظ یہ ہیں جو الفاظِ قرآنی کے زیادہ قریب ہیں:

''اس نے کہا کہ خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے پتی، پھر بالیں پھر بالوں میں تیار دانے پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے، کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا۔'' [اظہار الحق جلد ۳ ص ۳۱۰ باب ششم]

آسمان کی بادشاہی سے مراد نبی آخر الزمان کا انجیل کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے۔

''لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان صفاتِ کمال کے ساتھ مزین فرمایا اور ان کو ضعف کے بعد قوت اور قلت کے بعد کثرت عطا فرمائی، یہ سب کچھ اس لیے ہوا تا کہ ان کو دیکھ کر کافروں کو غصہ آئے اور وہ حسد کی آگ میں جلیں۔

حضرت ابوعروہ زبیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر تھے، ایک شخص نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص میں کچھ کلمات کہے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ آیت پوری تلاوت کر کے جب اس لفظ ''لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ'' پر پہنچے تو فرمایا کہ جس شخص کے دل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے ساتھ غیظ و بغض ہو تو اس آیت کی وعید اس کو ملے گی۔ [تفسیر قرطبی]

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ وہ کافر ہو جائے گا مگر یہ فرمایا کہ یہ وعید اس کو پہنچے گی، مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں جیسا کام کرنے والا ہو جائے گا۔

[معارف القرآن ج ۸، ص ۹۱.۹۵]

اللہ تعالیٰ نے دونوں بیانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت بیان فرمائی ہے،

پہلی تمثیل میں صلحائے امت اور تمام اولیائے ملت بھی شریک ہیں لیکن دوسری تمثیل صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خصوصی اوصاف و علامات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا مبعوث فرمایا، جیسے کاشتکار بیج زمین میں بوتا ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت بلالؓ ایمان لائے، ان کے بعد حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ، حضرت سعیدؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہم اور دیگر حضرات مسلمان ہوئے، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ چالیسویں نمبر پر ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے، شروع میں اسلام بے وطن تھا، اسلام کو مٹانے کے لیے ہر طرف سے دشمن ٹوٹ پڑے، اگر اللہ کی نصرت وحمایت نہ ہوتی تو ابتدائی پودے کی بالیدگی ہی نہ ہوتی، لیکن مہاجرین وانصار کی کوششوں سے اللہ تعالیٰ نے اس پودے کو مضبوط اور قوی کر دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس نونہال پودے کو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں اپنے خون سے سینچا اور یہ سینچائی وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی مسلسل جاری رہی، بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں سینچائی برابر مسلسل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اسلام کا پودا قوی، مستحکم اور اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور تمام مذاہب پر غالب آگیا اور کسی کی حمایت کا محتاج نہ رہا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت (کبھی) گمراہی پر اتفاق نہیں کرے گی۔''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم کو قائم رکھے گا، کسی کا مدد نہ کرنا اور کسی کا مخالفت کرنا اس کو ضرر نہ پہنچا سکے گا۔''

اسی خصوصیت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میدانِ فضیلت میں سب سے آگے بڑھ گئے، کسی بڑے سے بڑے آدمی کو ان کے کسی مقام یا مرتبہ تک رسائی حاصل نہ ہوسکی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے ساتھیوں کو برا بھلا نہ کہو، کیونکہ تم میں اگر کوئی شخص (بالفرض) اُحد پہاڑ کے برابر سونا راہِ خدا میں صرف کرے گا تو صحابی کے ایک سیر

بلکہ آدھا سیر سونا راہِ خدا میں صرف کرنے کے برابر نہ ہوگا۔'' [صحیحین]

نیز حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میرا کوئی صحابی کسی سرزمین میں مرجائے گا تو قیامت کے روز اس زمین کے رہنے والوں کو (جنت کی طرف لے جانے والا) قائد اور نور بنا کر اس کو اٹھایا جائے گا۔'' [رواہ الترمذی عن بریدۃؓ]

بعض علماء کے نزدیک کھیتی (کے پودے) سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور اس پودے کی سوئیاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے مومن لوگ ہیں۔

مبارک بن فضالہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''محمدؐ''، اللہ کے رسول ہیں، اور ''اَلَّذِیْنَ مَعَهٗ'' ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ''اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ'' عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں اور ''رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ'' عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں، اور ''تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا'' علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ہیں اور ''یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا'' باقی عشرہ مبشرہ (سعدؓ، سعیدؓ، ابوعبیدہؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ) ہیں۔ یعنی جن اوصاف کا ذکر آیتِ کریمہ کے مذکورہ کلمات میں کیا گیا ہے ان کے حاملین کے امام عشرہ مبشرہ ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بیج کی کاشت کی، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی ابتدائی کونپل نکالی، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس کو قوت پہنچائی، عثمان رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کی وجہ سے اس میں موٹائی آ گئی اور علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی وجہ سے وہ پودا سیدھا اپنے تنا پر کھڑا ہو گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار سے اسلام میں استقامت آ گئی۔

تفسیر مدارک التنزیل میں ہے کہ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے اسلام کے بیج نے اپنی سوئی باہر نکالی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسلمان ہونے کے بعد فرمایا: ''آئندہ کافروں کے ڈر سے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھپ کر نہیں کی جائے گی۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف جس

کے دل میں غیظ اور جلن ہو وہ اس آیت (لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ) کا مصداق ہے۔

حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، خدا کا خوف کرو، خدا کا خوف کرو، میرے بعد ان کو ہدف (مذمّت) نہ بنانا، جو ان سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت رکھنے کی وجہ سے ان سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ حقیقت میں مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھے گا، جس نے ان کو دکھ پہنچایا اس نے حقیقت میں مجھ کو دکھ پہنچایا اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی اور جس نے اللہ کو اذیت دی تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو پکڑے گا۔''

(ترمذی) [تفسیر مظھری ج ۱۰، ص ۳۷۶، ۳۷۷]

☆☆☆

(٦٧)

﴿علمِ الٰہی کی وسعت اور ہمہ گیری﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [قٓ: ١٦]

ترجمہ

’’اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور اس کے اتنے قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ۔‘‘

تشریح

سابقہ آیات میں منکرینِ حشر ونشر کے شبہات کا ازالہ اس طرح کیا تھا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے علم کو اپنے علم وبصیرت پر قیاس کر رکھا ہے، اس لیے یہ اشکال ہے کہ مُردے کے اجزاء مٹی ہو کر دنیا میں بکھرنے کے بعد ان کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہے، ہمارے لیے ان سب کو جب چاہیں، جمع کر دینا کیا مشکل ہے، اب ان آیات میں بھی علمِ الٰہی کی وسعت اور ہمہ گیری کا بیان ہے کہ انسان کے منتشر اجزاء کا علم ہونے سے بھی زیادہ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم ہر انسان کے دل میں آنے والے خیالات کو بھی ہر وقت اور ہر حال میں جانتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انسان کے اتنے قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن، جس پر اس کی زندگی کا دارو مدار ہے، وہ بھی اتنی قریب نہیں، اس لیے ہم اس کے حالات کو خود اس سے بھی زیادہ جاننے والے ہیں۔ ’’نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ‘‘ کا اکثر مفسرین کرام نے

یہی مطلب بیان کیا ہے کہ قُرب سے قربِ علمی اور احاطہء علمی مراد ہے۔ قربِ مسافت مراد نہیں ہے۔ لفظ ''وَرِیْد'' عربی زبان میں ہر جاندار کی ان رگوں کو کہتے ہیں جن سے خون کا سیلان تمام بدن میں ہوتا ہے۔ طبی اصطلاح میں یہ دو قسم کی رگیں ہیں، ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہے اور خالص خون سارے بدن میں پہنچاتی ہے۔ طبی اصطلاح کے مطابق صرف ان ہی رگوں کو ''وَرِید'' اور اس کی جمع کو ''اَوْرِدَةٌ'' کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ رگیں جو حیوان کے قلب سے نکلتی ہیں اور خون کی وہ لطیف بھاپ جس کو طبی اصطلاح میں روح کہا جاتا ہے، وہ اسی طرح تمام انسانی بدن میں خون پھیلاتی اور پہنچاتی ہیں ان کو شریان اور شرائین کہا جاتا ہے۔ پہلی قسم کی رگیں موٹی اور دوسری باریک ہوتی ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں یہ ضروری نہیں کہ ''وَرِیْد'' کا لفظ طبی اصطلاح کے مطابق اس رگ کے لیے لیا جائے جو جگر سے نکلتی ہے، بلکہ قلب سے نکلنے والی رگ کو بھی لغت کے اعتبار سے ''وَرِیْد'' کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کا خون ہی دوران کرتا ہے اور اس مقام پر چونکہ مقصودِ آیت انسان کے قلبی خیالات اور احوال سے مطلع ہونا ہے، اس لیے وہ زیادہ مناسب ہے۔ بہر حال! ''وَرِیْد'' خواہ طبی اصطلاح کے مطابق جگر سے نکلنے والی رگ کے معنی میں ہو یا قلب سے نکلنے والی شریان کے معنی میں، بہر دو صورت جاندار کی زندگی پر موقوف ہے۔ یہ رگیں کاٹ دی جائیں تو جاندار کی روح نکل جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس چیز پر انسانی زندگی موقوف ہے ہم اس چیز سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں، یعنی اس کی ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔

صوفیائے کرام کے نزدیک یہاں قُرب سے صرف قربِ علمی اور احاطہء علمی مراد نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال مراد ہے، جس کی حقیقت اور کیفیت کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی، مگر یہ قرب و اتصال بلا کیف موجود ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات اور احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ'' یعنی سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔'' نیز واقعہء ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اَللّٰهُ مَعَنَا'' یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی

اسرائیل سے فرمایا: ''اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ'' یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے۔'' اور حدیث میں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہو۔''

اسی طرح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میرا بندہ میرے ساتھ نفلی عبادات کے ذریعہ تقرب حاصل کرتا رہتا ہے۔'' یہ قرب اور تقرب جو عبادات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے یہ صرف مومن کے لیے خاص ہے اور ایسے مومنین اولیاء اللہ ہوتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ تقرب حاصل ہو، یہ قرب و اتصال اس قرب کے علاوہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو ہر انسان مومن و کافر کی جان کے ساتھ یکساں حاصل ہے۔ غرض مذکورہ آیات و احادیث اس پر شاہد ہیں کہ انسان کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتصال حاصل ہے گو ہم اس کی کیفیت اور حقیقت کا ادراک نہ کر سکیں۔ یہ قرب و اتصال آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ فراستِ ایمانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

تفسیر مظہری میں اسی قرب و اتصال کو اس آیتِ کریمہ کا مفہوم قرار دیا گیا ہے اور جمہور مفسرین کا قول پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اتصال اور قرب سے مراد اتصالِ علمی اور احاطہ علمی ہے اور امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی ہے کہ آیت میں لفظ ''نَحْنُ'' سے خود اللہ تعالیٰ کی ذات مراد نہیں ہے، بلکہ اس کے فرشتے مراد ہیں، جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، وہ انسان کی جان سے اتنے باخبر ہوتے ہیں کہ خود انسان بھی اپنی جان سے اتنا باخبر نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم [معارف القرآن ج ۸، ص ۱۴۰، ۱۴۱]

☆☆☆

(۶۸)

﴿قیامت کا ہولناک منظر﴾

آیتِ کریمہ:

﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝ خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ۝ مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ﴾

[القمر: ۶، ۷، ۸]

ترجمہ

''سو آپ ﷺ ان سے رخ پھیر لیجیے، جس دن ایک بلانے والا فرشتہ ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا، ان کی آنکھیں مارے ذلت کے جھکی ہوئی ہوں گی، قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے جیسے ٹڈی پھیل جاتی ہے، بلانے والے کی آواز کی طرف دوڑے چلے جارہے ہوں گے کافر کہتے ہوں گے یہ دن بڑا سخت ہے۔''

تشریح

''يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ'' میں ''يَوْمَ'' سے مراد ہے قیامت کا دن، اور الداع (پکارنے والے) سے مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ [روح المعانی] جو صخرہ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر پکاریں گے کہ اے کھوکھلی بوسیدہ ہڈیو! اے پارہ پارہ کھالو اور اے ٹوٹے ہوئے بالو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ آخری فیصلہ کے لیے جمع ہو جاؤ۔''

[رواہ ابن عساکر عن زید بن جابر الشافعیؒ]

''شَيْءٍ نُّكُرٍ'' یعنی اتنی بڑی چیز کہ اس کی مثل معلوم نہ ہوا نہائی مکروہ ہونے کی

وجہ سے لوگ اس کو جاننا بھی گوارا نہ کریں۔ ''یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ'' یعنی قبروں سے نکلیں گے ٹڈیوں کی طرح کثیر اور منتشر ہوں گے اور اتنے ڈٹ (غول) لگے ہوں گے کہ لہروں کی طرح ایک دوسرے میں گھسا پڑتا ہوگا۔

''مُهْطِعِيْنَ'' پکارنے والے کی آواز کی طرف تیزی کے ساتھ جائیں گے یا اس سے مراد ہے داعی کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہوں گے۔ آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جس دن حضرات اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے اور سب کو میدانِ حشر میں قیامت کے ہولناک اور دہشت انگیز منظر کی طرف بلائیں گے تو سب لوگ قبروں سے نکل آئیں گے، دہشت وخوف سے ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ ٹڈی دل کی طرح زمین پر پھیلے ہوں گے اور بلانے والے کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔ کفار ومشرکین اس وقت پکار اٹھیں گے کہ آج کا دن نہایت ہی دشوار اور کٹھن ہے، کیونکہ انہیں اپنا انجام نظر آ جائے گا۔ قیامت کا دن بلاشبہ کفار کے لیے نہایت شدید ہوگا لیکن مومنین اس دن کی شدت سے محفوظ ہوں گے، اگرچہ منظر قیامت کی ہولناکی سے وقتی گھبراہٹ ان پر بھی طاری ہو جائے گی۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ دن کافروں پر سخت ہوگا، مومنین پر نہیں۔

[خازن ج ۶، ص ۲۷۴]

☆☆☆

(۶۹)

﴿دنیا کی زندگی محض سامانِ فریب ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِیْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾

[الحدید: ۲۰]

ترجمہ

’’تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو ولعب اور ایک زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال واولاد کی کثرت پر بعض کا بعض سے مقابلہ کرنا ہے، جیسے بارش کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی لگتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے کہ تم کو زرد دکھائی دیتی ہے پھر وہ چُورا چُورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذابِ شدید ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی (بھی) ہے اور دنیوی زندگی محض سامانِ فریب ہے۔‘‘

تشریح

سابقہ آیات میں اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے حالات کا ذکر تھا، جو آخرت میں

پیش آئے گا اور دائمی ہوگا اور آخرت کی نعمتوں سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہونے کا بڑا سبب انسان کے لیے دنیا کی فانی لذتوں اور ان میں منہمک ہو کر آخرت سے غافل ہونا ہے، اس لیے ان آیات میں دنیائے فانی کا ناقابلِ اعتماد ہونا بیان کیا گیا ہے۔ پہلے آغازِ عمر سے آخر تک جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اور جس میں دنیا دار منہمک اور مشغول اور اس پر خوش رہتے ہیں، اس کا بیان ترتیب کے ساتھ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کا خلاصہ بہ ترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لَعِب پھر لَھْو، پھر زینت، پھر تفاخر پھر مال و اولاد کی کثرت پر فخر و ناز۔

لعب وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیشِ نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں اور لَھو وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح اور دل بہلانا اور وقت گزاری کا مشغلہ ہوتا ہے، ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہو جاتا ہے، جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند، شناوری، یا نشانہ بازی وغیرہ۔ حدیث میں نشانہ بازی اور تیراکی کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے۔

زینتِ بدن اور لباس وغیرہ کی معروف ہے، ہر انسان اس دور سے گزرتا ہے کہ عمر کا بالکل ابتدائی حصہ تو خالص کھیل یعنی لعب میں گزرتا ہے، اس کے بعد لہو شروع ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن بدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے، اس کے بعد ہمعصروں اور ہمعمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان پر جتنے دور اس ترتیب سے آتے ہیں غور کرو تو ہر دور میں وہ اپنے اسی حال پر قانع اور اسی کو سب سے بہتر جانتا ہے، جب ایک دور سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو سابقہ دور کی کمزوری اور لغویت سامنے آجاتی ہے۔ بچے ابتدائی دور میں جن کھیلوں کو اپنا سرمایہء زندگی اور سب سے بڑی دولت جانتے ہیں، کوئی ان سے چھین لے تو ان کو ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بڑے آدمی کا مال و اسباب اور کوٹھی بنگلہ چھین لیا جائے، لیکن اس دور سے آگے بڑھنے کے بعد اس کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے اس

وقت مقصودِ زندگی بنایا ہوا تھا وہ کچھ نہیں تھیں، سب خرافات تھیں، بچپن میں لعب، پھر لہو میں مشغولیت رہی، جوانی میں زینت اور تفاخر کا مشغلہ ایک مقصد بنا رہا، بڑھاپا آیا، اب مشغلہ مال واولاد کی کثرت کا ہو گیا کہ اپنے مال و دولت کے اعداد وشمار اور اولاد ونسل کی زیادتی پر خوش ہوتا رہے، ان کو گنتا گناتا رہے، مگر جیسے جوانی کے زمانہ میں بچپن کی حرکتیں لغو معلوم ہونے لگی تھیں، بڑھاپے میں پہنچ کر جوانی کی حرکتیں لغو اور نا قابلِ التفات نظر آنے لگیں، اب بڑے میاں کی آخری منزل بڑھاپا ہے، اس میں مال کی بہتات، اولاد کی کثرت وقوت اور ان کے جاہ ومنصب پر فخر، سرمایۂ زندگی اور مقصودِ اعظم بنا ہوا ہے، قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ یہ حال بھی گزر جانے والا ہے اور فانی اور ناپائیدار ہے، اگلا دور برزخ پھر قیامت کا ہے اس کی فکر کرو کہ وہی اصل ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس ترتیب کے ساتھ ان سب مشاغل اور دنیوی مقاصد کا زوال پذیر، ناقص، نا قابلِ اعتماد ہونا بیان فرمایا اور اس کو ایک کھیتی کی مثال سے واضح فرمایا: ”کَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ، الخ“: غَيْث کے معنی بارش کے ہیں، اور لفظ کفار جو مومنین کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اس کے یہ معنی تو معروف ومشہور ہیں، اس کے ایک دوسرے لغوی معنی کاشتکار کے بھی آتے ہیں۔ اس آیت میں بعض حضرات نے دوسرے معنی مراد لیے ہیں، اور آیت کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ جس طرح بارش سے کھیتی اور طرح طرح کی نباتات اُگتی ہیں اور جب وہ ہری بھری ہوتی ہیں تو کاشتکار ان سے خوش ہوتا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے لفظِ کفار کو اس مقام پر بھی اپنے معروف معنی میں لیا ہے کہ کافر لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں، اس پر جو یہ اشکال ہے کہ کھیتی ہری بھری دیکھ کر خوش ہونا تو کافر کے ساتھ مخصوص نہیں، مسلمان بھی اس سے خوش ہوتا ہے؟ اس کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مومن کی خوشی اور کافر کی خوشی میں بڑا فرق ہے، مومن خوش ہوتا ہے تو اس کی فکر کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے، وہ یقین کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی قدرت وحکمت اور رحمت کا نتیجہ ہے، وہ اس چیز کو زندگی کا مقصود نہیں بناتا، پھر اس خوشی کے ساتھ اس کو

آخرت کی فکر بھی ہر وقت دامن گیر رہتی ہے، اس لیے جو مومن ایمان کے تقاضہ کو پورا کرتا ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی دولت پر بھی وہ ایسا خوش اور مگن اور مست نہیں ہوتا جیسا کافر ہوتا ہے، اس لیے یہاں خوشی کا اظہار کفار کی طرف منسوب ہے۔ آگے اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کھیتی اور دوسری نباتات پھول پھلواریاں جب ہری بھری ہوتی ہیں، تو سب دیکھنے والے خصوصاً کفار بڑے خوش اور مگن نظر آتے ہیں، مگر آخر کار پھر وہ خشک ہونا شروع ہوتا ہے، پہلے زرد پیلی پڑ جاتی ہے، پھر بالکل خشک ہو کر چُورا چُورا ہو جاتی ہے، یہی مثال انسان کی ہے کہ شروع میں تر و تازہ حسین خوبصورت ہوتا ہے، بچپن سے جوانی تک کے مراحل اسی حال میں طے کرتا ہے، مگر آخر کار بڑھاپا آجاتا ہے جو آہستہ آہستہ بدن کی تازگی اور حسن و جمال سب ختم کر دیتا ہے اور بالآخر مر کر مٹی ہو جاتا ہے، دنیا کی بے ثباتی اور زوال پذیر ہونے کو بیان فرما کر پھر اصل مقصود آخرت کی فکر کی طرف توجہ دلانے کے لیے آخرت کا حال ذکر فرمایا: "وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ" یعنی آخرت میں انسان ان دو حالوں میں سے کسی ایک میں ضرور پہنچے گا، ایک حال کفار کا ہے کہ ان کے لیے عذابِ شدید ہے، دوسرا حال مومنین کا ہے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے۔

یہاں عذاب کا ذکر پہلے کیا گیا، کیونکہ دنیا میں مست و مغرور ہونا، جو پہلی آیات میں مذکور ہے، اس کا نتیجہ بھی عذابِ شدید ہے اور عذابِ شدید کے مقابلہ میں دو چیزیں ارشاد فرمائیں، مغفرت اور رضوان۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گناہوں کی معافی ایک نعمت ہے، جس کے نتیجہ میں آدمی عذاب سے بچ جاتا ہے مگر یہاں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عذاب سے بچ کر پھر جنت کی دائمی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے جس کا سبب رضوان یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو مختصر لفظوں میں بیان فرمایا: "وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" یعنی ان سب باتوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد ایک عقلمند انسان کے لیے

اس کے سوا کوئی نتیجہ دنیا کے بارے میں نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے، اصلی سرمایہ نہیں جو آڑے وقت میں کام آسکے۔ [معارف القرآن ج ۸، ص ۳۱۴ تا ص ۳۱۶]

بہرحال! جو شخص دنیا کی زندگی کو عیش وطرب سے گزار دے اور آخرت سے غافل ہو جائے اس کے لیے دنیا فریب کا سامان ہے اور اگر حیاتِ دنیا میں آخرت کے لیے تیاری کرتا رہا تو یہ زندگی ایک بہترین زندگی تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گی۔

[خازن ج ۷، ص ۳۶]

(۷۰)

﴿عداوتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برا انجام﴾

آیتِ کریمہ:

﴿كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَ بَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [الحشر: ۱۵]

ترجمہ

''ان لوگوں کی سی مثال ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے ہوئے ہیں کہ وہ (دنیا میں بھی) اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے اور (آخرت میں بھی) ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔''

تشریح

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ'' سے مراد وہ مشرکین ہیں جو میدانِ بدر میں مسلمانوں سے لڑے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے بنو قینقاع کے یہودی مراد ہیں۔

بنو قینقاع حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے قبیلہ والے تھے، انہوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول یا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ وغیرہ سے معاہدہ کر رکھا تھا، یہ لوگ سناری کا کام کرتے تھے اور قومِ یہود میں سب سے زیادہ بہادر تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی سکونت کو چھوڑ کر مدینہ میں رونق افروز ہوئے تو تمام یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک معاہدہ کر لیا اور عہد نامہ لکھ دیا گیا اور جو لوگ یہودیوں کے یا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف تھے ان کو بھی معاہدہ نامہ کے اندر اسی فریق سے ملحق کر دیا گیا جس کے وہ حلیف بنے، اس معاہدہ میں متعدد دفعات تھیں، ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر کسی فریق کا کوئی دشمن ہو تو اس

فریق کے خلاف اس کے دشمن کی مدد فریقِ ثانی نہیں کرے گا، جب بدر کی لڑائی کفارِ مکہ سے ہوئی تو بنو قینقاع نے سب سے پہلے عہد شکنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کی، علی الاعلان باغی ہو گئے اور اندرونی عداوت کے اظہار پر اتر آئے، ان ہی حالات میں ایک مسلمان بدوی عورت قینقاع کے بازار میں آئی اور ایک سنار کے پاس کسی زیور کے خریدنے کے لیے بیٹھی، لوگوں نے اس کا چہرہ بے نقاب کرنا چاہا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، سنار نے پیچھے سے اس کے کپڑے کا ایک کونہ کسی کانٹے میں الجھا دیا، عورت کو پتہ نہیں چلا، جب وہ اٹھی تو اس کا ستر کھل گیا، لوگ ہنسنے لگے، وہ چیخ پڑی، یہ دیکھ کر ایک مسلمان نے سنار پر حملہ کر دیا اور اس کو قتل کر دیا، سنار یہودی تھا، یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کیا ہوا معاہدہ پسِ پشت ڈال دیا، شہید مسلمان کے لواحقین نے مسلمانوں کو پکارا، مسلمان غضبناک ہو گئے، اس طرح مسلمانوں اور بنو قینقاع کے یہودیوں میں فساد پیدا ہو گیا، اس پر یہ آیت "وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ" نازل ہوئی۔

بنو قینقاع کی جلاوطنی

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بنو قینقاع سے عہد شکنی کا اندیشہ ہے، چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بنو قینقاع کی طرف روانہ ہو گئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کو جھنڈا سپرد کیا، مدینہ میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا، یہودی قلعہ بند ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پندرہ روز تک ان کا سخت ترین محاصرہ کیے رکھا، آخر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے دلوں میں رُعب ڈال دیا اور وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے مطابق قلعہ سے اتر آئے اور شرط یہ رکھی کہ ان کا سارا مال تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہو جائے گا، لیکن ان کے اہل وعیال ان ہی کے رہیں گے (یعنی ان کو غلام باندی نہیں بنایا جائے گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی مشکیں باندھنے کا حکم دے دیا اور اس کام کو منذر بن قرامہ سلمی کے سپرد کیا، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرا مقصد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، میں ان کافروں کے معاہدے سے دست بردار ہوتا ہوں، یہ دیکھ کر عبداللہ بن اُبی بن سلول نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا اور یہ اس وقت عرض کیا جب اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہودیوں پر قابو دے دیا، کہنے لگا کہ محمد! میرے دوستوں کے معاملہ میں مجھ پر احسان کیجیے (ان کو معاف کر دیجیے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، عبداللہ بن اُبی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ارے مجھے چھوڑ، تیرا ناس ہو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک پر غضب کے آثار لوگوں نے دیکھے، وہ کہنے لگا کہ خدا کی قسم! میں اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ مجھ پر احسان کر کے میرے حلیفوں کے معاملہ میں حسنِ سلوک نہیں کریں گے، یہ سات سو افراد ہیں، چار سو غیر مسلح اور تین سو ہتھیار بند، آپ کل صبح کو یک دم ان کو کاٹ دیں گے، خدا کی قسم! مجھے زمانہ کی گردشوں کا خوف ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ان کو چھوڑ دو، ان پر اللہ کی لعنت اور ان پر بھی لعنت جو ان کے ساتھی ہیں، غرض آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مدینہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا، تین دن کے بعد وہ چلے گئے، ان کو نکال دینے پر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ مامور ہوئے، محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان کو مدینہ سے نکال کر اذرعات بھیج دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اسلحہ میں سے (اپنے لیے) دو زرہیں، تین بالے اور تین تلواریں لے لیں، ان کے گھروں میں بہت اسلحہ اور سناری کے اوزار ملے، سب کا خمس (پانچواں حصہ) نکال کر باقی چار حصے ساتھیوں کو تقسیم کر دیئے گئے۔ بدر کے بعد مالِ غنیمت کا یہ پہلا خمس تھا، ہجرت سے بیس ماہ کے خاتمہ پر نصف شوال ۲ھ کو بروز ہفتہ یہ واقعہ ہوا۔

[تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۲۵۷، ۲۵۸]

☆☆☆

(۷۱)

﴿منافقین کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ ج فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ o فَکَانَ عَاقِبَتَھُمَآ اَنَّھُمَا فِی النَّارِ خٰلِدَیْنِ فِیْھَاط وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ﴾ [الحشر: ۱۶، ۱۷]

ترجمہ

''ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ (اول تو) انسان سے کہتا ہے، کافر ہو جا، جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو اس سے کہتا ہے میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ سو آخری انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے، جہاں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔''

تشریح

عبداللہ بن اُبی بن سلول اور اس جیسے دوسرے منافق جو یہودیوں کو جنگ پر آمادہ کرتے تھے ان کی مثال شیطان کی سی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ایامِ فترت میں ایک راہب تھا جس کو برصیصا کہا جاتا ہے، ستر سال تک یہ راہب اپنے عبادت خانہ میں اللہ کی عبادت و بندگی کرتا رہا، کبھی ایک لمحہ کے لیے اللہ کی نافرمانی نہیں کی، اس کے سلسلہ میں ابلیس اپنی ساری تدبیریں کر کے عاجز آ گیا، مگر اس کو نہیں بہکا سکا، آخر ایک دن اس نے

تمام خبیث شیطانوں کو جمع کیا اور کہنے لگا کہ مجھے اب تک کوئی بھی ایسا نہ ملا جو برصیصا کے معاملہ میں میرا کام پورا کر دیتا، حاضرین میں ایک شیطانِ ابیض (گورا شیطان) بھی تھا، اس گورے شیطان نے ابلیس سے کہا کہ میں آپ کا کام سرانجام دوں گا، چنانچہ وہ اس مجلس سے چلا اور راہبوں کا ایسا لباس پہنا اور وسطِ سر کے بال مونڈ کر برصیصا کے عبادت خانہ تک جا پہنچا، برصیصا کو آواز دی، برصیصا نے کوئی جواب نہیں دیا، برصیصا دس دن میں صرف ایک دن نماز سے فارغ ہوتا اور دس ہی دن میں صرف ایک دن روزہ افطار کرتا تھا۔ گورے شیطان نے جب دیکھا کہ برصیصا نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا تو برصیصا کی خانقاہ کے نیچے ہی عبادت میں مشغول ہو گیا، عبادت سے مقررہ وقت پر فارغ ہو کر جب برصیصا نے اپنے عبادت خانہ سے جھانک کر دیکھا تو گورے شیطان کو بہترین راہبانہ طریقہ سے نماز میں کھڑا ہوا پایا، یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کو جواب نہ دینے پر اپنے دل میں پشیمانی ہوئی اور کہنے لگا کہ آپ نے مجھے آواز دی تھی مگر میں آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوا، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟ گورے شیطان نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے ساتھ مل کر عبادت کروں اور آپ کے علم و عمل سے بہرہ اندوز ہوسکوں، اور ہم دونوں عبادت میں لگ جائیں، آپ میرے لیے دعا کریں اور میں آپ کے لیے دعا کروں، راہب نے کہا کہ میں تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، اگر تم مومن ہو تو میں عام مومنین کے لیے جو دعا کرتا ہوں اگر وہ دعا خدا قبول فرمالے گا تو تم کو بھی اس میں شامل کر دے گا، یہ کہہ کر برصیصا پھر نماز کی طرف متوجہ ہو گیا اور گورے شیطان کو چھوڑ دیا، گورا شیطان بھی نماز میں مشغول ہو گیا، برصیصا نے چالیس دن تک اس کی طرف کوئی التفات نہیں کی، چالیس دن کے بعد جب نماز سے فارغ ہوا تو گورے شیطان کو نماز میں کھڑا پایا، آخر شیطان کی اتنی سخت کوشش (مجاہدہ) دیکھ کر برصیصا نے پوچھا کہ تمہارا کیا مطلب ہے، گورے شیطان نے کہا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے اجازت دے دیں، میں بھی اوپر آپ کے پاس آجاؤں، برصیصا نے اجازت دے دی، گورا شیطان اوپر برصیصا کے پاس خانقاہ میں آ گیا اور اس کے ساتھ ایک سال تک عبادت میں مشغول رہا، پورا چلہ ختم

ہونے سے پہلے روزہ افطار نہیں کرتا تھا، برصیصا نے جب اس کی یہ کوشش اور محنت دیکھی تو خود اپنی ذات اس کو حقیر معلوم ہونے لگی اور شیطان کی حالت پر اس کو تعجب ہوا، سال پورا ہو گیا تو گورے شیطان نے برصیصا سے کہا کہ اب میں جا رہا ہوں، کیونکہ آپ کے علاوہ میرا ایک اور ساتھی ہے، میرا خیال تو یہ تھا کہ آپ اس سے زیادہ عبادت گزار ہوں گے، لیکن آپ کے متعلق جو کچھ میں نے سنا تھا آپ کی حالت اس سے مختلف پائی، یہ سن کر برصیصا کو شدید تکلیف ہوئی اور چونکہ شیطانِ ابیض (گورے شیطان) کی شدید محنت دیکھ چکا تھا، اس لیے اس کی جدائی راہب پر شاق گزری، رخصت ہوتے وقت گورے شیطان نے برصیصا سے کہا مجھے کچھ دعائیں آتی ہیں، میں آپ کو وہ سکھاتا ہوں جس مشغلہ میں آپ ہیں وہ دعائیں اس سے بہتر ہیں، آپ ان دعاؤں کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ بیمار کو شفاء عطا کرے گا دُکھی کو سکھی کر دے گا اور آسیب زدہ کو ٹھیک کر دے گا، برصیصا نے کہا کہ مجھے یہ مرتبہ پسند نہیں، میرے لیے اپنا ہی مشغلہ کافی ہے، مجھے ڈر ہے کہ جب لوگوں کو اس کی خبر ہوگی تو وہ میری عبادت میں خلل انداز ہوں گے، گورا شیطان برابر اصرار کرتا رہا، آخر اس نے راہب کو وہ دعائیں سکھا کر چھوڑا، اس کے بعد چلا گیا اور ابلیس سے جا کر کہا کہ خدا کی قسم! میں نے اس شخص کو تباہ کر دیا، پھر یہاں سے واپس چلا گیا، راستہ میں ایک آدمی ملا، شیطان نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور طبیب کی شکل میں اس کے گھر والوں کو جا کر کہا کہ تمہارے ساتھی کو آسیب ہے، کیا میں اس کا علاج کر دوں، لوگوں نے کہا کہ ہاں، جا کر مریض کو دیکھا اور بولا اس پر چڑیل کا اثر ہے، میں اس پر قابو نہیں پا سکتا، البتہ تم کو ایک ایسے آدمی کا پتہ بتاتا ہوں جو اللہ سے دعا کر کے اس کو ٹھیک کر سکتا ہے، غرض اس نے برصیصا کا پتہ بتا دیا اور کہا کہ تم اس کے پاس جاؤ، اس کے پاس اسمِ اعظم ہے، جب وہ اسمِ اعظم کے ذریعہ دعا کرتا ہے تو قبول ہو جاتی ہے، لوگ برصیصا کے پاس گئے اور اس سے دعا کرنے کی درخواست کی، اس نے ان ہی الفاظ سے دعا کر دی جو گورے شیطان نے اس کو سکھائے تھے، فوراً مریض پر جس شیطان کا تسلط تھا وہ شیطان بھاگ گیا۔ گورا شیطان بہت سے لوگوں سے ایسی ہی حرکت کر کے برصیصا کا پتہ

بتاتا رہا اور لوگ اچھے ہوتے رہے۔

ایک مرتبہ گورا شیطان، بنی اسرائیل کی کسی شہزادی پر اثر انداز ہوا، اس لڑکی کے تین بھائی تھے اور باپ بادشاہ تھا، بادشاہ مر گیا اور اپنے بھائی کو اپنا جانشین بنا گیا، لڑکوں کا چچا بادشاہ ہو گیا تو گورا شیطان شہزادی کی طرف متوجہ ہوا، اس کو سخت اذیت دی اور گلا گھونٹ دیا، پھر اس کے بھائیوں کے پاس طبیب کی شکل میں آیا اور کہا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس کا علاج کر دوں، لوگوں نے کہا کہ ہاں، کہنے لگا کہ ایک بڑا خبیث اس کے درپئے آزار ہے اور مجھ میں اس کو دور کرنے کی طاقت نہیں، البتہ ایک شخص کا پتہ بتاتا ہوں جس پر تم اعتماد کرتے ہو، لڑکی کو اس کے پاس لے جاؤ، جب اس پر وہ خبیث آئے گا اور وہ شخص اس کے لیے دعا کرے گا تو لڑکی اچھی ہو جائے گی، اور لڑکی عافیت کے ساتھ واپس لے آؤ گے، لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون شخص ہے؟ گورے شیطان نے کہا کہ برصیصا راہب، شہزادوں نے کہا وہ ہماری بات کیسے مانیں گے، ان کا مقام تو بہت بلند ہے، شیطان نے کہا کہ اس کی خانقاہ کے برابر ایک اور عبادت خانہ تعمیر کرواتنا اونچا کہ وہاں سے اس کی خانقاہ کے اندر جھانک سکو، پھر وہاں سے اپنا مقصد اس سے بیان کرو، اگر مان لے تو خیر، نہ مانے تو اپنے تعمیر کردہ عبادت خانہ میں لڑکی کو چھوڑ آؤ، اور برصیصا سے کہہ دو کہ ثواب کی غرض سے اس کی نگرانی رکھنا، الحاصل شہزادے برصیصا کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی لیکن اس نے انکار کر دیا، شیطان کے کہنے کے مطابق شہزادوں نے راہب کی خانقاہ کے برابر ایک عبادت خانہ تعمیر کرا دیا اور لڑکی کو اس میں رکھ دیا اور راہب سے کہا کہ یہ ہماری امانت ہے، ثواب کی غرض سے اس کی نگرانی رکھنا، یہ کہہ کر واپس آ گئے، جب برصیصا نے نماز ختم کی تو ایک حسین لڑکی پر نظر پڑی اور ایسی نظر پڑی کہ وہ لڑکی اس کے دل نشین ہو گئی اور اس پر بڑی مصیبت آ گئی، اس کے بعد شیطان نے آ کر اس لڑکی کا گلہ گھونٹ دیا، برصیصا نے اس کے لیے گورے شیطان کی سکھائی ہوئی دعائیں کیں، تو شیطان اُتر گیا، برصیصا نماز میں مشغول ہو گیا، شیطان نے آ کر پھر اس کا گلہ گھونٹ دیا، اس مرتبہ بے ہوشی میں وہ اپنا ستر بھی کھولنے لگی، گورے شیطان نے آ کر برصیصا سے کہا

کہ اب تو اس پر جا پڑ، پھر توبہ کر لینا، اللہ، گناہ معاف کرنے والا ہے، معاف کر دے گا اور تیرا مقصد بھی پورا ہو جائے گا، ردوکد کے بعد برصیصا لڑکی پر جا پڑا اور اس کے بعد مسلسل لڑکی کے پاس جاتا رہا، آخر لڑکی حاملہ ہوگئی اور اس کا حمل نمایاں ہو گیا، تو شیطان اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ارے برصیصا تو رسوا ہو گیا، اب مناسب یہ ہے کہ تو لڑکی کو قتل کر دے، پھر توبہ کر لینا، اگر لوگ پوچھیں تو کہنا کہ اس کا جن اس کو لے گیا، مجھ میں بچانے کی طاقت نہیں تھی، چنانچہ برصیصا نے اس لڑکی کو قتل کر دیا پھر رات کو لے جا کر پہاڑی کے کنارے دفن کر دیا، دفن کرتے وقت شیطان نے آ کر لڑکی کی چادر کا ایک کونہ پکڑ لیا، اس طرح چادر کا ایک کونہ قبر کی مٹی سے باہر رہ گیا، برصیصا اپنی خانقاہ میں لوٹ آیا اور نماز میں مشغول ہو گیا، لڑکی کے بھائی اپنی بہن کی خبر گیری کے لیے آئے، انہوں نے دریافت کیا کہ برصیصا! ہماری بہن کیا ہوئی؟ برصیصا نے جواب دیا کہ شیطان آ کر اس کو اُڑا لے گیا اور مجھ میں بچانے کی طاقت نہیں تھی، ان لوگوں نے برصیصا کی بات پر یقین کر لیا، سب لوٹ آئے، شام ہوئی تو بھائی غمزدہ تو تھے ہی، سوتے میں شیطان نے بڑے بھائی سے خواب میں کہا کہ برصیصا نے تمہاری بہن کے ساتھ یہ حرکتیں کیں، پھر اس کو فلاں جگہ دفن کر دیا، اس بھائی نے اپنے دل میں کہا کہ یہ خواب ہے اور شیطانی خیال ہے۔ برصیصا تو بہت بزرگ آدمی ہے، وہ ایسا نہیں کر سکتا، تین رات برابر شیطان اس کو یہی خواب دکھاتا رہا، لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی، آخر شیطان خواب میں منجھلے بھائی کے پاس گیا اور اس سے بھی یہی بات کہی مگر اس نے بھی وہی خیال کیا جو بڑے بھائی نے کیا تھا اور کسی سے کچھ بیان نہیں کیا، آخر میں تیسرے بھائی کے پاس خواب میں جا کر شیطان نے یہی بات کہی، اس نے اپنے دونوں بھائیوں سے یہ خواب بیان کر دیا، منجھلے اور بڑے بھائی نے بھی اپنے خواب ظاہر کر دیئے، پھر تینوں برصیصا کے پاس گئے اور کہا کہ برصیصا! ہماری بہن کیا ہوئی؟ برصیصا نے کہا کہ میں تو تم کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے تہمت زدہ کرنا چاہتے ہو؟ یہ بات سُن کر شہزادوں کو اس سے شرم آئی اور کہنے لگے، ہم آپ پر تہمت نہیں دھرتے، یہ کہہ کر واپس آ گئے، شیطان نے پھر خواب میں آ کر ان سے کہا کہ

ارے تمہاری بہن تو فلاں مقام پر دفن ہے اور اس کی چادر کا ایک کونہ قبر کی مٹی سے اوپر نظر آ رہا ہے، ان لوگوں نے جا کر دیکھا تو جیسا خواب میں دیکھا تھا ویسا ہی پایا، پھر تو مزدوروں اور غلاموں کو لے کر کسیوں اور کدالوں سے ان لوگوں نے برصیصا کا عبادت خانہ ڈھا دیا اور اس کو عبادت خانہ سے اتار کر مشکیں کس کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ اِدھر گورے شیطان نے برصیصا سے کہا کہ انکار نہ کرنا، اگر تو نے انکار کیا تو تجھ پر دو جرم عائد ہو جائیں گے ایک قتل کا اور دوسرا انکارِ قتل کیا۔ برصیصا نے اقرار کر لیا تو بادشاہ نے اس کو قتل کرنے اور سُولی پر چڑھانے کا حکم دے دیا، سُولی پر چڑھاتے وقت وہی گورا شیطان آیا اور برصیصا سے کہا کہ کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ برصیصا نے کہا کہ نہیں، بولا میں وہی ہوں جس نے تجھے دُعائیں سکھائی تھیں، اور تیری دعائیں قبول ہوئی تھیں، امانت میں خیانت کرتے تجھے خدا سے ڈر نہیں لگا، تیرا تو دعویٰ تھا کہ میں تمام بنی اسرائیل سے بڑھ کر عبادت گزار ہوں، مگر تجھے شرم نہیں آئی، اس طرح برابر شرم دلاتا رہا، پھر آخر میں کہنے لگا کہ کیا جو کچھ تو نے کیا وہی کافی نہ تھا کہ تو نے اقرارِ جرم کر لیا اور خود اپنے کو بھی رسوا کیا اور اپنے جیسے دوسرے عبادت گزار لوگوں کو بھی رسوا کیا، اگر تو اسی حالت پر مر گیا تو تیری مثل دوسرے عبادت گزار لوگ کبھی فلاح یاب نہیں ہوں گے، برصیصا نے پوچھا کہ تو اب میں کیا کروں؟ کہنے لگا کہ میری ایک بات مان لے، اگر وہ بات مان لے گا تو میں تجھے موجودہ حالت سے بچا کر لے جاؤں گا، میں لوگوں کی نظر بندی کر دوں گا، اور تجھے اس جگہ سے نکال لے جاؤں گا، برصیصا نے پوچھا کہ وہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ بس مجھے سجدہ کر لے، برصیصا نے کہا کہ میں ایسا کرتا ہوں، شیطان نے کہا کہ میرا مقصد پورا ہوا، میں یہی چاہتا تھا، تیرا انجام یہی ہوا کہ تو کافر ہو گیا، اب میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ”اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ“ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں، شیطان نے یہ بات محض دکھاوے کے لیے کہی، کیونکہ خدا کا خوف شیطانوں کی سرشت میں ہی نہیں رکھا گیا۔ اہلِ تفسیر کے بعض اقوال میں آیا ہے کہ ”اَلْاِنْسَان“ سے جنسِ انسان مراد ہے اور جس طرح آمر اپنے مامور کو حکم دے کر کسی کام پر آمادہ کرتا ہے اسی طرح شیطان، انسان کو کفر پر اُکساتا ہے اور اس

ڈر سے کہ انسان کے ساتھ اغواء کرنے کا اس پر عذاب نہ ہو قیامت کے روز یہ بات کہے گا۔

بعض مفسرین کے نزدیک "اَلْاِنْسَان" سے ابوجہل مراد ہے، ابلیس نے شیخ نجدی کی شکل میں آکر اس سے بدر کے دن کہا تھا: "لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْہِ وَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ۔ اس آیت میں "اَخَافُ اللّٰہَ" کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اس دنیا میں ہلاک ہونے سے ڈرتا ہوں۔"

[دیکھیے تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۲۵۸ تا ص ۲۶۱]

حاصلِ تفسیر یہ ہے کہ منافقین کے یہود سے وعدوں کی مثال شیطان کے وعدوں کی سی ہے جو انسان کو مختلف آرزوئیں دلا کر اور اسے سبز باغ دکھا کر کفر و شرک پر آمادہ کرتا ہے اور جب آدمی اس کی چالوں میں آکر کفر و شرک اختیار کر لیتا ہے اور اس کی پاداش میں عذابِ خداوندی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو شیطان اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور صاف کہہ دیتا ہے کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ، پروردگارِ عالم سے ڈر لگتا ہے، اس لیے میں تم سے بری الذمہ ہوں اور تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا، یہود سے کیے گئے منافقین کے وعدے بھی اسی طرح پُرفریب ہیں، آڑے وقت میں وہ بھی ان کی مدد نہیں کریں گے اور مختلف حیلوں بہانوں سے کنی کترا جائیں گے۔ "فَکَانَ عَاقِبَتَھُمَا الخ" یہ شیطان اور کافر کا انجام ہے، دنیا میں تو شیطان، انسان کو گمراہ کر کے الگ ہو جاتا ہے، لیکن آخرت میں دونوں کا انجام جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ایسے ظالموں کی یہی سزا ہے، بعینہٖ یہی انجام ان منافقوں اور یہودیوں کا ہوگا۔

☆☆☆

(۷۲)

﴿قرآنِ حکیم میں غور وفکر کی ترغیب﴾

آیتِ کریمہ:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [الحشر: ۲۱]

ترجمہ

''اور اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا اور ان مضامینِ عجیبہ کو ہم لوگوں کے فائدے کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں۔''

تشریح

بعض مفسرین کے نزدیک آیتِ ہٰذا میں ایک تمثیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اگر پہاڑ میں قوتِ تمیز پیدا کر دیتا اور پھر اس پر قرآن اتارتا تو پہاڑ عاجزی سے دب جاتا، خوف سے پھٹ جاتا اور عظمتِ قرآن سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، باوجودیکہ یہ پہاڑ نہایت سخت ٹھوس اور باوزن ہیں لیکن ان کو خوف ہوتا کہ وہ قرآن کی تعظیم کا پوری طرح حق ادا نہ کر پاتے اس وجہ سے پارہ پارہ ہو جاتے لیکن کافر انسان جو صاحب علم وعرفان ہے، قرآن کے اندر جو عبرتیں اور نصیحتیں ہیں، ان کو جانتا پہچانتا ہے، پھر بھی سنی اَن سنی کر دیتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمادات اور نباتات بظاہر بے حس اور بے شعور ہیں، لیکن اپنے خالق کا شعور رکھتے ہیں۔ اور اس سے ڈرتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک

پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے کہ کیا تیرے اوپر کوئی بندۂ خدا، اللہ کو یاد کرتا ہوا گزرا ہے؟

[تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۲۶۲]

آیت کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم پہاڑوں جیسی سخت چیز کو عقل وشعور دے کر ان پر اس قرآن کو نازل کر دیتے تو قرآن کی اثر انگیزی سے وہ اس قدر متاثر ہوتے کہ خوف سے لرز اٹھتے اور ریزہ ریزہ ہو جاتے لیکن ان منافقین کے دل اس قدر سخت ہیں کہ قرآنی مواعظ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔[تفسیر قرطبی ج ۱۸، ص ۴۴ا]

"وَ تِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ الخ" اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ ان میں غور وفکر کر کے عبرت ونصیحت حاصل کریں۔اس آیت میں اشارہ اور توبیخ ہے کہ انسان غور وفکر سے کام نہیں لیتا اور اتنا سخت دل ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت اس کے اندر خشوع پیدا نہیں ہوتا۔

☆☆☆

(۷۳)

﴿قہرِ خداوندی کا نشانہ بننے والی قوم، دوستی کے لائق نہیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ﴾

[الممتحنة: ۱۳]

ترجمہ

''اے ایمان والو! ان لوگوں سے دوستی مت کرو جن پر اللہ نے غضب نازل کیا ہے وہ آخرت (کے ثواب و فلاح) سے ایسے ناامید ہو گئے جیسے کفار قبروں والوں سے۔''

شانِ نزول:

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے بطریقِ محمد بن اسحاق بروایت محمد از عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ یا سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور زید بن حارث رضی اللہ عنہ کچھ یہودیوں سے دوستی رکھتے تھے اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیساپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ ان فقرائے مسلمین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو یہود کو مسلمانوں کی خبروں سے مطلع کرتے تھے اور ان سے میل ملاپ رکھتے تھے، اس طرح ان کو یہود کی طرف سے پھل وغیرہ ملتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں اُن کو اس حرکت سے منع فرمایا ہے۔

[آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول ص ۴۳۷]

تشریح

سورت کے آخر میں مومنین کو تنبیہ اور توبیخ ہے تاکہ سورت کا اختتام، ابتداء سے مرتبط ہو جائے، مغضوب علیھم یہود یا یہود و نصاریٰ یا تمام کفار مراد ہیں۔

[روح المعانی، تفسیر قرطبی]

اگر مغضوب علیھم سے یہودی مراد ہوں تو یہودیوں کا آخرت کی فلاح وخیر سے مایوس ہونا اس بناء پر ہے کہ یہودی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی برحق اور صاحبِ معجزات ہونے کے منکر تھے، حالانکہ تورات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت موجود تھی، مگر شیطان کے زیر تسلط آکر محض حسد وعناد کی وجہ سے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت کا انکار کرتے تھے، اور ان تمام باتوں کو جانتے اور سمجھتے بھی تھے مگر بدبختی ان پر غالب تھی، دیدہ ودانستہ حسد اور عداوت رکھتے تھے، اسی وجہ سے آخرت کی فلاح و بہبود سے ناامید ہو گئے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ آخرت کے ثواب میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔

اگر عام کفار مراد ہوں تو چونکہ ان کا آخرت پر اور آخرت کے ثواب وعذاب پر ایمان ہی نہیں تھا، اس لیے نہ عذابِ آخرت سے ڈرتے تھے نہ ثوابِ آخرت کے امیدوار۔

"كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ" یعنی کفار جس طرح قبروں کے مردوں کے دوبارہ اٹھائے جانے یا ان کے ثواب پانے کی امید نہیں رکھتے تھے۔ اگر مغضوب علیھم سے مراد عام کفار ہوں تو پھر دوبارہ صراحت کے ساتھ لفظِ کفار کا استعمال بتا رہا ہے کہ کفر نے ہی ان کو ناامید اور مایوس کر رکھا ہے، اس تفسیر کی بناء پر "مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ" کا تعلق "يَئِسَ" سے ہوگا اور ظرفِ لغو ہوگا۔ بعض مفسرین کے نزدیک ظرفِ مستقر ہے اور "مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ"، "اَلْكُفَّار" کا بیان ہے، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح قبروں میں دفن ہونے والے مردہ کافر،

ثوابِ آخرت سے مایوس ہیں اسی طرح یہودی بھی فلاحِ آخرت سے مایوس ہیں۔

[کذا قال مجاهد و سعيد بن جبير،][دیکھیے: تفسیر مظهری ج ۱۱، ص ۲۸۰]

اگر "مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ" میں مِنْ ابتدائیہ ہو تو اس صورت میں اَلْكُفَّار وضعِ مظہر موضعِ مضمر کے قبیل سے ہوگا اور مفہوم یہ ہوگا کہ یہ کفار آخرت کی آمد سے اسی طرح مایوس ہیں، جس طرح وہ اپنے مرے ہوئے اسلاف کے دوبارہ زندہ ہونے سے مایوس ہیں۔[روح المعانی ج ۲۸، ص ۸۲]

☆☆☆

(۷۴)

﴿یہودیوں کی بدعملی کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [الجمعۃ: ۵]

ترجمہ

’’جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا، پھر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا ان کی حالت اس گدھے کی طرح ہے جو اپنے اوپر بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو، بری حالت ہے ان لوگوں کی جنہوں نے خدا کی آیات کو جھٹلایا اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

تشریح

آیتِ مذکورہ میں لفظ ’’اَسْفَار‘‘ ، سِفْرٌ کی جمع ہے، بڑی کتاب کو کہا جاتا ہے، سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت و نبوت اُمیّین میں ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے تین مقاصد کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے، سابقہ آسمانی کتاب توراۃ میں بھی آپ کا تذکرہ تقریباً ان ہی الفاظ و صفات کے ساتھ آیا ہے، جس کا تقاضا یہ تھا کہ یہود، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آتے، مگر ان کو دنیا کے جاہ و مال نے توراۃ کے احکام سے اندھا کر دیا اور توراۃ کا علم ہونے کے باوجود عمل کے اعتبار سے ایسے ہو گئے جیسے بالکل جاہل اور ناواقف ہوں، ان لوگوں کی مذمت مذکورہ آیت میں اس طرح کی گئی کہ یہ لوگ جن پر توراۃ لاد دی گئی تھی، یعنی ان کو بے مانگے اللہ کی یہ نعمت دے دی گئی تھی مگر

انہوں نے اس کے اٹھانے کا حق ادا نہ کیا یعنی تورات کے احکام کی پرواہ نہ کی، ان کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کی پشت پر علوم وفنون کی بڑی بڑی کتابیں لاد دی جائیں، یہ گدھا ان کا بوجھ تو اٹھاتا ہے مگر ان کے مضامین کی نہ اس کو کچھ خبر ہے، نہ ان سے کوئی فائدہ اس کو پہنچتا ہے، یہود کا بھی یہی حال ہے کہ دنیا سازی کے لیے تورات لیے پھرتے ہیں اور لوگوں میں اس کے ذریعہ جاہ اور اپنا مقام بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر اس کی ہدایات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جو مثال یہود کی دی گئی ہے، یہی مثال اس عالمِ دین کی ہے جو اپنے علم پر عمل نہ کرے۔

نہ محقق بود نہ دانش مند　　　　چار پائے بر و کتابے چند

[معارف القرآن ج ۸، ص ۴۳۶، ۴۳۷]

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ایک گدھے پر پچاس کتابیں علم وحکمت کی لاد دو، اس کو بوجھ میں دبنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں، وہ تو صرف ہری گھاس کی تلاش میں ہے، اس بات سے کچھ سروکار نہیں رکھتا کہ پیٹھ پر لعل وجواہر لدے ہوئے ہیں یا خزف وسنگریزے، اگر محض اسی پر فخر کرنے لگے کہ دیکھو میری پیٹھ پر کیسی کیسی عمدہ اور قیمتی کتابیں لدی ہوئی ہیں لہٰذا میں بہت بڑا عالم اور معزز ہوں تو اور زیادہ گدھا پن ہے۔''

[فوائد عثمانی ص ۷۱۸]

☆☆☆

(۷۵)

﴿منافقین کی مثال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُهُمْ ط وَ اِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ط کَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ ط هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ط قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ﴾ [المنافقون: ۴]

ترجمہ

''اور جب آپ ان کو دیکھیں تو ان کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر وہ بات کہیں تو آپ ان کی بات سن لیں گویا وہ لکڑیاں ہیں جو (دیوار کے سہارے لگائی ہوئی) کھڑی ہیں، وہ ہر غل پکار کو اپنے اوپر پڑنے والی خیال کرتے ہیں، یہی لوگ دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو، ان کو خدا غارت کرے، کہاں پھرے چلے جاتے ہیں۔''

تشریح

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبی (رئیس المنافقین) قدآور اور فصیح اللسان تھا، جب بات کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی بات سنتے تھے۔ ''یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ'' یعنی ان کے دل چونکہ رُعب زدہ ہیں، اس لیے ہر پکار اور اونچی آواز کو اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے والی خیال کرتے ہیں۔ نیز یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کو ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کا نفاق ظاہر نہ ہو جائے، جس کی وجہ سے ان کا خون مباح کر دیا جائے اور ان کو قتل کر دیا جائے، اس لیے لشکر میں جو اونچی آواز

سنائی دیتی ہے، مثلاً کوئی کسی کو پکارتا ہے یا کوئی جانور چھوٹ کر بھاگ پڑتا ہے یا گمشدہ اونٹ ڈھونڈا جاتا ہے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے قتل اور گرفتاری کا حکم ہو گیا۔ اور اب ان کو پکڑا جائے گا۔

"هُمُ الْعَدُوُّ" یعنی یہ منافق پکے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو، ہوشیار رہنے اور احتیاط رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کی صحبت میں نہ رہیں ان کو اپنے ساتھ نہ رکھو، ان سے بے خوف نہ رہو، کیونکہ جو شخص ہر وقت اپنی جان کے اندیشہ میں رہے اور جان کا خوف اس کو ہر وقت لگا رہے وہ یقیناً پکا دشمن ہوتا ہے اور جس کی طرف سے اس کو خوف لگا رہتا ہے اس کو دکھ تکلیف پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کرتا۔ "قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ" بظاہر یہ بددعا ہے اور خود اپنی ذات سے منافقوں پر لعنت کی طلب ہے، لیکن حقیقت میں یہ مسلمانوں کو لعنت اور بددعا کرنے کی تعلیم ہے۔

"أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ" یعنی وہ کس طرح حق سے پھیرے جاتے ہیں۔ ابن جریرؒ، قتادہؒ اور ابن المنذرؒ نے حضرت عکرمہؒ سے یہی تفسیری قول نقل کیا ہے۔[تفسیر مظھری ج ۱۱، ص ۳۲۴]

خلاصہء کلام یہ کہ جب منافقین کو آپ دیکھتے ہیں تو حسن و جمال اور جسمانی ڈیل ڈول کی وجہ سے وہ آپ کو بھلے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی باتیں بھی آپ بغور سنتے ہیں، کیونکہ فصاحت و بلاغت، شیریں کلامی اور چرب زبانی میں ماہر ہیں اور اپنی بہادری اور دلیری کی ڈینگیں مارتے ہیں اور جس طرح بے کار لکڑی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی جاتی ہے جو نہ ستون ہو نہ شہتیر نہ کڑی، الغرض فائدے سے خالی ہو اسی طرح یہ منافقین جو آپ کی مجلسوں میں دیواروں سے تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں محض بے کار اور ایمان سے خالی ہیں۔[روح المعانی ج ۲۸، ص ۱۱۱]

اور منافقین کے دلوں میں چونکہ چور ہے اور وہ اپنی خباثتوں کو خوب جانتے ہیں اس لیے ہر وقت خوفزدہ اور ہراساں رہتے ہیں، اور جب بھی کوئی آواز سنتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہماری خیر نہیں اور یہ ہماری ہی موت کا پیغام اور ہمارے ہی خلاف کوئی اعلان ہے، یہ ملعون آپ کے سب سے بڑے دشمن ہیں، ان سے بچیئے اور ان کی چالوں سے خبردار رہیے دیکھو! وہ کس طرح حق سے کفر و ضلال کی طرف پھیرے جا رہے ہیں۔

(۷۶)

﴿چار عورتوں کی مثالیں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ط كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَo وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ م اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَo وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾

[التحریم: ۱۰-۱۲]

ترجمہ

"اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے نوحؑ کی بی بی اور لوطؑ کی بی بی کا حال (بطورِ مثال) بیان فرمایا ہے، وہ دونوں ہمارے خاص بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، سو ان دونوں عورتوں نے ان دونوں بندوں کا حق ادا نہ کیا تو یہ نیک بندے اللہ کے مقابلہ میں ان دونوں عورتوں کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں عورتوں کو حکم دے دیا گیا کہ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی دوزخ میں چلی جاؤ اور اللہ مسلمانوں (کی تسلی) کے لیے فرعون کی بی بی کا حال بیان کرتا ہے جب کہ اس بی بی نے دعا کی کہ اے

میرے رب میرے لیے اپنے قرب میں جنت کے اندر ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل (کفر و شرک) سے محفوظ رکھ اور مجھے ان ظالموں سے بچا اور اللہ، مریم بنت عمران کا حال بیان کرتا ہے کہ جس نے اپنے ناموس کو محفوظ رکھا سو ہم نے اس کے ناموس (یعنی چاک گریبان) کے اندر اپنی روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے پیغاموں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزاروں میں سے تھی۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں چار عورتوں کی مثالیں بیان فرمائی ہیں، پہلی دو عورتیں دو پیغمبروں کی بیویاں ہیں جنہوں نے دین کے معاملہ میں اپنے شوہروں کی مخالفت کی، کفار و مشرکین کی امداد و موافقت خفیہ کرتی رہیں، اس کے نتیجہ میں دوزخ میں گئیں۔ اللہ کے مقبول و برگزیدہ پیغمبروں کی زوجیت بھی ان کو عذاب سے نہ بچا سکی، ان میں ایک حضرت نوح علیہ السلام کی بی بی ہے جن کا نام واغلہ بیان کیا گیا ہے اور دوسری حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی، جس کا نام والہہ بتایا گیا ہے۔ [قرطبی] ان کے ناموں میں اور بھی مختلف اقوال ہیں، تیسری وہ عورت ہے جو سب سے بڑے کافر خدائی کے مدعی، فرعون کی بیوی تھی مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا کہ دنیا ہی میں اس کو جنت کا مقام دکھلا دیا، شوہر کی فرعونیت اس کی راہ میں کچھ حائل نہ ہو سکی، چوتھی حضرت مریم علیہا السلام ہیں جو کسی کی بی بی نہیں مگر ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ درجہ دیا کہ ان کو نبوت کے کمالات عطا فرمائے، اگرچہ جمہور کے نزدیک نبی نہیں۔

ان سب مثالوں سے یہ واضح ہو گیا کہ ایک مومن کا ایمان اس کے کسی کافر عزیز کے کام نہیں آ سکتا، اور ایک کافر کا کفر اس کے کسی مومن عزیز کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لیے انبیاء و اولیاء کی بیویاں اس پر بے فکر نہ ہوں کہ ہمیں ہمارے شوہروں کی وجہ سے نجات

ہو ہی جائے گی اور کسی کافر فاجر کی بیوی یہ فکر نہ کرے کہ اس کا کفر میرے لیے مضرت کا سبب بن جائے گا۔ بلکہ ہر ایک مرد و عورت کو اپنے ایمان و عمل کی فکر خود کرنا چاہیے۔

"وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الخ" یہ مثال فرعون کی بیوی حضرت آسیہ بنتِ مزاحم کی ہے، جس وقت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے، اور جادوگر مسلمان ہو گئے تو اس بی بی نے اپنے ایمان کا اظہار کر دیا، فرعون نے ان کو سخت سزا دینا تجویز کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کو چومیخہ کر کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا، یعنی چاروں ہاتھوں پیروں میں میخیں گاڑ دیں کہ حرکت نہ کر سکیں۔ اس حالت میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی کہ جو اس آیت میں مذکور ہے اور بعض روایات میں ہے کہ فرعون نے یہ تجویز کیا کہ اوپر سے بہت بھاری پتھر ان کے سر پر ڈال دیا جائے۔ ابھی ڈالنے نہیں پائے کہ انہوں نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی رُوح قبض کر لی، پتھر جسم بے جان پر گرا اور دعا میں یہ فرمایا کہ میرے رب! جنت میں اپنے پاس گھر بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں ان کو جنت کا گھر دکھلا دیا۔ [تفسیر مظهری]

"وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا الخ" کلماتِ رب سے مراد اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ صحیفے ہیں جو انبیاء پر اترتے ہیں اور کتب سے مراد معروف آسمانی کتابیں انجیل، زبور، تورات ہیں۔

"وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ" قانتین جمع ہے قَانِتٌ کی جس کے معنی عبادت گزار کے ہیں جو اپنی عبادت و طاعت پر مداومت کرتا ہو، یہ حضرت مریم علیہا السلام کی صفت ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بہت سے لوگ مردوں میں سے کامل و مکمل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف آسیہ فرعون کی بیوی اور مریم بنتِ عمران کامل ہوئیں۔" [بخاری و مسلم از تفسیر مظهری]

ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد کمالاتِ نبوت ہیں کہ باوجود عورت ہونے ان کو حاصل ہوئے۔ (مظہری) [معارف القرآن ج ۸، ص ۵۰۶ تا ص ۵۰۷]

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "دنیا بھر کی

عورتوں میں سے مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد اور آسیہ زوجہ فرعون تمہارے لیے کافی ہیں" (یعنی صرف یہ ہی چار عورتیں کامل ہیں)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ (گزشتہ اقوام کی) عورتوں میں مریم بنت عمران سب سے بہتر عورت تھیں اور ہماری عورتوں میں سب سے بہتر خدیجہ بنتِ خویلد ہیں۔[متفق علیه]

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے سال رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو طلب فرمایا اوران کے کان میں کچھ ارشاد فرمایا، حضرت فاطمہؓ سن کر رونے لگیں، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کوئی اور بات فرمائی جس کو سن کر وہ ہنس پڑیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں نے حضرت فاطمہؓ سے رونے پھر ہنسنے کا سبب دریافت کیا، کہنے لگیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (پہلے) فرمایا تھا کہ عنقریب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو جائے گی، میں سن کر رونے لگی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سوائے مریم بنتِ عمران کے جنتی عورتوں کی میں سردار ہوگی، یہ سن کر میں ہنس دی۔" [رواہ الترمذی]

دونوں تمثیلوں میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ پر تعریض ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اس بات پر باہم تعاون کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہیں تھی اور سخت زَجر بھی ہے اوراس امر کی طرف اشارہ بھی ہے کہ دونوں کے ایمان کا تقاضا ہے اور دونوں پر لازم ہے کہ گزشتہ دونوں مومن عورتوں کی طرح ہو جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔[مظھری ج ۱۱، ص ۳۷۴]

☆☆☆

(۷۷)

﴿میدانِ قیامت میں مومن اور کافر کا حال﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖ اَهْدٰی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ٥ قُلْ هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ﴾

[الملک: ۲۲، ۲۳]

ترجمہ

''کیا وہ شخص زیادہ ہدایات والا ہے جو اپنے منہ کے بل اوندھا ہو کر چلے یا وہ جو سیدھا پیروں کے بل چل رہا ہو؟ کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے ہیں، تم بہت ہی کم شکر گزاری کرتے ہو۔''

تشریح

یہ پہلی دو آیتوں پر تفریع ہے اور اس میں مشرک اور موحّد کی مثال بیان کی گئی ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ عذاب سے پناہ دینے والا اور رزق دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کوئی نہیں، تو جو شخص اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرتابی کرے اور شرک کا راستہ اختیار کرے اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو سر جھکا کر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر جدھر اس کا منہ آجائے اُدھر ہی چلا جائے اور اس طرح سیدھی راہ سے ہٹ کر بھٹکتا رہے، یہ مشرک کی مثال ہے جو سوچ بچار کے بغیر ہی مشرک باپ دادا کی راہ اختیار کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں وہ شخص ہے جو سوچ سمجھ کر قدم رکھتا ہے اور سیدھا صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے،

یہ مومن کی مثال ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو احوالِ قیامت سے متعلق قرار دیا ہے کہ قیامت کے احوال میں ایک حال ضرور ہے کہ مشرکین سروں کے بل چلیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا کہ کفار چہرے کے بل کیسے چلیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس ذات نے ان کو پیروں پر چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان کو چہروں اور سروں کے بل چلا دے"۔ [بخاری و مسلم]

اس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ کیا وہ آدمی جو اوندھا اپنے چہرہ کے بل چلے زیادہ ہدایت پانے والا ہے یا وہ جو سیدھا چلنے والا ہے؟ سیدھا چلنے والے سے مراد مومن ہے کہ ہدایت یافتہ وہی ہوسکتا ہے۔ [معارف القرآن ج ۸، ص ۵۲۰ ملخصاً]

شبہ:

آیتِ مذکورہ میں لفظ "اَھْدٰی" اسمِ تفضیل ہے جس کا معنی ہے زیادہ ہدایت یافتہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت یافتہ تو کافر بھی ہے، اصل ہدایت تو اس کو بھی حاصل ہے لیکن مومن اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے؟

ازالہ:

لفظ "اَھْدٰی" اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ مفضّل علیہ (کافر) میں اصلِ ہدایت واقعی طور پر محقق (ثابت) ہو بلکہ فرض وجود کافی ہے۔ یعنی کافر میں اگر بالفرض ہدایت مان بھی لی جائے تب بھی مومن اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں گناہوں پر اوندھا ہوگا قیامت کے دن منہ کے بل چلے گا، جب کہ مومن سیدھے چل رہے ہوں گے۔ [تفسیر مظهری ج ۱۱، ص ۲۵]

آگے پھر انسانی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے چند مظاہر کا بیان ہے، ارشاد فرمایا کہ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے مگر تم لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اس میں اعضائے

انسانی میں اُن تین اعضاء کا ذکر ہے جن پر علم وادراک اور شعور موقوف ہے، فلاسفہ نے علم وادراک کے پانچ ذرائع بیان کیے ہیں جن کو حواسِ خمسہ کہا جاتا ہے یعنی سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا۔ سونگھنے کے لیے ناک اور چکھنے کے لیے زبان اور چھونے کی قوت سارے بدن میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے، سننے کے لیے کان اور دیکھنے کے لیے آنکھ بنائی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں چیزوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے یعنی کان اور آنکھ، اس کی وجہ یہ ہے کہ سونگھنے، چکھنے اور چھونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے، اس کے معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے اور ان میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا، غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوئی ہیں، ان میں سنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدرجہا زائد ہوتی ہیں، اس لیے اس جگہ حواسِ خمسہ میں سے صرف دو پر اکتفا کیا گیا ہے کہ بیشتر معلوماتِ انسانی ان ہی دو راہوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور تیسری چیز قلب (دل) کو بتلایا گیا ہے کہ وہ اصل بنیاد اور علم کا مرکز ہے۔ کانوں سے سنی ہوئی اور آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا علم بھی قلب پر موقوف ہے۔ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ قلب کو مرکزِ علم قرار دیا ہے، بخلاف فلاسفہ کے کہ وہ دماغ کو اس کا مرکز مانتے ہیں۔ [معارف القرآن ج ۸، ص ۵۲۰]

علمی نکتہ:

آیتِ مذکورہ میں لفظ "اَلسَّمْعَ" اصل میں مصدر ہے اور مصدر کی جمع اصل وضع کے اعتبار سے نہیں آتی، اس لیے "اَلسَّمْعَ" کو بصورتِ مفرد ذکر فرمایا لیکن اَلْبَصَر اور اَلْفُؤَادَ کی یہ حالت نہیں ہے یعنی یہ مصدر نہیں ہیں، اس لیے "اَلْاَبْصَارَ" اور "اَلْاَفْئِدَۃَ" کو بصورت جمع ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ "اَلسَّمْعَ" کو مفرد اور "اَلْاَبْصَارَ" اور "اَلْاَفْئِدَۃَ" کو جمع لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کان سے ایک ہی نوع کا علم حاصل ہوتا ہے اور آنکھ سے علم کے حصول کی متعدد صورتیں ہیں، (رنگ، شکل، مقدار، حسن وقبح وغیرہ) اور دل سے ادراک بھی مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، (شک، وہم، ظن، یقین، حصولی، حضوری، مختلف تصورات وتخیلات وغیرہ)۔ [تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۲۵]

(۷۸)

﴿باغ والوں کا قصّہ﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ○ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ○ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ○ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ○ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ ○ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ○ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ○ وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

[القلم: ۱۷ تا ۳۳]

ترجمہ

’’ہم نے ایسی آزمائش کی جیسی ایک مخصوص باغ والوں کی کی تھی، جب انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی باغ کے پھل توڑ لیں گے، انہوں نے استثناء نہیں کیا تھا، جب وہ سو رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے رات کو ایک مصیبت یعنی آگ کا چکر اس باغ پر

آیا اور وہ اجڑی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا، صبح ہوتے ہی انہوں نے باہم آوازیں دیں کہ تڑکے ہی تڑکے اپنی کھیتی پر چلو اگر تم کھیتی کاٹنے والے ہو، پس وہ چپکے چپکے کہتے ہوئے چلے کہ آج تمہارے پاس باغ میں کوئی مسکین ہرگز داخل نہ ہو اور سویرے چلے لپکتے ہوئے زور کے ساتھ، پھر جب اس کو دیکھا بولے ہم تو راہ بھول آئے نہیں ہماری تو قسمت پھوٹ گئی بولا بچلا ان کا میں نے تم کو نہ کہا تھا کہ کیوں نہیں اللہ کی پاکی بولتے، بولے پاک ذات ہے ہمارے رب کی، ہم ہی قصور وار تھے، پھر باہم ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، کہنے لگے ہائے افسوس! زیادتی ہماری طرف سے ہوئی، شاید ہمارا رب بدل دے ہم کو اس سے بہتر، ہم اپنے رب سے آرزو رکھتے ہیں، یوں آتی ہے آفت، اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے اگر ان کو سمجھ ہوتی۔"

تشریح

سابقہ آیات میں کفار اہلِ مکہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طعن و تشنیع کا جواب تھا اب ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے پچھلے زمانے کا ایک قصہ ذکر کر کے اہلِ مکہ کو تنبیہ فرمائی اور عذاب سے ڈرایا۔ اہلِ مکہ کو آزمائش میں ڈالنے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح آئندہ آنے والے قصہ میں باغ والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، انہوں نے ناشکری کی جس کے نتیجہ میں عذاب آ گیا اور ان کی نعمتیں سلب ہو گئیں، (اسی طرح) اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ پر اپنا سب سے بڑا انعام تو یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے اندر پیدا فرمایا، اس کے علاوہ ان کی تجارتوں میں برکت عطا فرمائی اور ان کو خوشحال بنا دیا، یہ ان کی آزمائش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اللہ و رسول پر ایمان لاتے ہیں یا اپنے کفر و عناد پر جمے رہتے ہیں۔

دوسری صورت میں ان کو باغ والوں کے قصہ سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفرانِ نعمت سے ان پر بھی ایسا ہی عذاب نہ آجائے۔ یہ تفسیر اس صورت میں بھی صادق ہے جب کہ ان آیات کو بھی اکثر سورت کی طرح مکی قرار دیا جائے، لیکن بہت سے مفسرین نے ان آیات کو مدنی قرار دیا ہے اور جس آزمائش کا یہاں ذکر ہے اُس سے مراد وہ قحط کا عذاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بدعا سے ان لوگوں پر مسلط ہوا تھا جس میں وہ بھوک سے مرنے لگے اور مُردار جانور اور درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

یہ باغ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کے قول کے مطابق یمن میں تھا، اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ صنعاء جو یمن کا مشہور شہر اور دارالحکومت ہے اُس سے چھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ بعض حضرات نے اس کا محلِ وقوع حبشہ کو بتلایا ہے۔[ابنِ کثیر]

یہ لوگ اہلِ کتاب میں سے تھے اور یہ واقعہ رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد کا ہے۔[قرطبی]

آیتِ مذکورہ میں ان کو اصحاب الجنۃ یعنی باغ والوں کے نام سے تعبیر کیا ہے مگر مضمون آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس صرف باغ ہی نہیں بلکہ کاشت کی زمینیں بھی تھیں، ہوسکتا ہے کہ باغ کے ساتھ ہی کاشت والی زمین بھی ہو مگر باغوں کی شہرت کے سبب باغ والے کہہ دیا گیا۔

ان کا واقعہ بروایت محمد بن مروان حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس طرح منقول ہے، صنعاء یمن سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک باغ تھا جس کو صروان کہا جاتا تھا، یہ باغ ایک صالح اور نیک بندے نے لگایا تھا، اس کا عمل یہ تھا کہ جب کھیتی کاٹتے تو جو درخت درانتی سے باقی رہ جاتے تھے ان کو فقراء و مساکین کے لیے چھوڑ دیتا تھا، یہ لوگ اس سے غلہ حاصل کر کے اپنا گزارہ کرتے تھے۔ اسی طرح جب کھیتی کو گاہ کر غلہ نکالتے تو

جو دانہ بھوسے کے ساتھ اڑ کر الگ ہو جاتا۔ اس دانے کو بھی فقراء ومساکین کے لیے چھوڑ دیتا تھا، اسی طرح جب باغ کے درختوں سے پھل توڑے تو توڑنے کے وقت جو پھل نیچے گر جاتا وہ بھی فقراء کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔

اس مردِ صالح کا انتقال ہو گیا، اس کے تین بیٹے، باغ اور زمین کے وارث ہوئے، انہوں نے آپس میں گفتگو کی، اب ہمارا عیال بڑھ گیا ہے اور پیداوار ان کی ضرورت سے کم ہے اس لیے اب ان فقراء کے لیے اتنا غلہ اور پھل چھوڑ دینا ہمارے بس کی بات نہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ ان لڑکوں نے آزاد نوجوانوں کی طرح یہ کہا کہ ہمارا باپ تو بے وقوف تھا، اتنی بڑی مقدار غلہ اور پھل کی لوگوں کو لُٹا دیتا تھا، ہمیں یہ طریقہ بند کرنا چاہیے، آگے ان کا قصہ خود قرآن کریم کے الفاظ میں ہے: ''اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ وَ لَا یَسْتَثْنُوْنَ'' یعنی انہوں نے آپس میں قسم کھا کر یہ عہد کیا کہ اب کی مرتبہ ہم صبح سویرے ہی جا کر کھیتی کاٹ لیں گے تاکہ فقراء ومساکین کو خبر نہ ہو اور وہ ساتھ نہ لگ لیں اور اپنے اس منصوبے پر ان کو اتنا یقین تھا کہ انشاء اللہ کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی، جیسا کہ سنت ہے کہ کل جو کام کرنا ہے جب اس کا ذکر کرے تو یوں کہے کہ ہم انشاء اللہ کل یہ کام کریں گے۔ ''لَا یَسْتَثْنُوْ'' کے معنی استثناء نہ کرنے کے ہیں اور اس سے مراد انشاء اللہ کہنا ہے۔ بعض حضرات نے استثناء سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم پورا پورا غلہ اور پھل لے آئیں گے، فقراء کا حصہ مستثنیٰ نہ کریں گے۔ [تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۳۵]

''فَطَافَ عَلَیْهَا طَائِفٌ مِّنْ رَّبِّکَ'' پھرنے والے سے مراد کوئی بلا و آفت ہے جس سے کھیتی اور باغ تباہ ہو جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ایک آگ تھی جس نے سب کھڑی کھیتی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، ''وَ هُمْ نَائِمُوْنَ'' یعنی یہ واقعہ نزولِ عذاب کا رات کو اس وقت ہوا جب کہ یہ لوگ محوِ خواب تھے۔ ''فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ'' صَرْم کے معنی پھل وغیرہ کاٹنے کے ہیں، صَرِیْم بمعنی مَصْرُوم و مقطوع ہے، مطلب یہ ہے کہ آگ نے اس کھیتی کو ایسا بنا دیا کہ جیسے کھیتی کاٹ لینے کے بعد صاف زمین رہ جاتی ہے، اور صَرِیْم کے معنی رات کے بھی آتے ہیں، اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جیسے

رات تاریک سیاہ ہوتی ہے یہ کھیتی بھی خاک سیاہ ہوگئی۔ [تفسیر مظہری ج ۱۱، ص ۳۵]
"فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ" یعنی صبح اندھیرے سے آپس میں ایک دوسرے کو آواز دے کر جگانے لگے کہ اگر کھیتی کاٹنا ہے تو سویرے سویرے چلو۔ "وَ هُمْ يَتَخَافَتُوْنَ" یعنی گھر سے نکلنے کے وقت آپس میں آہستہ بات کرتے تھے کہ کسی فقیر و مسکین کو خبر نہ ہو جائے جو ساتھ لگے۔

"وَ غَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قَادِرِيْنَ" حَرْد کے معنی منع کرنے اور غیظ و غضب دکھانے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں یہ سمجھ کر چلے کہ ہمیں اس پر قدرت ہے کہ ہم کسی فقیر و مسکین کو کچھ نہ دیں، کوئی بھی آجائے تو اس کو دفع کر دیں۔ "فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْا اِنَّا لَضَالُّوْنَ" مگر جب اس جگہ کھیت باغ کچھ نہ پایا تو اول تو یہ کہنے لگے کہ ہم جگہ کو بھول کر کہیں اور آ گئے، یہاں تو نہ باغ ہے نہ کھیت، مگر پھر قریبی مقامات اور نشانات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ جگہ تو یہی ہے اور کھیت جل کر ختم ہو چکا ہے تو کہنے لگے، "بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ" یعنی ہم اس نعمت سے محروم کر دیئے گئے۔ "قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ" یعنی ان میں سے جو درمیانہ آدمی تھا، یعنی باپ کی طرح نیک صالح، اللہ کی راہ میں خرچ پر خوش ہونے والا تھا، دوسرے بھائیوں کی طرح بخیل سخت دل نہ تھا، اس نے کہا کہ کیا میں نے تمہیں پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کے نام کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ تسبیح کے لفظی معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ فقراء و مساکین سے اپنا مال بچالینے کی تدبیر کا منشاء یہ ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تم کو اس کے بجائے اور نہ دے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے وہ خرچ کرنے والوں کو اپنے پاس سے اور زیادہ دیتا ہے۔ [مظہری ج ۱۱ ص ۳۶]

تنبیہ

یہ درمیانہ آدمی جس نے صحیح بات کہی تھی اگرچہ دوسروں سے بہتر تھا مگر پھر بہر حال انہیں کے ساتھ ہولیا اور انہیں کی غلط رائے پر عمل کے لیے تیار ہو گیا تھا، اس لیے

اس کا حشر بھی انہیں جیسا ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی کسی گناہ سے لوگوں کو روکے مگر وہ نہ رکیں، پھر خود بھی ان کے ساتھ لگا رہے اور گناہ میں شریک رہے تو یہ بھی انہیں کے حکم میں ہوتا ہے، اس کو چاہیے کہ وہ نہیں رکے تو خود اپنے آپ کو اس گناہ سے بچائے۔

"فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ" یعنی ان لوگوں نے اپنے جرم کا اعتراف تو کر لیا، لیکن اب الزام ایک دوسرے پر ڈالنے لگے کہ تو نے ہی اول ایسی غلط رائے دی تھی جس کے نتیجہ میں یہ عذاب آیا، حالانکہ یہ جرم ان میں سے کسی کا تنہا نہیں تھا بلکہ سب یا اکثر اس میں شریک تھے۔ "قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ" یعنی ابتداءً ایک دوسرے پر الزام ڈالنے کے بعد جب غور کیا تو پھر سب نے اقرار کر لیا کہ ہم سب ہی سرکش گناہگار ہیں، یہ اعتراف ندامت کے ساتھ اُن کی توبہ کے قائم مقام تھا، اسی بناء پر ان کو اللہ سے یہ امید ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس باغ سے بہتر باغ عطا فرما دیں گے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب ان سب لوگوں نے سچے دل سے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر باغ عطا فرما دیا جس کو جنون کہا جاتا تھا، جس کے انگوروں کے خوشے اتنے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک خچر پر لادا جاتا تھا۔" [مظہری ج ۱۱ ص ۳۷]

"كَذٰلِكَ الْعَذَابُ" اہلِ مکہ کے عذاب قحط کا اجمالی اور باغ والوں کے کھیت جل جانے کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد عام ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اسی طرح آیا کرتا ہے، اور دُنیا میں عذاب آجانے سے بھی ان کے آخرت کے عذاب کا کفارہ نہیں ہوتا بلکہ آخرت کا عذاب اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ [معارف القرآن ج ۸ ص ۵۳۴ تا ص ۵۳۷]

☆☆☆

(۷۹)

کفار کی بدحواسی کا عالم

آیتِ کریمہ:

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ○ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ○ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ○ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ○ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ﴾

[المدثر: ۴۹ تا ۵۳]

ترجمہ

''انہیں کیا ہو گیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں؟ گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے ہوں، بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلی ہوئی کتابیں دکھائیں، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، دراصل یہ قیامت سے بے خوف ہیں۔''

تشریح

''اَلتَّذْكِرَة'' سے مراد صرف قرآن ہے یا وہ تمام یادداشتیں جن میں قرآن کریم بھی شامل ہے، یہ استفہامِ انکاری ہے، یعنی دنیا میں ان کا حال ایسا کیوں ہے جو عذابِ آخرت تک پہنچانے والا ہے۔ ''كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ'' مُسْتَنْفِر فاء کے کسرہ کے ساتھ، بھاگنے والے، نَفَرَ اور اِسْتَنْفَرَ دونوں ہم معنی ہیں، جیسے عَجَبَ اور اِسْتَعْجَبَ۔ مُسْتَنْفَرَةٌ فاء کے فتح کے ساتھ، خوفزدہ بھاگے اور بدکے ہوئے، دونوں طرح مروی ہے۔ ''فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ'' قَسْوَرَة بروزن فَعْوَلَة قَسْر سے مشتق ہے اور قَسْر کا معنی ہے قہر۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قَسْوَرَة سے مراد ہیں شیر۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے تیرانداز (شکاری) مراد ہیں۔ قَسْوَرَة کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی منقول ہے۔ زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طاقتور اور ہر موٹے قوی کو اہل عرب قَسْوَرَه کہتے ہیں۔ ابوالمتوکل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے شور و شغب کو قَسْوَرَه کہتے ہیں۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ قَسْوَرَة شکاری کے جال کو کہتے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے شکاری معنی کیا ہے۔

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے امام سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت بیان کی ہے کہ کافروں نے کہا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک کے سرہانے صبح کو ایک پروانہ لکھا ہوا ملنا چاہیے جس میں دوزخ سے امان اور حفاظت کی تحریر ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً'' اس جگہ ''بَلْ'' ابتدائیہ ہے اور محض انتقالِ مضمون کے لیے لایا گیا ہے۔ کلامِ سابق سے اعراض مقصود نہیں ہے۔

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ کفارِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا کہ (اگر آپ سچے ہیں تو) ہم میں سے ہر شخص کے سرہانے صبح کو ایک کھلی چٹھی برآمد ہونا چاہیے جس میں لکھا ہو کہ آپ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے کہنے پر عمل کرنا ضروری ہے۔

''كَلَّا'' وضوحِ امر کے بعد طلبِ معجزات سے یہ باز داشت ہے۔ ''بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ'' اس جگہ بھی ''بَلْ'' ابتدائیہ ہے۔ ''كَلَّا'' سے کلام کا رخ پھیرنے کے لیے نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو آخرت کا خوف نہیں، اسی لیے تذکرہ (قرآن) سے انہوں نے منہ پھیر لیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں ''بَلْ'' اضراب کے لیے ہو، رفتارِ کلام بتا رہی ہے کہ اصل کلام اس طرح تھا کہ اگر ان کو کھلے پروانے بھی دے دیئے

جائیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ ان کو معجزہ کی طلب اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ معاملہ مبہم ہے، معاملہ تو ان پر روشن ہے۔ اب جو معجزہ کے طلبگار ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو آخرت کا اندیشہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ خوفِ آخرت ایک وہبی امر ہے، صداقتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واضح ہو جانے کے بعد بھی ضروری نہیں کہ کافر مان ہی لے اور اس کو قیامت کے دن کا خوف پیدا ہو جائے۔ [تفسیر مظھری ج ۱۲، ص ۱۳۷ تا ۱۳۸]

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ یہ کافر آپ کی دعوت اور نصیحت سے منہ پھیر رہے ہیں اور قرآن وسنت سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے، شکاری شیر سے بھاگتے ہیں، فارسی زبان میں جسے شیر کہتے ہیں اسے عربی زبان میں اَسَد کہتے ہیں اور حبشی زبان میں قَسْوَرہ کہتے ہیں اور نبطی زبان میں رویا، پھر فرماتے ہیں کہ مشرکین تو چاہتے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص پر علیحدہ علیحدہ کتاب نازل ہو، جیسا کہ ایک اور مقام پر ان کا قول نقل کیا گیا ہے کہ: حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ الخ'' یعنی جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہمیں وہ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ نبوت ورسالت کے لائق کون ہے؟''

یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہم بغیر عمل کے چھوڑ دیئے جائیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دراصل وجہ یہ ہے کہ انہیں آخرت کا خوف ہی نہیں، کیونکہ انہیں آخرت پر ایمان نہیں بلکہ اسے جھٹلاتے ہیں تو پھر اس سے ڈرتے کیسے؟'' [تفسیر ابن کثیر ج ۵، ص ۴۶۲]

☆☆☆

(۸۰)

﴿آتشِ دوزخ کی چنگاریاں﴾

آیتِ کریمہ:

﴿اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِیْلٍ وَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ﴾ [المرسلات: ۲۹ تا ۳۴]

ترجمہ

''چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلاتے تھے، چلو ایک ایسے سایہ کی طرف جس کی تین شاخیں ہیں نہ تو وہ سایہ ہوگا ڈھانکنے والا اور نہ ہی وہ جہنم کی لپٹوں سے بچانے والا ہوگا، وہ جہنم پھینکتی ہوگی ایسے شعلے جو محل کی طرح بلند ہوں گے گویا کہ وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں، ہلاکت و بربادی ہے اس روز انکار کرنے والوں کے لیے۔''

تشریح

''اِنْطَلِقُوْٓا'' یہ جملہ مستانفہ ہے، ایک فرضی سوال کا جواب ہے۔ سوال ہوسکتا ہے کہ اس روز ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا اس کا جواب دیا کہ ان سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم آتشِ دوزخ کے قائل نہ تھے اب اسی کی طرف چلو، ''اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ'' یہ اول کلام کی تاکید ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ ''ظِلٍّ'' سے مراد ہے جہنم کا دھواں' علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ بڑا دھواں جو اونچا اٹھتا ہے اور پیچ دار ہوتا ہے۔ جہنم کے دھوئیں کی تین شاخیں قرار دینے کی پسندیدہ وجہ یہ ہے کہ جہنم میں صرف تین

قسم کے آدمی داخل ہوں گے۔ (۱) وہ کافر جنہوں نے صریح لفظوں سے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ جیسے کفار نے کہا تھا: اَفْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا. (۲) وہ بدعتی جن کے اقوال ظاہر نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہیں اور وہ خلاف اجماع نصوص کی غلط تاویلات کرتے ہیں، ان کے کلام سے آیات کا انکار اور پیغمبروں کی تکذیب مفہوم ہوتی ہے۔ جیسے قدریہ، مجسمہ، رافضی، خارجی اور مرجئہ کے فرقے۔ مثلاً مجسمہ، آیت کریمہ ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ'' کی تکذیب کرتے ہیں اور ان تمام آیات کا انکار کرتے ہیں جن میں وزنِ اعمال یا پل صراط وغیرہ کا ذکر ہے اور رافضی و خارجی ان متواتر المعنی احادیث کا انکار کرتے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی تعریف میں وارد ہوئی ہیں۔ (۳) وہ مسلمان جو نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور صغیرہ و کبیرہ گناہ کے مرتکب اور فرائض کے تارک ہیں۔ یہی تینوں امور دخانِ جہنم کی تثلیث کے اسباب بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ دوزخ سے ایک گردن برآمد ہوگی جو تین شاخوں پر تقسیم ہو جائے گی۔ (۱) نور ہوگا جو مومنوں کے سروں پر آ کر ٹھہر جائے گا، (۲) دُخان ہوگا جو منافقوں کے سروں پر آ کر ٹھہر جائے گا۔ (۳) بھڑکتے شعلے ہوں گے جو کافروں کے سروں پر آ کر ٹھہر جائیں گے۔

بعض علماء کا یہ قول ضرور مرفوع حدیث ہوگی، کیونکہ صرف رائے کو اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ اس قول کی تشریح یہ ہے کہ آتشِ دوزخ کی سہ گانہ اقسام میں پہلی قسم نور ہوگی۔ اس کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ دوسری دونوں قسموں سے کم تاریک ہوگا ورنہ دوزخ کی آگ میں نور ہونے کا کیا معنی ہوسکتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہزار برس تک دوزخ کی آگ بھڑکائی گئی یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگئی، پھر ہزار برس تک بھڑکائی گئی یہاں تک کہ وہ سیاہ ہوگئی، اب وہ سیاہ تاریک ہے۔'' [ترمذی، بیہقی]

دخانِ جہنم کی یہی ہلکی ظلمت والی قسم گنہگار مسلمانوں کے سروں کے اوپر آ کر ٹھہر

جائے گی۔ دوسری قسم دخان ہے، اس میں آتشی اجزاء کی کثرت اور تاریکی کی شدت ہوگی، یہ منافقوں کے سروں پر آ کر ٹھہر جائے گی، اس جگہ سے منافقوں سے مراد وہ بدعتی ہیں جو ایمان کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر کفر اور تکذیبِ انبیاء ان کے قول کے لیے لازم ہے۔

وہ منافق مراد نہیں ہیں جو زبان سے ایمان کے قائل ہیں اور دل میں ایمان نہیں ہے، یہ تو اعلانیہ کفر کرنے والوں سے بھی زیادہ سخت ہیں اور ان کی جگہ تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہے۔ تیسری قسم بھڑکتے ہوئے شعلوں کی ہوگی، اس قسم میں سوزش اور التہاب خالص ہوگا، یہ کافروں کے سروں پر آ کر ٹھہر جائیں گے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آیت میں "ظِلٍّ" سے مراد خود جہنم کی آگ ہے، تاریک اور سیاہ ہونے کی وجہ سے اس کو مجازاً ظِلّ (سایہ) کہہ دیا گیا۔ کیونکہ سایہ میں کچھ تاریکی ہوتی ہے۔ پس تین شاخوں والی آگ کی طرف چلنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس آتشِ دوزخ کی طرف چلو جس میں پہنچانے والے تین راستے ہیں۔ (۱) انبیاء کرام علیہم السلام کی صریح الفاظ کے ساتھ تکذیب و انکار۔ (۲) انبیاء کرام علیہم السلام کی لزومی تکذیب۔ (۳) گناہ کا ارتکاب۔ آیت مذکورہ میں کافروں کے لیے امرِ استہزائی ہے۔ جیسے ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ میں اور بَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ" میں خطاب استہزائی ہے۔

"لَا ظَلِیْلٍ" یہ ظِلّ کی صفت ہے یعنی وہ سایہ عرش اور جنت کے سایوں کی طرح فرحت بخش نہیں ہے۔ "وَ لَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّھَبِ" وہ جہنم کے شعلوں کو دفع نہیں کرے گا۔ ظِلّ کے لفظ سے وہم پیدا ہوتا تھا کہ شاید وہ گرمی سے کچھ محفوظ رکھ لے اور دوزخ کی لپٹ سے بچا لے، اس وہم کا ازالہ اس آیت سے ہو گیا۔

"اِنَّھَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ کَالْقَصْرِ o کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ" جہنم چنگاریاں پھینکے گی۔ اس آیت میں دوزخ کی لپٹ کو دور نہ کرنے کی وجہ کا بیان ہے، ہر چنگاری قصر کی طرح بڑی ہوگی، قصر پتھر کا مکان یا گاؤں یا قلعہ۔ (قاموس) اس صورت میں قَصْر مفرد ہوگا، بعض نے اس کو قَصْرة کی جمع بتایا ہے اور قَصْرة کا معنی ہے کھجور کے درخت کی جڑ یا موٹا درخت۔

جِـمَـالَاتٌ، جِمَالٌ کی جمع ہے اور جِـمَـالٌ، جَمَلٌ کی جمع ہے بمعنی اونٹ۔
صُـفْـرٌ، اَصْـفَرُ کی جمع ہے بمعنی زرد رنگ، چونکہ چنگاریوں میں آگ ہوگی اس لیے زرد ہوگی۔ بعض علماء نے صُـفْـر کا معنی سُوْد یعنی سیاہ کیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جہنم کی آگ کی چنگاریاں تارکول کی طرح سیاہ ہوں گی۔ اونٹ کے رنگ کی سیاہی زردی مائل ہوتی ہے اس لیے عرب اونٹ کے رنگ کو صُـفْـر کہتے ہیں۔ قَـصْـر کے ساتھ تشبیہ مقدار کی بڑائی میں تھی اور جِـمَـالات صُـفْـر کے ساتھ تشبیہ رنگ، کثرت تسلسل باہم اختلاط اور سرعتِ حرکت میں ہے۔ [تفسیر مظھری ج ۱۲، ص ۱۷۱ تا ۱۷۲]

☆☆☆

(۸۱)

﴿خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے﴾

آیتِ کریمہ:

﴿وَ لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ﴾ [الحشر: ١٩]

ترجمہ

''اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا پس اللہ نے انہیں خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا، یہی لوگ فاسق ہیں۔''

تشریح

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد کو نہ بھولو ورنہ وہ تمہارے نیک اعمال، جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں بھلا دے گا، اس لیے کہ ہر عمل کا بدلہ اسی کی جنس کے مطابق ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ یہی لوگ فاسق ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے والے اور قیامت کے دن نقصان پہنچانے والے اور ہلاکت میں پڑنے والے یہی لوگ ہیں۔

جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ''يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَ لَآ أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ'' یعنی اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال و اولاد، اللہ کی یاد سے غافل نہ کریں، جو ایسا کریں وہ سخت زیاں کار ہیں۔''

معجم طبرانی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک خطبہ کا مختصر حصہ یہ منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''کیا تم نہیں جانتے کہ صبح و شام تم اپنے مقررہ وقت کی طرف بڑھتے جا

رہے ہو؟ پس تمہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے اوقات، اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں گزارو اور اس مقصد کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے سوا کوئی شخص اپنی طاقت سے حاصل نہیں کرسکتا، جن لوگوں نے اپنی عمریں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والے کاموں میں کھپائیں، تم ان جیسے نہ ہونا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان جیسے بننے سے منع فرمایا ہے: لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰـهُمْ اَنْفُسَهُمْ'' خیال کرو کہ تمہاری جان پہچان کے تمہارے بھائی آج کہاں ہیں؟ انہوں نے اپنے سابقہ ایام میں جو اعمال کیے تھے ان کا بدلہ لینے یا ان کی سزا پانے کے لیے وہ دربارِ خداوندی میں جا پہنچے، یا تو انہوں نے خوش بختی پائی یا نامرادی حاصل کر لی۔ کہاں ہیں وہ سرکش لوگ جنہوں نے بارونق شہر بسائے اور ان کے مضبوط قلعے قائم کیے، آج وہ قبروں کے گڑھوں میں پتھروں کے نیچے دبے پڑے ہیں، یہ ہے اللہ کی کتاب، تم اس نور سے روشنی حاصل کرو جو تمہیں قیامت کے دن کی تاریکیوں اور اندھیروں میں کام آسکے۔ اس کے عمدہ بیان سے عبرت حاصل کرو اور خوب سنور جاؤ۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام اور ان کے اہلِ بیت کی مدح کرتے ہوئے فرمایا: ''اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرَاتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا وَّ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ'' یعنی وہ نیک کاموں میں سبقت لے جاتے تھے اور رغبت و رہبت کے ساتھ ہم سے دعائیں کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے جھکنے والے تھے۔'' غور سے سنو! اس بات میں کوئی بھلائی نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی مقصود نہ ہو، وہ مال، خیر و برکت سے خالی ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جاتا ہو، وہ نیکی سے تہی دست ہے جو اللہ کے احکام کی تعمیل میں کسی ملامت گر کی ملامت سے ڈرتا ہو۔'' [تفسیر ابن کثیر ج ۵، ص ۳۲۲ تا ص ۳۲۳]

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح دلپذیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تمام دلچسپیوں کا محور و مرکز انسان کی اپنی ذات ہے، گہری نظر سے دیکھیے تو اس کو جس سے محبت ہے اپنی ذات کے لیے ہے، جو اس سے محبت کرتا ہے اس سے وہ بھی محبت کرتا ہے، جس کو اس سے نفرت ہے اس میں ہزاروں خوبیاں ہوں

اس سے دل کو لگاؤ نہیں پیدا ہوتا، زندگی کی ساری حرکت، چہل پہل، دوڑ دھوپ اسی محبت کے دم سے ہے۔ جہاں جیئے گا اسی کا ظہور پائے گا، ہر محبت کی تہہ میں اسی محبت کی کرشمہ سازی نظر آئے گی، دنیا کی ہر چیز فراموش ہوسکتی ہے، انسان ہر ایک سے غافل اور مشغول ہوسکتا ہے لیکن نازک وقت میں اپنی ذات سے غفلت نہیں ہوتی اور کٹھن گھڑی میں جب اولاد، متعلقین، اعزہ واحباب سب فراموش ہو جاتے ہیں، اپنی فکر رہتی ہے اور انسان اپنی خیر مناتا رہتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے، روزمرہ کا مشاہدہ ہے، فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے، اس کے خلاف اگر دعویٰ کیا جائے تو کان کھڑے ہوتے ہیں، اور اس کو اپنی فکر نہیں ہوتی اور سب کی فکر ہوتی ہے اور اس کو اپنا ہوش نہیں رہتا اور ہر بات کا ہوش رہتا ہے، اس کو سارے جہاں کی فکر ہوتی ہے اور اپنی فکر سے غافل ہوتا ہے، اس کو سب کی جان عزیز ہوتی ہے اور اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھوئے پڑا رہتا ہے، اور یہ کسی بلند مقصد کے ماتحت نہیں، کسی اصول اور کسی نظریہ کے ماتحت نہیں، ایثار وقربانی کے جذبہ سے نہیں، بلکہ یہ خود فراموشی کے عالم میں اور ایک ذہنی طاعون کے طور پر۔

قرآن مجید یہی دعویٰ کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے، جب انسان خدا کو بھلاتا ہے تو وہ یہ دکھا دیتا ہے کہ پھر اپنے کو بھولتا چلا جاتا ہے، اس پر خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے، زندگی کا انہماک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ساری زندگی انسان کے گرد چکر لگاتی نظر آتی ہے، مگر انسان کسی اور چیز کے گرد طواف کرتا نظر آتا ہے، مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ذرائع ووسائل مقصود بن جاتے ہیں، اشیاء سے براہِ راست ایسی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی ذات بھی بیچ میں سے نکل جاتی ہے، پھر ایک ایسی بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ احساسات ختم ہو جاتے ہیں، لذت وراحت جو دنیا میں ہمیشہ سے بڑے مقصود رہے ہیں، ذہن سے نکل جاتے ہیں، انسان ان سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے اور اس محرومی کا احساس اور اس پر افسوس بھی ختم ہو جاتا ہے، خیالی چیزیں، حقیقی چیزوں کی جگہ لے لیتی ہیں، اور انسانی زندگی عجائبات کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے، اور یہ

سب اس دور میں ہوتا ہے جب خدا کے بجائے انسان اپنی ذات کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اپنے سوا ہر چیز کے انکار پر آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ خدا فراموشی اور خدا سے یہ بغاوت جتنی ترقی کرتی ہے خود فراموشی، خود دشمنی، خودکشی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔

تمدن کے شاید کسی دور میں اس آیت کا ظہور اس طرح نمایاں اور صاف طریقہ پر نہ ہوا ہو جتنا اس دورِ تہذیب و ترقی میں، انسان کا اپنی ذات کے معاملات میں انہماک، اپنے ذات سے شیفتگی، شاید اتنی کسی زمانہ میں نہ ہو جتنی اس زمانہ میں، لذت و راحت کے وسائل شاید کبھی اتنے ایجاد نہ ہوئے ہوں جتنے اس دور میں، خدا پرستی کا فلسفہ شاید کسی عہد میں ایسا مرتب نہ ہوا ہو اور اس کی اشاعت شاید کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوئی ہو جیسے اس زمانہ، میں اپنے سوا ہر چیز کے انکار کا ذوق اور جوش شاید کبھی اتنا عام نہ ہوا ہو جتنا اس موجودہ سوسائٹی میں، لیکن واقعہ اور دن رات کا مشاہدہ کیا ہے؟۔ انسان اپنے انجام سے سب سے زیادہ بے فکر ہے، اپنی ذات سے سب سے زیادہ بے پرواہ ہے، حقیقتِ لذت و راحت سے سب سے زیادہ محروم ہے، زندگی کے ذخیرہ میں اس کا اپنا حصہ سب سے زیادہ کم ہے، وہ روپیہ ڈھالنے کی مشین بن کر رہ گیا ہے، جو اپنے ڈھالے ہوئے سکوں سے خود فائدہ نہیں اٹھا سکتی، اس کا حصہ زندگی میں صرف اتنا ہے کہ اس کو اتنا تیل دیا جاتا رہے جس سے وہ چلتی رہی، جذبات و احساسات سے عاری، لذات والم سے محروم، مسرت و کلفت سے بے خبر ایک بے جان مشین ہے۔

وہ تیلی کا بیل بن کر رہ گیا ہے جو اپنے مقررہ دائرے کے اندر چکر لگاتا رہتا ہے، کام لینے والے سے چارہ پانی پیتا ہے اور بغیر شکوہ و شکایت کے چکر لگاتا ہے، آج تمدن و سوسائٹی کے اس چکر میں انسان بھی تیلی کے بیل کی طرح پھرکی کی طرح پھر رہا ہے، تمدن کے ضوابط میں جکڑا ہوا ہے۔ سوسائٹی کے معیاروں کا پابند ہے، دوسروں کے لیے کماتا ہے، دوسروں کے لیے پہنتا ہے اور زندگی قائم رکھنے کے لیے اس کو راتب یا راشن ملتا رہتا ہے، وہ ایک قلی بن کر رہ گیا ہے جو دنیا کے اس بڑے کارخانہ میں ایک جگہ

سے دوسری جگہ دوڑتا پھرتا ہے، بوجھ ڈھوتا ہے، تمدن کی گاڑی چلاتا ہے اور تھوڑی سی مزدوری پاتا ہے۔ حقیقی لطف ومسرت، اچھی غذا، اچھی ہوا، روح کی شادمانی، دل کے سکون، ضمیر کے اطمینان پیدا کرنے والی معرفت ومحنت کی لذت سے محروم ہے۔ اور زندگی کا دھارا تیزی بہہ رہا ہے اور تمدن کا چکر اس زور کا چل رہا ہے کہ اس کو ان مسائل پر سوچنے کی بھی فرصت نہیں، جسم اتنا تھکا، دماغ اتنا شَل، ذہن اتنا مشغول، اور دِل اتنا مردہ ہو چکا ہے کہ اس کو اس محرومی اور مدہوشی کا بھی ہوش نہیں، اور اس دھارے میں تنکے کی طرح بہا چلا جا رہا ہے، وہ ایک ایسا سوار ہے جو سواری کے قابو میں ہے، سواری اس کے قابو میں نہیں، خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی عجب عبرتناک ہے، لاکھوں کروڑوں افراد، پوری کی پوری قومیں، بڑی بڑی سلطنتیں اس خود فراموشی، خودکشی کا شکار ہیں۔ ایک ذہنی طاعون ہے جو سارے عالَم پر مسلط ہے، مگر آنکھ نہیں کھلتی، بجائے خداشناسی کی دعوت کے خدافراموشی کی تلقین بڑھتی جاتی ہے، خدا سے بغاوت کے جھنڈے ہر طرف بلند ہیں، خود پرستی کی جتنی تبلیغ کی جا رہی ہے خود فراموشی بڑھتی جاتی ہے۔

مقاصد اٹھائے جاتے ہیں اور وسائل میں الجھا دیئے جاتے ہیں، دولت راحت کے لیے تھی، دولت رہ گئی، راحت لے لی گئی، اور اس طرح لے لی گئی کہ اس کا کہیں نشان نہیں ملتا، اور اب لوگوں نے اس کی خانہ پری دولت سے ہی کرنی شروع کر دی، غذائیں اور دوائیں بڑھ گئیں اور صحت سلب کر لی گئی، تیز رفتار سواریاں اور وسائلِ سفر، راحت و سہولت کے لیے تھے، اب سرعت ہی مقصود بن گئی اور راحت مفقود ہو گئی۔ قدرتی دشواریاں دور ہوئیں تو قانونی اور مصنوعی دشواریاں خود پیدا کرلیں۔ اور اپنے اوپر مسلط کر لیں، سفر آسان ہوا تو مقصد سفر مشکل ہو گیا، پہلے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا مشکل تھا اب پہنچنا آسان ہے، لیکن منزل ڈراؤنی اور مقصد سفر بھیانک ہے۔ پہلے ایک شہر کے آدمی کا دوسرے شہر کے آدمی سے بات کرنا مشکل تھا۔ اب بات کرنا آسان ہے، لیکن اس بات میں کوئی دلکشی اور دل آویزی نہیں رہی۔ محبت کافور ہو گئی، خون سفید ہو گیا، اغراض کا

ہر طرف دور دورہ ہے اس لئے بات کر کے کیا دل خوش ہو، پہلے دور افتادہ اور دور دراز کے لوگ آواز کو ترستے تھے مگر اب آواز سننے سے بیزار اور ریڈیو کے جھوٹ اور پروپیگنڈے سے عاجز ہیں۔ غرض یہ کہ مقاصد کی خرابی نے ان وسائل و آلات کو بھی بے کار عذابِ جان اور بلائے بے درماں بنا دیا ہے، اور انسانی زندگی بے معنی، بے مقصد، بے روح بے کیف، بے لذت اور بے حس ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن کا پیغام یہ ہے کہ یہ خود فراموشی نتیجہ ہے خدا فراموشی کا، اس کا علاج صرف خدا شناسی اور خدا طلبی ہے۔ فرار کے بجائے واپسی، وحشت کے بجائے انس، انکار کے بجائے اقرار و ایمان، بغاوت کے بجائے صلح، اور سرکشی کے بجائے اطاعت و انقیاد، اور خدا سے بھاگنے کے بجائے خدا کی طرف بھاگنے کی ضرورت ہے۔ [ماخوذ از بانگِ درا لکھنؤ اگست ۱۹۹۷ء]

☆☆☆

(۸۲)

﴿قیامت کے دن کی ہولناکی﴾

آیتِ کریمہ:

﴿یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ [القارعة: ۴،۵]

ترجمہ

''وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔''

تشریح

قیامت کے دن جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو خوف و ہراس سے نہایت پریشان ہوں گے اور پروانوں کی طرح اِدھر اُدھر منتشر ہوں گے جس طرح شمع پر پروانوں کا بے تحاشا اژدہام ہوتا ہے اور ان کی حرکات مختلف ہوتی ہیں، گھبراہٹ کی وجہ سے، پہاڑ دُھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہو جائیں گے، سورۃ الزلزال میں قیامت کے دن زمین کا حال بیان ہوا اور یہاں (سورۃ القارعۃ) پہاڑوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ و تفسیر کے امام حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن لوگ منتشر، پراگندہ اور حیران و سرگردان اِدھر اُدھر گھوم رہے ہوں گے، ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''کَاَنَّھُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ'' کہ گویا وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہیں۔'' اور پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ دھنی ہوئی اُون کی طرح ادھر ادھر اڑتے نظر آئیں گے'' [تفسیر ابن کثیر ج ۵، ص ۵۸۴]

عمدۃ المفسرین، فخر المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

اپنی بے مثال تفسیر ''تفسیر عزیزی'' میں لکھتے ہیں: ''اسباب قیامت کے قائم ہونے کے کہ عمدہ اُن کا قہرِ الٰہی کی تجلی ہے تمام عالم پر، کما حقہ کسی بشر کو معلوم نہیں ہے، اس واسطے اس کے بیان کے مقام پر اس کی بعض تاثیروں پر اکتفاء فرما کر ارشاد کرتے ہیں: یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ'' وہ حادثہ اس دن ہوگا جس دن ہو جائیں گے لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے، کہ ہر ایک ایک طرف کو چلا جاتا ہے، اور یہ تشبیہ چاروں وجہوں سے مرکب ہے۔ اول ذلت، دوسرے حرکت کا ضعف، تیسرے حرکت کی بے انتظامی کہ کبھی تیز اور کبھی دھیمی ہوتی ہے، چوتھے متعین نہ ہونا۔ حرکت کی طرف کا کبھی آگے کبھی پیچھے، کبھی داہنے کبھی بائیں طرف ہوتی ہے۔ یہاں پر سمجھ لینا چاہئے کہ ثقل جسم میں دو قسم کا ہوتا ہے اول قسم کہ اعلیٰ اور اولیٰ ہے سو وہ ثقل ہے جو وقار اور تمکین اور مضبوطی کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات ان جسموں کے ساتھ خاص ہے کہ روح کامل کا تعلق ان کے ساتھ ہوا ہے، اسی واسطے جن اور انس کا ثقلین نام رکھا ہے، اور جو حادثہ کہ روح میں تاثیر عظیم کرتا ہے اور اس کو حیران کر دیتا ہے تو اس ثقل کو دور کر دیتا ہے اسی واسطے بڑے بڑے وقار اور تمکین والوں سے خوف واضطراب کے وقت بے اختیاری میں حرکتیں سُبک اور ہلکی ہونے لگتی ہیں اس واسطے کہ ان کی روح حادثے کی دہشت کے سبب سے جسم کی محافظت سے عاجز ہو جاتی ہے اور رنگا رنگ ارادے اور خواہشیں اس کی حرکتوں کی بے انتظامی کا سبب ہو جاتی ہیں اور اس آیت میں اِسی ثقل کے انقلاب کا بیان ہے اور دوسرے قسم کو عوام الناس بھی جانتے ہیں۔ ثقل طبعی ہے کہ سخت جسموں میں ان کے اجزاء کی کثافت اور اجتماع کے سبب سے ہوتا ہے اور اس قسم کے ثقل میں پہاڑ ضرب المثل ہیں، اور اس قسم کے انقلاب کو دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے: ''وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ'' اور ہو جائیں گے پہاڑ جیسے رنگی اون دھنکی ہوئی کئی رنگ کی کہ دھنیا اس کو اپنی دُھنکی سے دھنک کر پھاہا پھاہا کر کے اڑا دے۔

حاصل کلام کا یہ ہے کہ تاثیر اس حادثے کی بڑی سخت جسموں میں کہ پہاڑ ہیں، اس حد کو پہنچے گی کہ اجزاء ان کے سب علیحدہ علیحدہ ہو کے اور اپنے اپنے مکانوں سے

حرکت کے ہوا میں پراگندہ اور منتشر ہو جائیں گے۔ اور ان کو رنگین اُون اس واسطے بیان فرمایا ہے کہ رنگین اُون بہت کمزور اور ہلکی ہوتی ہے اس اُون سے جو رنگی نہیں گئی، اور رنگوں کا اختلاف اس واسطے تشبیہ میں مذکور ہوا ہے کہ پہاڑوں کے رنگ طرح طرح کے ہیں، بعضے سفید جیسے مرمر اور بعضے سرخ پھر اس میں بھی درجے ہیں جیسے سنگ سرخ اور سنگ باشی اور بعضے سیاہ وہ بھی اسی طرح سے ہیں جیسے سنگِ موسیٰ اور سنگ خارا اور بعضے سبزی کی طرف مائل ہیں، پھر جب یہ سارے پتھر بکھر کر ہوا سے اڑ جائیں گے تو ان کے رنگوں کے اختلاف کے سبب سے ایک چیز بوقلمون یعنی رنگ برنگ ہوا میں نظر آنے لگی گی۔"

[تفسیر عزیزی ص ۴۵۹ تا ۴۶۰]

تعارض

قیامت کے روز پہاڑوں کا کیال حال ہوگا؟ اس بارے میں آیاتِ کریمہ بظاہر متعارض ہیں، چنانچہ سورۃ الکہف میں ارشاد ہے: (۱) "وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً" اور سورۃ النمل میں فرمایا: (۲) "وَ تَرَی الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَۃً وَّ هِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ" اور سورۃ الطّور میں فرمایا: (۳) "وَ تَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا" اور سورۃ النباء میں ارشاد ہے: (۴) "وَ سُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا" اور سورۃ التکویر میں فرمایا: (۵) "وَ اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ" اور سورہ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا: (۶) "وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا" اور سورۃ المرسلات میں فرمایا گیا: (۷) "وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ" اور سورۃ الواقعہ میں ہے: (۸) "وَ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَکَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا" اور سورۃ الحاقۃ میں فرمایا: (۹) "وَ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً" اور سورۃ المعارج میں ارشاد فرمایا: (۱۰) "وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ" اور سورۃ القارعۃ (زیرِ تفسیر سورہ) میں بھی فرمایا: (۱۱) "وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ" اور سورۃ المزمل میں فرمایا: (۱۲) "وَ کَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّهِیْلًا"۔

یہ آیات سات قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں: (۱) مرور (چلنا) (۲) تسییر (چلانا) (۳) نسف (اڑانا) (۴) بس (ریزہ ریزہ کرنا یا ہانکنا) (۵) دک (ٹکڑے ٹکڑے کردینا) (۶) ھَبَآءً مُنبَثًّا (بکھرا ہوا غبار) (۷) عِھْن (روئی) (۸) کَثِیْبًا مَّھِیْلًا (بہنے والے ریت کا ٹیلہ)

آیت نمبرا تا آیت نمبر۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو قیامت کے دن چلایا جائے گا، جن میں سے آیت نمبر۲ میں یہ ہے کہ بادلوں کی طرح چلتے ہوئے ہوں گے، اس کے بعد آیت نمبر۶ اور نمبر۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو اُڑا دیا جائے گا۔ اس کے بعد آیت نمبر۸ میں وَ بُسَّتِ الْجِبَالُ کہا گیا ہے۔ بُسَّتْ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فُتَّتْ (ریزہ ریزہ کردیا جائے گا) کے ساتھ کی ہے، اور بعضوں نے سِیْقَتْ کے ساتھ کی ہے بمعنی ہانکنا چلانا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیا جائے گا یا ہانکا جائے گا۔ بُسَّتْ کی دوسری تفسیر کی صورت میں یہ پہلی پانچ آیات کے مضمون کے موافق ہو جائے گی، نیز اس آیت میں اس کے ساتھ ساتھ ھَبَآءً مُّنبَثًّا کہا گیا ہے جس کے معنی بکھرے ہوئے غبار کے آتے ہیں۔ پھر آیت نمبر۹ میں ہے کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے گا۔ یہ بُسَّتْ کی پہلی تفسیر فُتَّتْ کے مطابق ہے، اس کے بعد آیت نمبر۱۰، نمبر۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ دھنی ہوئی روئی کے گالے کی طرح ہو جائیں گے، اس کے بعد آیت نمبر۱۲ میں ہے کہ بہنے والے ریت کے ٹیلہ کی طرح ہو جائیں گے۔ پس اس طرح ان آیات میں بظاہر تعارض ہے؟

جواب:

قیامت کے دن پہاڑوں پر یکے بعد دیگرے یہ سب احوال مذکورہ طاری ہوں گے جن کو ان آیات میں متفرق طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اولاً تو پہاڑوں کو زمین سے اکھاڑ کر فضا میں لے جایا جائے گا، وہاں پر ہوائیں ان کو اڑاتی پھیریں گی، یہ بادلوں کی طرح چلتے ہوئے اور اڑتے ہوئے ہوں گے اور روئی کے گالوں کی طرح دکھائی دیں گے جس طرح

اڑتے ہوئے بادل روئی کے گالوں کی طرح معلوم ہوا کرتے ہیں، پھر ان کو زمین پر گرا کر ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، ایسا محسوس ہوگا جیسے مجتمع ریت کا ٹیلہ بہنے لگا ہو، اس کے بعد ان کو ھَبَاءً منثورًا بکھرے ہوئے غبار کی طرح بنا دیا جائے گا، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محققین سے اسی طرح منقول ہے۔ [روح المعانی]

فائدہ:

امام جعفر بن شمس الخلافۃ رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الآداب" میں ایک خاص باب قرآن کریم کے ایسے الفاظ کا قائم کیا ہے جو ضرب المثل کے قائم مقام ہیں اور یہی وہ بدیعی نوع ہے جس کا نام "اِرْسَالُ الْمَثَل" ہے۔ جعفر بن شمس رحمۃ اللہ علیہ نے اس نوع میں حسبِ ذیل آیات پیش کی ہیں:۔

(۱) "لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ" [النجم: ۵۸]

(۲) "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" [آل عمران: ۹۲]

(۳) "اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ" [یوسف: ۵۱]

(۴) "وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَّ نَسِيَ خَلْقَهٗ" [یٰسٓ: ۷۸]

(۵) "ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ" [الحج: ۱۰]

(۶) "قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيَانِ" [یوسف: ۴۱]

(۷) "اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ" [ھود: ۸۱]

(۸) "وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ" [سباء: ۵۴]

(۹) "لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ" [الانعام: ۶۷]

(۱۰) "وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ" [فاطر: ۴۳]

(۱۱) "قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ" [الاسراء: ۸۴]

(۱۲) "وَ عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" [البقرة: ۲۱۶]

(۱۳) ”كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ“ [المدثر: ۳۸]

(۱۴) ”مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ“ [المائدة: ۹۹]

(۱۵) ”مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ“ [التوبة: ۹۱]

(۱۶) ”هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ“ [الرحمٰن: ۶۰]

(۱۷) ”كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً“ [البقرة: ۲۴۹]

(۱۸) ”آٰلْاٰنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ“ [یونس: ۹۱]

(۱۹) ”تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى“ [الحشر: ۱۴]

(۲۰) ”وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ“ [فاطر: ۱۴]

(۲۱) ”كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ“ [المؤمنون: ۵۳]

(۲۲) ”وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ“ [الانفال: ۲۳]

(۲۳) ”وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ“ [سباء: ۱۳]

(۲۴) ”لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا“ [البقرة: ۲۸۶]

(۲۵) ”لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ“ [المائدة: ۱۰۰]

(۲۶) ”ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ“ [الروم: ۴۱]

(۲۷) ”ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ“ [الحج: ۷۳]

(۲۸) ”لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ“ [الصافات: ۶۱]

(۲۹) ”وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ“ [صٓ: ۲۴]

(۳۰) ”فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ“ [الحشر: ۲]

[الا تقان فی علوم القرآن ج ۲، ص ۴۰۳]

☆☆☆

فائدہ

ایسی ضرب الامثال اور ان کی امثلہ، جو کہ صریح طور پر لفظاً ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ دوسرے الفاظ کے پردے میں پوشیدہ ہوتی ہیں، ان کے متعلق امام ابوالحسن ماوردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ابواسحاق ابراہیم بن مضارب بن ابراہیم سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے والدِ گرامی مُضارِب بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے حسن بن فضل رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ قرآنِ کریم سے عرب وعجم کی بہت مثالیں پیش کرتے ہو، بھلا بتاؤ تو کہ آیا آپ کو ''خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُھَا'' (بہترین کام معتدل کام ہے) کی مثال بھی کتاب اللہ میں ملی ہے؟ حسن بن فضل رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ہاں، ایسی ضرب الامثال قرآنِ مجید میں چار مقامات پر آئی ہیں:

(۱) ''لَا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ'' [البقرۃ: ۶۸]

(۲) ''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا'' [الفرقان: ۶۷]

(۳) ''وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ'' [الاسراء: ۲۹]

(۴) ''وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا'' [الاسراء: ۱۱۰]

مضارب بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے کتاب اللہ میں ''مَنْ جَهِلَ شَيْئًا عَادَاهُ'' (جو شخص جس چیز سے ناواقف ہوتا ہے اسی سے عداوت رکھتا ہے) کی مثال بھی پائی ہے؟ حسن بن فضل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ہاں دو جگہوں میں پاتا ہوں۔

(۱) ''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ'' [یونس: ۳۹]

(۲) ''وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ'' [الاحقاف: ۱۱]

س:مُضارِب: کیا عرب کی یہ مثل "اِحْذَرْ شَرَّ مَنْ اَحْسَنْتَ اِلَیْهِ" (اس شخص کے شر سے بچو جس کے ساتھ تو نے نیکی ہو) بھی قرآن میں پاتے ہو؟

ج:حَسَن: بے شک، دیکھو! "وَ مَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ" [التوبۃ: ۷۴]

س:مُضارِب: کیا یہ ضرب المثل "لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْعَیَانِ" (سنی ہوئی بات، مشاہدہ کی طرح نہیں ہوتی) قرآنِ حکیم میں کہیں ملتی ہے؟

ج:حَسَن: ہاں، دیکھو! "اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ" [البقرۃ: ۲۶۰] اس میں اس ضرب المثل کا مفہوم جلوہ گر ہے۔

س:مُضارِب: کیا یہ ضرب المثل "فِی الْحَرَکَاتِ بَرَکَاتٌ" (حرکت میں برکت ہے) قرآن مجید میں ہے؟

ج:حَسَن: یقیناً موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَ مَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّ سَعَةً" [النسآء: ۱۰۰] یہ ارشادِ عالی اس پر دلالت کرتا ہے۔

س:مُضارِب: کیا یہ ضرب المثل "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) قرآن میں ہے؟

ج:حَسَن: ہاں، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے: "وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِهٖ" [النسآء: ۱۲۳] اس آیتِ کریمہ میں اس کا مفہوم موجود ہے۔

س:مُضارِب: کیا تمہیں اہلِ عرب کی یہ مثل "حِیْنَ تَقْلِیْ تَدْرِیْ" (جس وقت سر پر پڑے گی تو تجھے حقیقت معلوم ہوگی) بھی قرآنِ پاک میں ملی ہے؟

ج:حَسَن: ہاں، دیکھو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَ سَوْفَ یَعْلَمُوْنَ حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا" [الفرقان: ۴۲]

س:مُضارِب: کیا تمہیں عرب کی یہ مثل کہ "لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ" (مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا) بھی قرآنِ مجید میں

ملتی ہے؟

ج: حَسَن: بے شک، دیکھو! ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ" [یوسف: ۶۴]

س: مُضارِب: کیا تم عرب کی اس مثل "مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا سُلِّطَ عَلَيْهِ" (جو شخص کسی ظالم کی مدد کرتا ہے تو وہی ظالم اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے) کو قرآن حکیم میں پاتے ہو؟

ج: حَسَن: بالکل، ضرور، دیکھو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ" [الحج: ۴]

س: مُضارِب: اور کیا تمہیں عرب کی یہ مثل "لَا تَلِدُ الْحَيَّةُ اِلَّا حَيَّةً" (سانپ کے بچے سانپ ہی ہوتے ہیں) بھی قرآنِ کریم میں ملتی ہے؟

ج: حَسَن: بے شک، دیکھو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا" [نوح: ۲۷]

س: مُضارِب: کیا یہ مثل "لِلْحِيْطَانِ اٰذَانٌ" (دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں) بھی تمہیں قرآنِ پاک میں ملتی ہے؟

ج: حَسَن: جی ہاں، اللہ پاک کا ارشادِ عالی ہے: "وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ" [التوبۃ: ۴۷]

س: مُضارِب: اور کیا عرب کی یہ مثل کہ "اَلْجَاهِلُ مَرْزُوْقٌ وَالْعَالِمُ مَحْرُوْمٌ" (بسا اوقات جاہل آسودہ حال اور عالم فقیر و نادار ہوتا ہے) بھی قرآنِ حکیم میں پائی جاتی ہے؟

ج: حَسَن: کیوں نہیں، دیکھو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا" [مریم: ۷۵]

س: مُضارِب: اور کیا تمہیں قرآنِ پاک میں یہ ضرب المثل کہ "اَلْحَلَالُ لَا يَاْتِيْكَ اِلَّا قُوْتًا وَالْحَرَامُ لَا يَاْتِيْكَ اِلَّا جُزَافًا" (حلال مال سے روزی آتی ہے اور حرام سے خطرۂ جان) کہیں ملتی ہے؟

ج: حسن: ہاں، قرآنِ کریم میں یہ ضرب المثل بھی موجود ہے: دیکھو! ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِیْهِمْ'' [الاعراف: ۱۶۳]

[دیکھیے: الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص: ۴۰۱، ۴۰۲]

و صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الْكَرِيْمِ.
وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّاتِهٖ اَجْمَعِيْنَ

الحمد للہ، ''امثال القرآن'' کی تالیف وترتیب سے بتاریخ ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ/ ۲۶، ستمبر ۲۰۰۷ء بروز بدھ کو فراغت حاصل ہوئی۔

العبد الضعیف: ابو الحسّان خالد محمود بن مولانا ولی محمد رحمۃ اللہ علیہ
(مدرس) جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور